نائن الیون کے بعد طاغوتی طاقتوں کا اقوام متحدہ کی شکل میں حکومت دجال کا قیام
، جدید سامراجی اصلاحات اور انسانی تاریخ میں جھوٹ اور سچ کی امیزش سے ظلم و
بربریت پر لکھی ہوئی شہرہ آفاق کتاب

دجّال

جلد دوم، سوم

مصنف

اسرار عالم

ادارہ تحقیقات
فسٹ فلور یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
فون: 03334380927

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب : دجال
مصنف : اسرار عالم
مطبع : نواز پریس لاہور
اہتمام : ایم ایس حسین
اشاعت اول : 2005ء
اشاعت دوئم : 2006ء
اشاعت سوئم : 2007ء
ناشر : ادارہ تحقیقات لاہور 0334380927
قیمت : 350/=

واحد تقسیم کار
طیب پبلشرز

5-یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔
فون: 042-7241778 - 0333-4394686

prepared by M. Aamir Mehmood
www.israralam.net

فہرست

پیش لفظ ۵
مقدمہ ۶
مرحلۂ ہفتم : مرحلۂ ابراہیمی ۷
میثاق ابراہیمی ۷
معرکۂ خلافت کا تناظر ۷
معرکۂ ارضی کی سمتیں ۱۳
نبوت ۱۳
رسالت ۱۴
ختم نبوت ۲۲
معرکۂ خلافت اور مناہج ابلیس ۲۴
منہج اول: منہج سفک دم یعنی خوں ریزی ۲۴
منہج دوم: منہج فساد ملکوت ۳۰
سنت اللہ، سحر اور سائنس ۳۴
سنت اللہ ۳۴
سحر اور تسخیر ۷۲
فساد قبل نوح ۱۲۹
منہج سوم: فساد ملکوت حکمی ۱۵۲
دور اول: حضرت ابراہیم علیہ السلام ۱۵۸

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

اقامت ایمان ۱۶۰

اقامت اعلاء کلمۂ حق ۱۶۵

اقامت ہجرت ۱۷۸

اقامت مقام ۱۸۰

اقامت ذبح ۱۸۳

اقامت جہاد ۱۸۴

منہج چہارم: فساد ملک ارض یا فساد ملک ۱۹۱

اقامت ملک ۱۹۵

اقامت ذبح عظیم ۱۹۹

اقامت ختنہ ۲۰۸

اقامت صلوٰۃ یا اقامت ملک اللہ ۲۱۱

اقامت دین اللہ فی الارض ۲۱۹

اقامت بیت اللہ علی الارض ۲۲۱

اقامت حج، اقامت مناسک یا اقامت تکمیل صلوٰۃ ۲۲۳

ابلیس کا جوابی حملہ اور تدابیر ابراہیم ۲۲۸

دور دوم: حضرت یعقوب و حضرت یوسف علیہما السلام ۲۳۱

کنعان و مصر ۲۳۸

حواشی ۲۵۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

حامدا و مصلیاً!

نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کی امت بنی نوع انسان میں وہ آخری امت ہے جو منصب شہادت پر فائز کی گئی ہے۔ چنانچہ پوری انسانیت کی کامیابی کا انحصار اب اسی گروہ پر ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائی تک آتے آتے واضح طور پر محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ امت تاریخ انسانی کے اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جس کی خبر دیتے ہوئے آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا: عنقریب قومیں تم پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بلاوا دیں گی جیسے بھوکے (جانور) کھانے پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بلاوا دیتے ہیں **(ابو داؤد و بیہقی)**

اس اندوہناک صورت حال سے زیادہ کرب کی بات یہ ہے کہ امت مسلمہ.... جو دنیا کی وہ واحد گروہ ہے جسے ماضی، حال اور مستقبل کا کافی علم **(ماکان و ماھو کائن)** دیا گیا.... آج حیران اور ناواقف راہ بھٹک رہی ہے اور دنیا کی تاریکیوں سے روشنی کی بھیک مانگ رہی ہے۔ چودہ صدیوں بعد اب آثار قیامت کے ظاہر ہونے کی رفتار تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے گویا کوئی ہار ٹوٹ جائے اور یکے بعد دیگرے دانے گرنے لگیں۔

ان حالات کا تقاضا تھا کہ قرآن و احادیث مبارکہ کی روشنی میں امت کی صورت حال کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا، موجودہ حالات کی تبدیلی کو صحیح زاویہ سے دیکھا جاتا اور آئندہ کے لئے خطوط کار کی نشاندہی کی جاتی تاکہ یہ امت اپنے فرض منصبی کو کماحقہ انجام دے کر پوری انسانیت کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔ چنانچہ انہیں امور کو پیش نظر رکھ کر یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف عناوین کے تحت بحث کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس میں برکت عطا فرمائے۔

انہ سمیع قریب مجیب

اسرار عالم

مقدمہ

دجال جلد اول کے مقدمہ میں تیزی سے رونما ہونے والے حوادث اور ان کے امت پر پڑنے والے اثرات کے پیش نظر اس عاجز نے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ شاید اس کی اگلی جلدیں جو ہر چند کہ عجالے کی صورت میں ہی لکھی جا رہی ہیں پیش نہ کی جا سکیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل، اس کی نصرت اور توفیق کی ارزانی ہے کہ دجال جلد دوم امت کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ **الحمدلله علي ذلك**۔

صورت حال ناگفتہ بہ حد تک نازک ہے۔ امت مسلمہ کو دجال کے ظہور کے تناظر میں نوع آدم کی طرف سے اہم ترین کردار ادا کرنا ہے۔ صورت حال کی نزاکت اور امت کی ذمہ داریاں اس بات کی متقاضی ہیں کہ اس کتاب کے محتویات سے امت کا ہر خاص و عام زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد واقف ہو جائے۔ لہذا امید کی جاتی ہے کہ قارئین حسب استطاعت ان سے امت کو باخبر کرنے کی سعی فرمائیں گے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر ہر جلد کے آخر میں پچھلی جلدوں کے محتویات کی فہرست شامل کی جا رہی ہے تا کہ کتاب کے مباحث ماسبق سے مربوط رہیں۔

اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس میں برکت عطا فرمائے۔

واللہ المستعان وعليه التكلان

اسرار عالم

مرحلۂ ہفتم: مرحلۂ ابراہیمی

میثاق ابراہیمی

حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں میں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد آسمان آدمیت میں نمودار ہونے والے سب سے زیادہ روشن اور سب سے زیادہ ضوفشاں وہ کوکبۂ جلال ہیں جن کی تابناکی نے پوری کائنات کو بقعۂ نور بنا دیا۔ جاری معرکۂ خیر و شر میں حق کی جانب سے آپ علیہ السلام نے ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا جس کی توقع ابلیس نے خواب میں بھی نہیں کی ہوگی۔ یہ وہ انقلاب تھا جس سے ابلیس کی خواہشات کی دنیا ویران ہوگئی، اس کا خواب چکنا چور ہوگیا، اس کا مکر دھرا کا دھرا رہ گیا اور اس کی افواج جن و انس دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی اور ادھر حضرت آدم کے اس جلیل القدر بیٹے نے ایک ایسے دورویہ جنگ (Pincer Attack) کا آغاز کر دیا جس نے بالآخر ایک جانب حیثیت آدم کو ایسی ترقی دی جسے تاریخ آدمیت کی چوتھی عظیم جست (The Fourth Quantum Jump) قرار دیتی ہے تو دوسری جانب ابلیس کو معرکۂ خیر و شر میں ایسی شکست سے ہم کنار کر دیا جو بالآخر اس کے لئے فیصلہ کن ہزیمت کا باعث بن جانے والی تھی۔

معرکۂ خلافت کا تناظر

نوع آدم کے تناظر میں اللہ تعالیٰ اور ابلیس کے مابین معرکۂ خیر و شر کا آغاز اسی لمحے ہوگیا جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو فانک من المنظرین (پس تم مہلت دیے جانے والوں میں سے ہو) فرما کر گویا اجازت مرحمت فرما دی۔ [1]

مرحلۂ اول: اس معرکۂ خلافت یا معرکۂ خیر و شر کا پہلا مرحلہ وہ تھا جب حضرت آدم تنہا آدم قدیم

کی طرح الجنہ میں مقیم تھے۔ اس مرحلے میں ابلیس انہیں کچھ بھی گزند پہنچانے میں ناکام رہا۔ غالب گمان یہی ہے کہ اس مرحلے میں بھی اس نے بھرپور کوششیں کی ہوں گی لیکن بفضلہٖ تعالیٰ حضرت آدم کے خلاف اس کے اقدامات بے اثر ثابت ہوئے۔ [۲]

مرحلۂ دوم: مرحلۂ دوم کا آغاز اس گھڑی ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کے مخصوص منصوبے کے تحت حضرت آدم سے ان کا جوڑا حضرت حوا پیدا فرمایا۔ الجنہ کا یہ وہ مرحلہ ہے جب حضرات آدم وحوا پر ابلیس کی چالیں کارگر ہونا شروع ہوئیں۔ چنانچہ وہ آپ دونوں سے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کروانے میں کامیاب ہوگیا اور اس طرح الجنہ میں پہلی بار فساد کا آغاز ہوا۔ اس کا خوفناک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ نوع آدم طبعی طور پر الجنہ میں سکونت پزیر رہنے اور روحانی طور پر حسب سابق مدارج خلافت میں ترقی کر کے مقام محمود تک پہنچنے کی اہلیت سے قاصر ہوگیا۔ بہر حال نوع آدم سے ایک عظیم خطا سرزد ہوئی تھی لیکن حضرات آدم وحوا اپنی اس خطا پر بلا تاخیر متنبہ ہوئے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی جسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا۔ اس توبہ وانابت کے سبب ہر چند کہ آپ دونوں حضرات کی خطا معاف ہوگئی تھی لیکن اس خطا سے نوع آدم میں جسمانی وروحانی قصور وفساد کا آغاز ہوگیا جس نے مزید ایسی صورتیں پیدا کر دیں جو اس نوع کے انحطاط کا باعث ہوئیں۔ ابتداءً یہ قصور وفساد جسم وطبع میں پیدا ہوئے لہٰذا حضرات آدم وحوا کو الجنہ سے روئے ارض پر منتقل کر دیا گیا۔ یہ منتقلی روئے ارض پر دو اقسام کے قصور وفساد کی صورت میں منتج ہوگئی:

(۱) روحانی قصور وفساد (Spiritual Deficiencies & Perversion)

(۲) جسمانی قصور وفساد (Physical Deficiencies & Perversion)

روحانی قصور وفساد کی بنیادی وجہ تھی نوع آدم کا اس روئے ارض پر اللہ تعالیٰ سے ویسا قرب وتعلق کا جاری نہ رہ پانا جیسا کہ الجنہ میں تھا۔ اور عام حالات میں ایسا جاری رہنا ممکن بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ الجنہ روئے ارض کے مقابلے میں مادی اعتبار سے لطیف تھی چنانچہ اس فضا میں حضرات آدم وحوا اللہ تعالیٰ سے روحانی طور پہ بھی نسبتاً زیادہ قریب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خطا ہونے کے بعد وہ اتنی جلد متنبہ ہوئے اور تائب بھی۔ زمین الجنہ کے مقابلے میں کثیف اور نتیجتاً روحانی طور پر دور ہے مزید ازیں یہاں الجنہ کے مقابلے میں لاکھوں گنا زیادہ زینۃ پائی جاتی ہے۔ [۳] چنانچہ چھوٹی چھوٹی خلاف ورزیوں اور گناہوں کی بات تو الگ رہی بڑے بڑے گناہوں پر بھی روئے زمین پر

صرف چند ہی انسان بروقت اور کماحقہ متنبہ ہو پاتے ہیں۔ لہذا بعد ازاں اس روئے زمین پر نوع آدم کی کثیر تعداد کا بحیثیت نوع عدم تنبہ (Desensitization) مزید فساد وانحطاط طبعی ومعنوی کا باعث ہوتا گیا۔

جسمانی وطبعی فساد کی بنیادی وجہ آدم وحوا کی خلقت، ساخت اور پھر اس کی جبلت میں ہونے والی وہ تبدیلی تھی جو اس خلاف ورزی کے نتیجے میں واقع ہوئی۔ ؎ الجنہ کو اس تبدیلی کی داشت نہیں تھی۔ لہذا حضرات آدم وحوا کو ان کی خطا کے معاف ہو جانے کے باوجود زمین پر منتقل کر دیا گیا۔ یہ منتقلی نوع آدم میں مزید خرابیوں کا باعث ہوئی۔ ان خرابیوں کو تین شعبوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے:

(۱) شعبۂ اول: جسمانی وطبعی خرابی۔ جس سے فساد جسم وطبع کا ظہور ہوا
(۲) شعبۂ دوم: مسکنی وماحولی خرابی۔ جس سے فساد مستقر وماحول کا ظہور ہوا
(۳) شعبۂ سوم: اعمالی خرابی۔ جس سے فساد عمل کا ظہور ہوا۔

جسمانی وطبعی خرابی سے مراد یہ ہے کہ حضرات آدم وحوا کے جسم الجنہ میں خطا سے قبل زیادہ لطیف پاکیزہ اور محفوظ تھے۔ خطا کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خرابی اور پھر اس زمین پر منتقل ہونے کے بعد یہاں کی فضا میں رہنے اور یہاں کی اشیاء سے استفادہ کرنے کے سبب پیدا ہونے والی خرابی نے اس کے اندر جسمانی اور طبعی خرابیاں پیدا کر دی ہیں جس کی وجہ سے نوع آدم کا جسم اب اس حالت پر باقی نہیں جیسا کہ وہ الجنہ میں خطا سے قبل تھا۔

مسکنی وماحولی خرابی سے مراد یہ ہے کہ زمین الجنہ کے مقابلے میں کثیف اشیاء سے بنی ہوئی ہے۔ یہاں کی زمین، اس کی پیداوار، اس کا ماحول کثیف اور فساد آلودہ ہے۔ اپنی کثافت کے علاوہ اس پر ان فسادات کے بھی اثرات ہیں جو ماقبل کی اور اب معدوم مخلوقات کی پیدا کردہ ہیں۔ چنانچہ یہ زمین اور اس کا ماحول نوع آدم کے لئے مزید خرابیوں کا باعث ہوئے۔ جیسے کسی صاف وشفاف اور طبعی طور پر محفوظ ومامون مقام سے ایک ایسی جگہ جو گندگی اور تعفن سے بھری ہو منتقلی کے سبب پڑنے والے اثرات ہوا کرتے ہیں۔

اعمالی خرابی سے مراد یہ ہے کہ الجنہ میں حضرات آدم وحوا پر تعبدی ذمہ داریاں بفضلہ تعالیٰ محض برائے نام تھیں جن کا ذکر تین عنوانات کے تحت کیا جا سکتا ہے:

(۱) ایمان: جس میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اسکی حمد وثنا اور پاکی بیان کرنا تھا [۵]
(۲) انفاق: جس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق الجنہ میں رہنا اور اس سے استفادہ کرنا تھا [۶]
(۳) منہیات: جس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق الجنہ میں ایک مخصوص چیز سے ہر قسم کے استفادے سے پرہیز کرنا تھا [۷]

چنانچہ یہی مختصر تعبدی ایمان وافعال تھے جن کا نوع آدم کو الجنہ میں مکلّف بنایا گیا تھا [۸]۔ الجنہ کے مقابلے میں زمین روحانی طور پر اللہ تعالیٰ سے جتنی دور اور محجوب اور مادی اور طبعی طور پر کثیف ہے اس طرح یہاں کی تعبدی ذمہ داریاں اس کی دوری، محجوبیت اور کثافت کے سبب وسیع، کثیر اور سخت ہیں۔ مثلاً اگر کل الجنہ میں آدم وحوا کو تین عنوانات کے تحت صرف تین کام کرنے ہوتے تھے تو اب اس روئے زمین پر نوع آدم کو انہیں تین عنوانات کے تحت تین کی جگہ تین لاکھ کام کرنے پڑتے ہیں۔ کہاں الجنہ کی لطیف، پاکیزہ اور محفوظ و مامون فضا میں تین کام اور کہاں زمین کی کثیف، آلودہ اور غیر محفوظ وغیر مامون فضا میں تین لاکھ کام۔ چنانچہ روئے ارض پر تعبدی ذمہ داریوں کی اس توسیع نے نوع آدم کو گویا لاکھوں گنا زیادہ فساد کے سامنے اور وہ بھی کھلے میدان میں لا کھڑا کیا ہے۔ [۹]

حضرات آدم وحوا رب کائنات کا شاہکار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا خلیفہ بنایا تھا جس پر ابلیس کو سخت اعتراض تھا اور جس کی پاداش میں وہ راندۂ درگاہ ہو چکا تھا۔ آج اسی راندۂ درگاہ ابلیس نے انہیں لوگوں سے جو منصب خلافت پر فائز تھے خود ان کے ہی ہاتھوں سے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کروا ڈالی تھی۔ لیکن حضرات آدم وحوا کو فوراً تنبہ ہوا کہ ان جانے میں ان سے کتنی عظیم غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ اور اس غلطی کا منصوبہ رَبانی پر اور خود ان کی ذات پر کیا نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرات آدم وحوا بلا تاخیر اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی غلطی پر تائب ہو گئے۔ حضرات آدم وحوا کا اپنی غلطی پر فوراً متنبہ ہونا اور اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنا اور توبہ کرنا نوع آدم کی وہ پہلی عظیم جست (The First Quantum Jump) تھی جس نے نوع آدم کی اگلی تاریخ کا فیصلہ کر دیا۔

یہ عظیم جست بحالیٔ حیثیت آدم کی جست تھی۔ توبہ وانابت کے اس عمل نے گناہ کے بعد آدم کی اپنی حیثیت کی بحالی میں انقلاب لا دیا۔ بعد کے سارے کارنامے اور حیثیت آدم کی

prepared by Mr. Aamir Memon
www.asrarealam.net

بحالی کی ساری کوششیں اسی کے بطن سے نکلی ہیں۔ اس جست نے اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ دھوکا دیکر آدم سے حکم خداوندی کی خلاف ورزی تو کروائی جا سکتی ہے لیکن اسے بحیثیت نوع اللہ کا باغی بنا کر منصب خلافت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کا ارشاد ہے: **فتلقی آدم من ربه کلمات فتاب علیه (البقرہ: ۳۷)**

ترجمہ: پھر سیکھ لی آدم نے اپنے رب سے چند باتیں پھر متوجہ ہو گیا اللہ اس پر۔

حضرات آدم وحوا کی توبہ وانابت الی اللہ کے اس عمل نے تعمیر وتشکیل نو کا پہلا پتھر رکھا جس نے بعد میں منصوبۂ ربانی کی تکمیل میں نئے برگ وبار لائے۔ فرض کیا جائے کہ اگر حضرات آدم وحوا نے توبہ نہ کی ہوتی تو کیا ہوتا؟

عین ممکن تھا کہ ابتک چلی آ رہی سنت اللہ کے مطابق اللہ تعالیٰ سابقہ مخلوقات اور بالخصوص سابقہ مختار مخلوقات کی طرح نوع آدم کو بھی ختم کر دیتے اور اس کی جگہ کسی نئی مخلوق کے پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیتا۔ اس صورت میں آدم کا مقدر جہنم میں جلنا ہوتا جس طرح اس سے قبل بیشتر ابناء نار کا وجود ختم کر دیا گیا اور چونکہ اللہ کی رضاء کی تکمیل ہونی ضروری تھی لہذا کوئی دوسری مخلوق پیدا ہوتی جو اس منصوبہ ربانی کو پورا کرتی۔ ایک حدیث سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ عالم امر میں اس امکان کا ظہور ہوا لیکن عالم خلق میں اس کا ظہور صورت موجودہ میں موقوف اور ارادۂ الٰہی پر منحصر ہے ۱۰ اگر ایسا ہوتا تو ممکن ہے یہ مخلوق اسی الجنہ میں جہاں حضرات آدم وحوا پیدا ہو کر رکھے گئے تھے پیدا کی جاتی اور وہ عین ارادۂ الٰہی کے تحت وہ سب کچھ انجام دے سکتی جس کا حکم باری تعالیٰ کرتا اور ان سب سے پرہیز کرتی جس سے منع کیا جاتا اور اس طرح الجنہ سے وہ ترقی کر کے جنت الفردوس مین ارتبایاب ہو جاتی۔

لیکن چونکہ حضرات آدم وحوا نے فوراً متنبہ ہو کر توبہ کی جسے اللہ رب العزت نے قبول فرمالیا۔ **الحمدلله علی ذلک** ۔ مغفرت وقبولیت کا یہی وہ واقعہ ہے جس کے بعد نوع آدم نہ وجوداً ختم کیا گیا اور نہ الجنہ سے معتوب کر کے سیدھے جہنم رسید کیا گیا۔ بلکہ الجنہ کے مقابلے میں کمتر سہولتوں کے ساتھ ہی سہی بر سر کار اور منصب خلافت پر اصولاً اور حکماً برقرار رکھے جاتے ہوئے زمین پر موقع زیست سے فیض یاب ہوئی۔ یہ زمین الجنہ سے بری اور جہنم سے بہتر ہے۔
اس طرح حضرات آدم وحوا کی توبہ نے نوع آدم کو تین عظیم عنایات سے سرفراز فرمایا:

(۱) بقاء وجود

(۲) منصب خلافت پر برقراری

(۳) جہد کے لئے عرصہ اور محل کی فراہمی

ہر چند کہ حضرات آدم وحوا کو ان کے اندر پیدا ہونے والی خرابیوں کے سبب زمین پر منتقل کر دیا گیا لیکن ان کی انابت کی وجہ سے بلکہ اس انابت سے خوش ہو کر اللہ کی رضا اور پسند یہ ظاہر ہوئی کہ آدم اپنی موجودہ صورت حال سے نکل آئے اور صرف یہی نہیں کہ گناہ سے قبل کی حالت الجنہ پر بحال ہو جائے بلکہ اس سے آگے ترقی کرتے ہوئے ان مقامات تک پہنچے جو اللہ کی رضا اور علم میں مقدر ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فتلقی آدم من ربہ کلمات کی عنایت کے بعد دوسری عظیم الشان عنایت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (البقرہ ۳۸)

ترجمہ: پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تمہارے پاس، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے نہ خوف ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہونگے۔

اہل علم واقف ہیں کہ جہاں "**فاما یاتینکم منی ھدی**" اس عظیم الشان مدد کا اعلان ہے جسے "اقامت رسالت" کہتے ہیں وہیں "**فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون**" اس وعدۂ فضل کا اعلان ہے جسے "مقعد صدق" کہتے ہیں اور جس کی انتہا یا نقطۂ کمال مقام محمود ہے۔ لیکن اس سے آگے بڑھ جو بات یہاں تقریباً واضح طور پر کہدی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ آدم اس مقام تک پہنچے چنانچہ آدم بھی ایفاء عہد کرتے ہوئے ارتقاء وارتباء کی اس راہ پہ آگے بڑھے اور پہلے اپنی حیثیت سابق کی بحالی اور پھر ارتباء کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے [۱۱]

چنانچہ بعد کی تاریخ نے ثابت کر دیا کہ آدم کی نسل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت سے قبل دو مزید عظیم جست (Quantum Jump) لگانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ بحمد اللہ ان میں ہر جست نے آدم کی روحانی اور جسمانی حیثیت کو اونچا اٹھایا اور ابلیس کو کمزور تر کیا۔ ہر جست کے بعد آدم قوی تر ہوئے اور ابلیس کمزور تر۔ آدم کے قوی تر ہونے سے مراد ہے ان کی حیثیت کا حالت ارضی سے ترقی کرنا اور حالت الجنہ سے قریب تر ہوتا جانا اور ابلیس کے کمزور تر

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarclan.net

ہونے سے مراد ہے اپنے دعوے کے اعتبار سے اس کی زمینی یا واقعاتی صورتحال (Ground Realities) کا کمزور تر ہوتا جانا۔

معرکۂ ارضی کی سعتیں

روئے ارض پر آدم کو ہدیٰ کے دیئے جانے کا ایک پہلو تو وہی ہے جس کا ابھی ابھی ذکر ہوا یعنی اللہ کا فضل خاص۔ لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی ہو سکتا ہے جس کا براہ راست تعلق ابلیس کے منصوبے سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ابلیس کے دل کے حال سے واقف ہے کہ اس نے روئے زمین پر کس طرح آدم کو زیر کرنے اور تباہ و برباد کرنے کا منصوبہ بنایا ہے تا کہ منصوبہ و منشاءِ ربانی کو ناکام کر دے۔ عین ممکن ہے کہ ہدیٰ کا یہ وعدہ اس تناظر میں بھی ہو چنانچہ روئے ارض پر ہدیٰ کے دیئے جانے کے دو ہی مقاصد ہو سکتے ہیں۔

(۱) بحالیٔ حیثیت آدم

(۲) حصول مقام محمود

ان میں سے اول الذکر کا تعلق مابعد گناہ کی حیثیت سے ترقی کر کے اور پیدا ہونے والے نقص وقصور کا ازالہ کر کے اس حیثیت کو بحال کرنے سے ہے جو الجنہ میں پہلے تھی۔ ثانی الذکر کا تعلق الجنہ کی قبل گناہ کی حیثیت سے آگے ترقی کر کے مقام محمود تک پہنچنے سے ہے۔ اور یہ دونوں مقاصد دراصل منصوبۂ ربانی ہیں بلکہ اس سے آگے جا کر اگر کہا جائے تو زیادہ درست ہوگا کہ ہدیٰ کے یہ دونوں مقاصد دراصل رضاءِ ربانی ہیں۔

چنانچہ روئے ارض پر اس ہدیٰ کا ظہور تین صورتوں میں ہوا۔ جن کی کل ملا کر چار سعتیں ہیں۔ ہدیٰ کے ظہور کی تین مذکورہ صورتیں درج ذیل ہیں:

(۱) نبوت

(۲) رسالت

(۳) ختم نبوت

نبوت : نبوت روئے ارض پر وہ بنیادی اور اصلی سطح ہے جس پر اور جس کے توسط سے ہدیٰ کا ظہور ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اور نوع آدم کے مابین ہدیٰ کے لئے نبوت واحد اور اصلی و بنیادی

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarala...net

واسطہ ہے۔ اس کے حامل کو نبی کہتے ہیں۔ انبیاء کی متعدد حیثیتیں بھی ہوسکتی ہیں مثلاً صاحب کتاب، صاحب الواح، صاحب صحیفہ، صاحب حق، صاحب دین، صاحب شرع یا صرف نبی۔ جو حضرات صرف نبی ہیں ان کی بھی کئی حیثیتیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً حضرت نوح کی پیدائش کے وقت حضرت ادریس کی حیثیت، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے عہد بعثت میں حضرت الیاس کی حیثیت اور اسی طرح آج ظہور دجال سے قبل حضرت ادریس، حضرت الیاس اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہم السلام کی حیثیت۔

رسالت : رسالت وہ دوسری سعت ہے جس کا عرض کسی نبی پہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر رسول لازماً نبی بھی ہوتا ہے جب کہ ہر نبی ضروری نہیں کہ رسول بھی ہو۔ جو امر رسول کو نبی سے ممتاز کرتا ہے وہ اس کی تین سعتیں ہیں۔

(۱) اظہار

(۲) ہدیٰ

(۳) سنت

اظہار : رسالت کی پہلی سعت اظہار ہے۔ اظہار سے مراد ہے نمایاں کرنا چنانچہ اظہار سے مراد روئے ارض پر رضائے الٰہی کے عین مطابق منصوبۂ ربانی کی تکمیل ہے جس کے اندر اظہار اور غلبہ کے سارے مظاہر شامل ہوتے ہیں۔ یہی وہ مفہوم ہے جو قرآن اور احادیث مبارکہ سے سامنے آتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے:

(۱) **هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله**
(التوبہ ۳۳۔ الفتح ۲۸ اور القف ۹)

ترجمہ: اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدیٰ اور دین حق دے کر تا کہ اس کو ظاہر کر دے پورے دین پر

(۲) **فایدنا الذین آمنو اعلی عدوهم فا صبحو اظاهر ین** (القف ۱۴)

ترجمہ: پھر قوت دی ہم نے ان کو جو ایمان لائے تھے ان کے دشمنوں پر پھر ہو رہے ظاہر۔

(۳) **حتی جاء الحق وظهر امر الله وهم کارهون** (التوبہ ۴۸)

ترجمہ: یہاں تک کہ آ پہنچا حق اور ظاہر ہوا اللہ کا امر اور وہ ناخوش ہی رہے۔

یہی مفہوم احادیث میں لیا گیا ہے:

prepared by M. Aamir Mehmood
www.israrahmed.net

لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاهرین علی من ناواهم یقاتل آخرهم المسیح الدجال (ابوداؤد)

ترجمہ: میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قتال کرے گا جو ان سے دشمنی کریں گے ان پر غلبہ پائے گا یہاں تک کہ وہ گروہ جو مسیح دجال سے قتال کرے گا۔

اس طرح اظہار کا مفہوم قرآن کے مطابق کائنات میں اللہ تعالیٰ کے منصوبے کو اس کی مرضی اور منشاء کے عین مطابق مرحلہ جاتی یا کلی طور پر پورا کرنا ہے۔ چنانچہ اظہار عمل بھی ہے اور عمل کا نتیجہ بھی۔

اس طرح یوں تو ہر نبی بلکہ جمیع نسل آدم اظہار کے لئے من اللہ مکلف ہے لیکن نبی اظہار کے لئے مبعوث نہیں کیا جاتا جبکہ کسی رسول کی بعثت کے لوازم میں سے ایک چیز اظہار ہے۔ اسی اظہار کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ''میثاق'' (سورہ الاحزاب آیت ۷) کہا ہے۔ (ان شاء اللہ میثاق پر تفصیلی بحث عنقریب آئے گی)۔ بلاشبہ انبیاء حتی کہ امتی بھی اپنے رسول کے تعلق سے تبعاً اس اظہار میں شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اظہار کیا ہے اور یہ کہ کس نے کس طرح اظہار کیا اس کا اندازہ لگانے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ کائنات کی تخلیق، آدم کو خلافت دیئے جانے، روئے ارض پر نسل آدم کو بسانے اور اس کے اندر رسالت کا سلسلہ جاری کرنے کے پیچھے دراصل اللہ تعالیٰ کا کون سا منصوبہ کارفرما ہے؟ وہ منصوبہ مرحلہ بہ مرحلہ اور کلی طور پر کیا ہے؟ چنانچہ جب تک یہ نہ جان لیا جائے کہ وہ منصوبۂ ربانی کیا ہے اس کا اندازہ کرنا آسان نہ ہوگا کہ کس طرح کسی ذات رسالت مآب نے یا کسی امت نے اظہار کیا اور یہ کہ اس اظہار نے بحیثیت مجموعی پورے منصوبۂ ربانی کی تکمیل میں کیا کردار ادا کیا ہے؟ چنانچہ ہجرت سے قبل اساطین قریش کی جانب سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بادشاہی کی پیش کش اور آپ کا اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دینا اور بظاہر تبلیغ و نفاذ دین کی راہ کو مسدود کر دینا اظہار تھا تو دوسری جانب حجۃ الوداع میں اسی قوت نافذہ کا اظہار کرتے ہوئے سارے عرب کے خون اور سود کو پاؤں سے روند ڈالنے کا اعلان کرنا بھی اظہار تھا۔ اظہار کی کنہ کا سمجھ میں آنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اللہ کا منصوبہ اس مرحلۂ خاص میں کیا ہے اور اس کی تکمیل کس طرح ہوئی ہے؟

ھدی : رسالت کی دوسری سعت ہدیٰ ہے۔ قرآن میں ہدیٰ متعدد مفاہیم میں بیان کیا گیا ہے

لیکن وہ ہدیٰ جو رسالت کی مخصوص سمت ہے دیگر مقامات کے علاوہ نہایت واضح طور پر تین جگہ بیان کیا گیا ہے یعنی سورہ توبہ، سورہ فتح اور سورہ صف میں۔

ہدیٰ سے مراد ہے کائنات کے تعلق سے بحیثیت مجموعی یا اس کے کسی مرحلے کے لئے ربانی منصوبہ اور اس منصوبہ کی تعمیل و تکمیل کا ربانی خطہ جسے (Blueprint of Planning or Operational Blueprint) بھی کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی مہم کو سر کرنے کے لئے ایک خاکہ اور خطہ تیار کیا جاتا ہے خواہ فوج کو کسی جگہ قبضہ کرنے کے لئے ہو یا پولس کو کسی گروہ کے قلع قمع کرنے کے لئے۔ بعض اوقات مہم کی سنگینی اور مختلف مرحلوں کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ایسا بھی ہوتا ہے کہ اصل خطہ صیغۂ راز میں بلکہ انتہائی صیغۂ راز میں رکھا جاتا ہے اور صرف چند ہی لوگ ہوتے ہیں جن کو اصل خطے کا علم ہوتا ہے۔ بعینہٖ روئے ارض پر منصوبۂ ربانی کی تکمیل کا بھی ایک خطہ ہے جس کے Outlines اور Salient Features سے گویا ہر نبی آگاہ ہوتا ہے لیکن اس کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ رسول مبعوث فرماتا ہے جو اس مرحلے کے خطہ سے جس سے اس کا تعلق ہوتا ہے پوری طرح آگاہ ہوتا ہے اور وہ رسول اس خطہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہی مامور ہوتا ہے۔ ظاہر ہے خاتم النبیین وہ ذات گرامی ہے جو کل منصوبۂ ربانی اور اس کے خطے سے آگاہ ہوتی ہے اس لئے کہ اسی کے ہاتھوں اس خطہ کی تکمیل ہونی ہے۔ چنانچہ درج ذیل دو حدیثیں اس حقیقت کا اظہار کررہی ہیں:

(۱) **عن ابی ھریرہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثلی ومثل الانبیاء کمثل قصر احسن بنیانہ ترک منہ موضع لبنۃ فطاف بہ النظار یتعجبون من حسن بنیانہ الاموضع تلک اللبنۃ فکنت اناسددت موضع اللبنۃ ختم بی البنیان وختم بی الرسل وفی روایۃ فانا اللبنۃ و انا خاتم النبیین** (متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الفتن)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور دوسرے انبیاء کی مثال ایک بہترین تعمیر شدہ محل کی ہے جس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ دیکھنے والے اس کے گرد گھومتے اور اس کے حسن تعمیر پر تعجب کرتے سوائے اس اینٹ کی جگہ کے۔ وہ میں ہوں جس نے اس اینٹ کی جگہ پر کر دی ہے۔ مجھ پر عمارت مکمل ہوگئی

prepared by M. Aamir Mehmood
www.esrarandam.net

ہے اور رسول پورے ہو گئے۔ دوسری روایت میں ہے کہ وہ اینٹ میں ہوں اور میں سب نبیوں میں آخر ہوں۔

(۲) وعن جابر قال جاء ت ملائكة الى النبى صلى الله عليه وسلم وهو نائم فقالوا ان لصا حبكم هذا مثلا فاضربوا له مثلا. قال بعضهم انه نائم وقال بعضهم ان العين نائمة والقلب يقظان فقالوا مثله كمثل رجل بنى دارا وجعل منها مادبه وبعث داعيا فمن اجاب الداعى دخل الدار واكل من المادبة ومن لم يجب الداعى لم يدخل الدار ولم ياكل من المادبة فقالوا اولوها له يفقهها قال بعضهم انه نائم قال بعضهم ان العين نائمة والقلب يقظان فقالوا الدار الجنة والداعى محمد فمن اطاع محمدا فقدا طاع الله ومن عصى محمدا فقد عصى الله ومحمد فرق بين الناس (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے تھے تو کچھ فرشتے آپ کے پاس آئے تو یہ آپس میں کہنے لگے تمہارے لئے اس معزز شخصیت کی ذات ایک مثال ہے اس کو بیان کرو۔ ان میں سے بعض نے کہا آپ سو رہے ہیں۔ تو بعض نے کہا بیشک آنکھ سو رہی ہے لیکن قلب جاگتا ہے۔ تب فرشتوں نے کہا کہ آپ کی مثل ایسی ہے کہ ایک آدمی نے مکان بنوایا اور اس میں کھانا چن دیا اور لوگوں کو بلانے کے لئے بھیجا۔ چنانچہ جس نے بلانے والے کی بات مانی وہ گھر میں داخل ہوا اور اس نے کھانا کھایا۔ اور جس نے بلانے والے کی بات نہ مانی وہ نہ آیا نہ اس نے کھانا کھایا۔ فرشتوں نے کہا اس بات کی وضاحت کریں تو یہ آپس میں کہنے لگے آپ تو سوئے ہوئے ہیں تو بعض نے کہا آپ کی آنکھیں سو رہی ہیں لیکن قلب جاگا ہوا ہے۔ تب فرشتوں نے آپس میں کہا کہ گھر سے مراد جنت ہے اور بلانے والے سے مراد محمد ہیں۔ چنانچہ جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم پورے) بنی نوع انسان کے مابین (حق و باطل کا) فرق کرنے والے ہیں۔

قرآن میں غور و فکر سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سارے انبیاء و رسل اللہ تعالیٰ کے اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوتے رہے اور ان میں منصوبہ کی ترتیب (Sequence

prepared by M. Aamir Mehmood
www.aeraalam.net

(of Planning) پائی جاتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

(۱) ان ھذہ امتکم امة واحدہ وانا ربکم فاعبدون (الأنبیاء ۹۲)

ترجمہ: یہ ہے تم لوگوں کی امت۔ ایک امت، اور میں ہوں تم سبھوں کا رب پس تم سب میری بندگی کرو۔

(۲) وان ھذہ امتکم امة واحدہ وانا ربکم فاتقون (المومنون ۵۲)

ترجمہ: یہ ہے تم لوگوں کی امت، ایک امت، اور میں ہوں تم سبھوں کا رب پس تم سب مجھ سے ڈرتے رہا کرو۔

اسی ذیل میں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ کسی مرحلۂ خاص میں اس مرحلے کی مہم کے سرانجام دینے کے لئے روئے ارض پر رسول مبعوث فرمائے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایسا تو ہوسکتا ہے کہ کسی وقت خاص میں روئے زمین پر:

(۱) کوئی نبی اور کوئی رسول نہ ہو

(۲) یا صرف ایک نبی یا ایک رسول ہو

(۳) یا کئی انبیاء بیک وقت ہوں

(۴) یا ایک رسول اور ایک یا ایک سے زاید انبیاء ہوں

لیکن ایسا ہونا اس عاجز کے علم کی حد تک محال ہے کہ ایک ہی وقت میں روئے ارض پر ایک سے زائد مستقل رسول ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالت اور اس کے تحت بھیجے جانے والے رسول اس (Integral Planning) کا بھی حصہ ہوتے ہیں جسے کائناتی منصوبۂ ربانی کہا جاتا ہے۔ لہذا ایسا ہونا ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں روئے ارض پر ایک سے زائد مستقل رسول پائے جائیں۔ چنانچہ جب روئے ارض پر کوئی رسول مبعوث ہوتا ہے تو وہ گویا پوری روئے ارض کے لئے ہوتا ہے اور اس طرح اس وقت ایک یا ایک سے زائد نبی روئے ارض پر پائے جائیں تو وہ سب گویا اس رسول کے ماتحت اور اس کی ہدی سے مربوط (Intergrated) ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب لانا چاہا تو عذاب سے پہلے بلکہ خود حضرت لوط علیہ السلام کی آگاہی سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ذریعہ اسکی اطلاع حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کروائی۔ اور چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام منصب رسالت پر فائز

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarafam.net

تھے لہذا انہوں نے ملائکہ سے جدال کیا تا کہ یہ عذاب موخر ہو جائے۔ اسی طرح اگر بالاتفاق ایسا ہو جائے کہ دو رسول یکجا ہو جائیں تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ دونوں علی حالہ مستقل رسول بھی ہوں اور بیک وقت مستقلاً رسالت پر فائز رہیں۔ چنانچہ ان میں کسی ایک کو لازماً دوسرے کے ماتحت آجانا ہوگا اور یہ ماتحتی بھی اس کائناتی اور مربوط منصوبۂ ربانی کی تکمیل کے تناظر میں ہوگی، یعنی وہ رسول جو منصوبۂ ربانی کے اس مرحلے سے متعلق ہے جو اس کا اپنا مرحلہ ہے تو وہی آمر قرار پائے گا اور دوسرا رسول مامور۔ اس سے بھی اس منصوبۂ ربانی کی Intergrity اور Holistic ہونے کا علم ہوتا ہے چنانچہ یہی مفہوم ہے اس حدیث کا جس میں فرمایا گیا:

عن جابر ان عمر بن الخطاب اتی رسول الله صلی الله علیه وسلم بنسخة من التوراة فقال یا رسول الله هذه نسخة من التوراة فسكت فجعل یقراء ووجه رسول الله صلی الله علیه وسلم یتغیر فقال ابوبكر ثكلتك الثواكل ماتری بوجه رسول الله صلی الله علیه وسلم فنظر عمر الی وجه رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال اعوذبالله من غضب الله وغضب رسوله رضینا بالله ربا وبا لاسلام دینا، وبمحمد نبیا فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم والذی نفس محمد بیده لوبدالكم موسی فاتبعتموه وتركتمونی لظللتم عن سواء السبیل ولو كان موسی حیا، وادرك نبوتی لاتبعنی (رواہ الدارمی)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں توراۃ کا ایک نسخہ لیکر حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ یہ توراۃ کا نسخہ ہے۔ سرکار خاموش رہے اور حضرت عمر نے توراۃ پڑھنا شروع کی ادھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہونے لگا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر سے فرمایا: گم کرنے والیاں تمہیں گم کردیں کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو نہیں دیکھ رہے ہو؟ چنانچہ حضرت عمر نے نگاہیں اٹھائیں اور آنحضور کے چہرے کی طرف دیکھا۔ دیکھتے ہی پکار اٹھے: میں اللہ اور اس کے رسول کے غضب سے پناہ مانگتا ہوں۔ ہم اللہ کی ربوبیت، اسلام کے دین ہونے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر راضی ہیں۔ اس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے اگر اس وقت جناب موسیٰ علیہ السلام تشریف

لائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کا اتباع کرو تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام حیات ظاہری کے ساتھ موجود ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو وہ بھی میرا اتباع کرتے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کسی مخصوص افعال و اعمال کا حتیٰ کہ رسوم و قیود خواہ وہ عبادات ہی کے رسوم و قیود کیوں نہ ہوں نام نہیں بلکہ دین اللہ دراصل روئے ارض پر منصوبۂ ربانی کی تکمیل کی کوشش کا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد بعثت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی کی صورت میں جو حضرت موسیٰ کا اتباع کرتے وہ یقیناً ان اوامر و نواہی کی رعایت کے ساتھ ہی کرتے جس کے مکلف خود حضرت موسیٰ اپنے عہد بعثت میں تھے جن میں عبادات بھی ہونگیں اور تقویٰ کے دیگر امور بھی، لیکن ان سب کے باوجود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان اعمال صالحہ کے انجام دینے کے باوجود تم گمراہ قرار پاؤ گے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ ہر رسول جو اپنے عہد میں مبعوث کیا گیا ہو وہ اپنے مخصوص ہدیٰ کو روبہ عمل لانے اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے ہی آیا ہوتا ہے اور اس عہد کے تمام لوگوں کی نجات اس میں مضمر ہوتی ہے کہ وہ اس کے مخصوص ہدیٰ کا اس وقت لازماً اتباع کریں۔ اس ''ہدیٰ'' سے باہر ہر چیز گمراہی قرار پاتی ہے خواہ وہ کسی نبی یا رسول کا اتباع خالص و مخلص ہی کیوں نہ ہو۔ کسی رسول کو ہدیٰ عام طور پر دو ذرائع سے عطا کیا جاتا ہے۔ پہلا: ایحاء اور دوسرا: ارأت۔ ان میں سے ہر ایک کے متعدد وجوہ اور صور ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہدیٰ ان تمام ذرائع سے حاصل شدہ وہ خطہ (Blueprint) ہے جو منصوبۂ ربانی کی تکمیل کے لئے رسول کو دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس منصوبۂ ربانی کے تناظر میں ذات رسول وہ منبع واحد ہے جہاں سے ہدیٰ مل سکتا ہے۔ چنانچہ اصحاب رسول اور ان میں عشرہ مبشرہ اور ان میں خلفائے راشدین اربعۃ اور پھر ان میں علی الترتیب حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت عمر اور حضرت ابوبکر وہ ذات ہائے گرامی ہیں جو اس ہدیٰ سے زیادہ سے زیادہ واقف تھے۔ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چھوڑ کر پوری امت محمدیہ میں ہدیٰ سے سب سے زیادہ واقف ذات ہیں اور حضرت ابوبکر پورے بنی نوع انسان میں انبیاء کو چھوڑ کر سب سے زیادہ واقف ذات ہیں۔

سنت: رسالت کی تیسری سمت سنت ہے۔ قرآن کے مطابق کائنات میں ارادہ و منصوبہ ربانی کے صدور کے مخصوص و متعین طریقے کا نام سنت اللہ ہے۔ چنانچہ قرآن نے ارشاد فرمایا ہے۔

www.booksube.net
prepared by M. Aamir Mehmood
www.urdumoves.net
www.asrarealam.net

(۱) **فلن تجد لسنة الله تبديلا (الفاطر ۴۳)**

ترجمہ: پس تم سنت اللہ کو بدلتا ہوا نہ پاؤ گے۔

(۲) **ولن تجد لسنة الله تحويلا (الفاطر ۴۳)**

ترجمہ: اور تم سنت اللہ کو ٹالے جاتے ہوئے نہ پاؤ گے۔

(۳) **سنة من قد ارسلنا قبلک من رسلنا (اسریٰ ۷۷)**

ترجمہ: سنت جو چلا آتا ہے ان رسولوں کا جو آپ سے پہلے بھیجے ہم نے اپنے رسول۔

ٹھیک اسی طرح روئے ارض پر منصوبۂ ربانی کی تکمیل کے لئے کسی رسول سے ہدیٰ کے قولی، فعلی یا تقریری صدور کو سنت رسول کہا جاتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر کسی رسول کے ذریعہ ہدی کی قولی، فعلی یا تقریری تعمیل کو سنت کہتے ہیں۔ بلاشبہ یہ نکتہ نہایت باریک ہے جس کی حقیقت کا سمجھ پانا راسخون فی العلم کا ہی حصہ ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے سنت کے دو دائرے ہونگے اور دونوں سنت کہلائیں گے۔ پہلا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں کسی رسول کی بعثت سے لیکر ان کے وصال تک ان کی ذات کے سارے کے سارے قولی، فعلی اور تقریری صدورات سنت قرار پائیں گے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے چنانچہ ان کے سنت قرار دیئے جانے میں ذرہ برابر قباحت نہیں۔ دوسرا دائرہ اس بڑے دائرے کے اندر ایک چھوٹا دائرہ ہے جس میں اس رسول کی بعثت سے لیکر وصال تک اس کے وہ سارے قولی، فعلی اور تقریری صدورات ہی آئیں گے جو ہدیٰ کی تعمیل و تکمیل سے متعلق ہونگے۔ راسخون فی العلم کے نزدیک یہ دونوں دائرے ایک ہی سنت کے حاصل ہیں۔ جمہور امت کے نزدیک بھی ایسا ہی ہے لیکن ان دونوں فرقوں میں فرق ہے اور یہ فرق دراصل منظر کا ہے۔ یعنی اس بڑے دائرے کو ہی سنت کا دائرہ قرار دینے کے باوجود دونوں الگ الگ (Vantage point) پر کھڑے ہیں چنانچہ منظر کا فرق منظور کے فرق میں بدل گیا ہے۔ اس نکتے کی مزید تشریح یہاں چنداں ضروری نہیں۔ چنانچہ جب جمہور کہتا ہے کہ بیٹھ کر پانی پینا یا تین سانس میں پانی پینا سنت ہے تو راسخون فی العلم اس کی تردید نہیں کرتے لیکن خود وہ اسے سنت خاتم النبیین قرار نہیں دیتے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے لئے جانور ذبح کرنا اور ختنہ کرنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم الشان سنت ہے اور یہ کہ اس سے بھی عظیم الشان وہ سنت ہے جسے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمایا یعنی نکاح کرنا۔ لیکن ختنہ کرنا سنت ابراہیمی ہے اور

نکاح کرنا سنت محمدی اور وہ بھی عظیم الشان سنت تو یہ بات وہ ہے جسے عام اذہان سمجھنے سے قاصر ہوں گے۔ ان صدورات کو سنت سمجھنا جیسا کہ فقہ میں انہیں سنت قرار دیا گیا ہے اور اس سے آگے بڑھ کر انہیں روئے ارض پر جاری ہونے والے عظیم الشان بلکہ عدیم النظیر سنت قرار دینا تو صرف راسخون فی العلم کا نصیب ہے جن پر منصوبہ ربانی اور ہدیٰ آشکارہ ہے۔

ختم نبوت : ختم نبوت پوری تاریخ کائنات میں وہ تیسری سعت ہے جس کا عرض کائنات میں صرف ایک بار ہی ہونا مقدر ہے۔ ختم نبوت سے مراد ہے روئے ارض پر ہدیٰ (البقرہ آیت ۳۸) کی تکمیل یعنی بحائی حیثیت آدم اور اس سے آگے بڑھ کر حصول مقام محمود کی آخری ذمہ داری ادا کرنے والے اور ان کے حصول کی جدوجہد کو حقیقت میں بدل دینے اور پایۂ تکمیل تک پہنچا دینے والے کی آمد اور تکمیل منصوبہ۔

چنانچہ ختم نبوت سے مراد اس ذات گرامی کی بعثت ہے جو ابتداء آفرینش سے جاری منصوبۂ ربانی کو جس میں ابلیس کے ساتھ منصب خلافت کے عنوان سے جاری معرکۂ خیر و شر بھی شامل ہے رضاء الہیٰ کے عین مطابق پورا کردے اور ایک طرف بنی نوع آدم کو منصب خلافت کا اہل ثابت کردے اور دوسری طرف رضاء و منشاء ربانی کے عین مطابق اس آخری مقام تک ترقی کر جائے جسے باری تعالیٰ نے مقام محمود قرار دیا ہے۔ جو رب العالمین کے نزدیک منشاء ہے اس کی مخلوق میں سے کسی ایک فرد اور اس کے حوالے سے اس نوع کے بلکہ پوری خلق کے پہنچنے کی۔

چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ ذات گرامی ہیں جو کائنات میں اس مقام ختم نبوت پر فائز فرمائے گئے۔ ختم نبوت دراصل وہ منصب اعلیٰ ہے جو زمین پر نبوت و رسالت کی جامع ہے۔ سارے انبیاء اسی لئے مبعوث فرمائے گئے اور سارے رسول ہدیٰ (التوبہ، الفتح، الصف) کے ساتھ بھیجے گئے تا کہ خاتم الرسل اور خاتم النبیین کی بعثت ہو۔ اور خود ختم رسل کا منصب اسی لئے قائم کیا گیا کہ روئے ارض پر وعدۂ ربانی یعنی ہدیٰ (البقرہ ۳۸) کی تکمیل حقیقت کی صورت اختیار کر سکے اور بنی نوع آدم اس منصب جلیلہ پر فائز ہو سکے جو رب العالمین کے نزدیک وجہ تکوین کائنات ہے۔

کائنات میں اگر ابلیس کے ساتھ معرکۂ خیر و شر مقدر نہ ہوتا تو عین ممکن ہے کہ حقیقت محمدی یعنی حامل لواء الحمد اور حامل مقام محمود کا ظہور کسی اور طریقے سے الجنہ میں ہی ہوتا۔ چونکہ حضرات آدم و حوا کو الجنہ سے منتقل کر کے روئے ارض پر بسا دیا گیا اس لئے توحید کی توسیع جو براہ

prepared by M. Aamir Mehmood
www.acraalam.net

راست آخرت کی شکل میں ہوتی تھی ہدیٰ (البقرہ ۳۸) کے حوالے سے رسالت کی شکل میں روئے ارض پر ہوگئی۔ ہر دو صورت میں ظہور حقیقت محمدی مقدر تھا چنانچہ روئے ارض پر یہ ظہور محمدی ختم نبوت اور ختم رسالت کے حوالے سے ہوا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ الہدیٰ (البقرہ ۳۸) کے فضل خاص کا ایک اور تناظر ہوسکتا ہے اور وہ ہے باری تعالیٰ کا علم ابلیس کے ارادۂ جنگ اور اس میں استعمال کئے جانے والے مکروکید کے حوالے سے۔ لہذا اس روئے ارض پر اجراء سلسلۂ نبوت ورسالت کا بنیادی نقطہ نوع آدم کے خلاف لڑائی میں ابلیس کا طریقۂ جنگ یا منہج جنگ ہے۔ نسل آدم کے لئے ابلیس کے منہج جنگ کا سمجھنا اور اس کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔ یہی وہ ضرورت تھی جو نسل آدم کے لئے اس فضل خاص کا باعث ہوئی۔ چنانچہ انبیاء وہ ذات ہای گرامی ہیں جو ارادۂ ومنشاء ربانی کو عام انسانوں کے مقابلے میں پوری طرح سمجھنے والے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدیٰ (البقرہ ۳۸) اور ہدیٰ (التوبہ، الفتح اور الصف) دیکر بھیجتا رہا تا کہ یہ ابلیس کے منہج کو سمجھ سکیں اور نہ صرف یہ کہ پوری نوع انسانی کو اس کے مکروکید سے نکال لے جائیں بلکہ بنی نوع آدم کو ترقی کے اس سفر پر آگے لے جاسکیں جس کی انتہاء مقام محمود کا حصول ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع آدم میں بعض لوگوں کو مصطفیٰ ومجتبیٰ قرار دیا اور انہیں ایحاء اور اراءت سے نوازا تاکہ وہ ہدیٰ کے حامل ہوسکیں اور اس طرح ہدیٰ کے ساتھ انہیں مبعوث فرمایا گیا تاکہ وہ بنی آدم کی اس معرکۂ خیروشر میں حق کی جانب سے قیادت کرسکیں۔ انبیاء ورسل علیھم السلام کا بنیادی کام ابلیس کے پیچیدہ اور پرفریب منہج کو سمجھنا اور اس کے ذریعہ روئے ارض پر برپا قیامت خیز معرکوں سے نوع آدم کو محفوظ اور کامیاب نکال لیجا کر اور اسے ترقی وفلاح کی اس راہ میں مقصد اصلی کے حصول تک آگے لیجانا قرار پایا۔ چنانچہ انبیاء کرام ہمیشہ لوگوں کے درمیان تشریف لاتے رہے اور انہیں ایک ایسی صالح قیادت فراہم کرتے رہے جو اس بنیادی چیز کی حامل تھی جو ضمانت تھی معرکۂ خیروشر میں کامیابی کی یعنی ہدیٰ (التوبہ، الفتح اور الصف)۔ ہدیٰ کے بغیر ابلیس کے منہج کا سمجھنا ممکن نہیں رہ جاتا نہ منصوبۂ ربانی اور نہ رضاء ربانی کا سمجھنا چہ جائیکہ ابلیس کا مقابلہ کرنا۔ رسولوں کا مبعوث ہوتا اور ان کو ہدیٰ کا دیا جانا دراصل ابلیس کے منہج کی تحقیق اور اس کے خلاف طریقۂ جنگ کی تعیین کے لئے تھا چنانچہ ہدیٰ کے ساتھ اللہ کے انبیاء ورسل کا آنا اور اس ہدیٰ کو تعمیل وتکمیل کے مرحلے سے قولی، عملی اور تقریری طور پر گزارنا دراصل اس طریقہ کو قائم کرنا ہے جسے عام طور پر سنت کہا جاتا ہے۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.astaralam.net

معرکۂ خلافت اور مناہج ابلیس

منہج اول: منہج سفک دم یعنی خوں ریزی

روئے ارض پر ابلیس نے بنی آدم کے خلاف معرکے کا آغاز ایک گہری اور دوررس نتائج کی حامل سازش کے ساتھ کیا۔ اس منہج کو "منہج سفک دم" یعنی خون ریزی کرانے کا طریقہ کہا جا سکتا ہے۔ اس گہری سازش کی دو جہتیں تھیں۔ ابلیس کو یقین تھا کہ اس دو جہاتی طریقۂ جنگ سے وہ بنی آدم کو ابتداء ہی میں نابود کر دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس سازش کا بنیادی مقصد تھا روئے ارض پر آدم وحوا کے بسائے جانے کے بعد پہلا خون آدم وحوا یا بنی آدم کے ذریعہ بہا دیا جائے۔ واضح رہے کہ روئے ارض حضرات آدم وحوا کے بسائے جانے سے قبل جنوں کے تصرف میں تھی اور وہ مخلوق خوں ریزی میں سبقت لے گئی یہاں تک کہ خود اسی ابلیس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان جنوں کی پوری نسل کا خاتمہ کروا دیا۔ ابلیس اس تباہی کی پوری روداد سے نہ صرف یہ کہ واقف تھا بلکہ وہ اس کا عینی شاہد یا اس سے آگے بڑھ کر خود ایک اہم کردار تھا۔ روئے ارض پر نوع آدم کے بسائے جانے کے بعد خود اسی نوع آدم کے ذریعہ بہائے جانے والے پہلے خون سے اصولی، قانونی، طبعی اور روحانی طور پر مرتب ہونے والے اثرات ہی وہ امور تھے جن پر دراصل ابلیس کی نظر تھی۔ اس کو بخوبی علم تھا کہ اس پہلی خوں ریزی کے دو مضمرات وعواقب ہیں:

(۱) سفک دم یعنی خوں ریزی ہی وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے مختار مخلوقات میں سے جن خلافت کے منصب کے حصول میں ناکام ہو گئے یعنی اس وسعت ارض پر جس کو ان کا مستقر قرار دیا گیا تھا پہلا خون خود ان کے ہی ہاتھوں بہایا گیا یہ پہلی خوزیزی بالآخر منتج ہوئی پوری وسعت ارض کے خوں سے بھر دیے جانے پر یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسی ابلیس کے ذریعہ ہی ان جنوں کا خاتمہ کروا دیا۔

(۲) آدم کے منصب خلافت پر فائز کیے جانے کے اعلان کے موقع پر ابناء نور کی طرف سے جو بات پیش کی گئی اس میں بنیادی طور پر اسی اندیشہ کا اظہار کیا گیا تھا کہ یہ مخلوق یعنی نوع آدم بھی روئے ارض پر "سفک دم" (البقرہ ۳۰) کرے گی اور یہ کہ عین ممکن ہے کہ اس کا انجام بھی

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarialam.net

ابناء نار سے مختلف نہ ہو۔

جنوں کی روداد اور ملائکہ کا آدم کی خلقت کو دیکھ کر مخصوص اندیشے کا اظہار بنیادی نکات قرار پائے اس سازش کی تشکیل و تعمیل کے۔ ابلیس کو اندازہ تھا کہ قلیل مدتی صورتحال اور طویل مدتی صورتحال ہر دو صورت میں وہ کامیاب ہو جائے گا۔ جس وقت اس نے اس سازش کے تار و پود بنے اس وقت روئے ارض پر کل چار نفوس تھے جو نوع آدم کی نمائندگی کر رہے تھے۔ یعنی حضرات آدم و حوا، حضرت ہابیل اور قابیل۔ قلیل مدتی صورتحال میں اگر ابلیس قابیل اور ہابیل کو ایک دوسرے کی خوں ریزی پر آمادہ کر دے تو اس صورت میں اگر ہابیل نے قابیل کو قتل کر دیا تو روئے ارض پر پہلا خون ہابیل یعنی نوع آدم کے ذریعہ بہہ جائے گا اس طرح آگے چل کر لازماً اس کا انجام جنوں کے انجام جیسا ہو جائے گا۔ بصورت دیگر اگر قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو ایک جانب یہ ہوگا کہ آدم و حوا کی واحد اولاد کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس طرح روئے ارض نسل آدم سے خالی ہو جائے گی (واضح ہو کہ اس وقت تولد سنت عادیہ قرار نہیں پائی تھی) ۱۲ تو دوسری جانب خود اس کا جارحہ اور آلۂ کار یعنی قابیل بالآخر منصب خلافت پر فائز ہو جائے گا۔ طویل مدتی صورتحال میں پہلی بار نوع آدم کے ذریعہ روئے ارض پر خون بہایا جانا جنوں کی طرح نوع آدم کے ذریعہ روئے ارض کو خوں سے بھر دے گا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق اس کے خاتمے کا خود فیصلہ فرما دے گا اور ممکن ہے کہ اس صورت میں ایک بار پھر اللہ مجھے یعنی ابلیس کو ، ما یہ کام سونپ دے۔

واضح رہے کہ حضرت ہابیل روئے ارض پر حضرات آدم و حوا کی پہلی جائز آدمی اولاد تھے۔ اس کے مقابلے میں قابیل ایک ایسا شخص تھا جو بطن حوا سے پیدا ہوتے ہوئے بھی جنت میں حمل میں آنے والا مگر زمین پر پیدا ہونے والا غیر آدمی یا نیم آدمی یا تہائی آدمی تھا۔ اور اسے اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کا صلبی اور روحانی وارث ماننے سے انکار کر دیا۔ جس طرح امور دنیا میں مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا (**لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم** : الحدیث متفق علیہ) اسی طرح منصب خلافت میں قابیل حضرت آدم و حوا کا وارث نہیں قرار دیا گیا۔

قرآن میں مذکور واقعہ (**واتل علیهم نبا ابنی آدم**... المائدہ ۲۷) نہ کسی نذر کے

پیش کئے جانے سے متعلق ہے نہ کسی لڑکی سے شادی سے متعلق۔ ان باتوں کی حقیقت افسانوں سے زیادہ نہیں۔ قابیل دراصل ابلیس کا ایک جارحہ اور آلۂ کار تھا جس کے ذریعہ اس نے بالواسطہ اور پرفریب طریقہ سے منصب خلافت حاصل کرنے اور آدم کو اس سے محروم کردینے کی کوشش کی تھی (قابیل کی تفصیل ان شاء اللہ عنقریب دجال کے ذیل میں بیان کی جائے گی)۔ چونکہ قابیل ایک عمل غیر صالح تھا اور کلی طور پر غیر آدمی نہ سہی مگر تہائی آدمی یا زیادہ سے زیادہ نیم آدمی مخلوق تھا اس لئے اسے آدمی مخلوق قرار دینے سے انکار کردیا گیا اور جائز اولاد بھی۔ شادی والے قصے کو اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ جب قابیل کو جائز اولاد قرار دینے کے ساتھ ساتھ آدمی مخلوق قرار دینے سے بھی انکار کردیا گیا تو پھر اس پر اس کی بھی پابندی عاید کردی گئی کہ وہ کبھی بھی کسی آدمی لڑکی سے رشتۂ ازدواج قائم کرے۔ گویا اس طرح اسے کلی طور پر دائرۂ آدمیت سے خارج قرار دے دیا گیا۔ یہی وہ بات ہے جس پر ابلیس کا غصہ بھڑک اٹھا اور اس نے محسوس کیا کہ اس کا خفیہ منصوبہ جس کے تار و پود اس نے الجنہ میں بنے تھے نہ صرف یہ کہ طشت از بام ہوگیا ہے بلکہ ناکام بھی چنانچہ اس نے قابیل کو اکسایا کہ وہ حضرت ہابیل کو دعوت مبارزت دے۔ یہی وہ بات ہے جس کا ذکر قرآن نے یوں فرمایا ہے:

از قربا قربانا فتقبل من احد هما ولم يتقبل من الاخر قال لاقتلنك قال انما يتقبل الله من المتقين (المائدہ ۲۷)

ترجمہ: جب نیاز کی دونوں نے کچھ نیاز اور مقبول ہوئی ایک کی اور نہ مقبول ہوئی دوسرے کی کہا میں تجھ کو ضرور قتل کرڈالوں گا وہ بولا بے شک اللہ قبول کرتا ہے تو پرہیزگاروں سے۔

حضرات آدم و حوا اور بالخصوص حضرت ہابیل نے معرکۂ خیر و شر کی اس نزاکت کو سمجھا کہ اس غصے کے پیچھے بھی ابلیس کی کتنی خطرناک چال چھپی ہوئی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ہابیل پر ”فیضان“ فرمایا اور انہوں نے اس غیر معمولی ابلیسی سازش کی کنہ پالی۔ اس طرح حضرت ہابیل نے قابیل کی مبارزطلبی اور ارادۂ قتل پر واشگاف طور پر اعلان فرمادیا۔

لئن بسطت الی یدک لتقتلنی ماانا بباسط یدی الیک لاقتلک انی اخاف الله رب العلمین (المائدہ ۲۸)

ترجمہ: اور تو ہاتھ چلادے گا مجھ پر میرے قتل کرنے کو میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر تیرے قتل کرنے

www.booksitube.net
Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asarulan.net

کو میں ڈرتا ہوں اللہ رب العلمین سے۔

حضرت ہابیل نے اس ابلیسی مکر کبار کو ناکام کرنے اور عالم امر و عالم تکوین میں معروف و معلوم رضاء الٰہی اور سنت اللہ کو سمجھتے ہوئے قافلۂ حق کو کامیاب بنانے کے لئے یہی بہتر بلکہ واحد حل پایا کہ ''عدم بسط ید'' (ہاتھ نہ اٹھانا) کرکے روئے ارض پر حقیقی و اصلی نوع آدم کے لئے ان تین عنایات کے تعلق سے جن کا فیضان قبولیت توبہ کے بعد الجنہ میں ہوا تھا اس مقدر مدت حیات ارض میں بھی از سر نو ضمانت حاصل کرلیں۔ یعنی اولاً اس بات کی ضمانت کہ اللہ تعالیٰ روئے ارض پر بنی آدم کو اس کے نزدیک مقرر مدت حیات سے قبل فنا نہیں کرے گا۔ دوم یہ کہ بنی آدم کا خاتمہ خون ریزی، (سفک دم) کی پاداش میں نہیں کیا جائے گا لہذا لازماً اسے وہ عرصہ اور موقع میسر آئے گا تاکہ حیثیت آدم کی بحالی اور منصب خلافت کے اعلیٰ مدارج یعنی مقام محمود تک پہنچنے کی جد و جہد جاری رہ سکے۔

آدم کی بحالیٔ حیثیت کے اعتبار سے دوسری لیکن روئے ارض پر پہلی عظیم جست (The First Quantum Jump) تھی حضرت ہابیل کا قابیل کے اعلانِ ارادۂ قتل ہابیل کے جواب میں قابیل کے قتل کے لئے ''بسط ید'' کرنے سے انکار کرنا اور اس عزم پر خود شہید ہو جانے تک ثابت قدم رہنا۔

واضح رہے کہ حضرت ہابیل اور قابیل کے مابین جو معاملہ ہوا وہ فرد بہ فرد کا معاملہ نہیں تھا بلکہ نوع بہ نوع کا معاملہ تھا یہ ایسا ہی تھا جیسا ایک فرد کا اپنے کو دوسرے فرد کے حوالے کردینا اور ایک بادشاہ کا اپنے کو دوسرے بادشاہ کے حوالے کر دینا۔ ان دونوں میں جو فرق ہے وہی فرق یہاں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک بادشاہ کا اپنے کو دوسرے بادشاہ کے حوالے کرنا محض ایک فرد کا معاملہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثرات اس پوری مملکت پر اور نہ صرف اس لمحے بلکہ نسلاً بعد نسل لاکھوں اور کروڑوں خاندانوں پر پڑتے ہیں۔ صرف ایک فرد کے ایک فیصلہ سے کروڑوں خاندانوں کی زندگیاں برسہا برس کے لئے بدل جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت ہابیل نے اسی سنت اللہ کی حقیقت کو پاکر عدم بسط ید کرکے ایک جانب نوع آدم کو روئے ارض پر پہلی خوں ریزی سے بچا لیا تو دوسری جانب روئے ارض پر اس خوں ریزی کا سارا وبال قابیل یعنی بالواسطہ ابلیس کے کاندھوں پر ڈال دیا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

انی اریدان تبو ابا ثمی واثمک فتکون من اصحاب النار وذلک جزاء الظالمین (المائدہ ۲۹)

ترجمہ: میں چاہتا ہوں کہ تو حاصل کر لے میرا گناہ اور اپنا گناہ پھر ہو جاوے تو دوزخ والوں میں اور یہی ہے سزا ظالموں کی۔

چنانچہ حضرت ہابیل آخری رمق باقی رہنے تک ''سفک دم'' یعنی خوں ریزی سے بچتے رہے یہاں تک کہ وہ شہید کر دیئے گئے۔ اس طرح انہوں نے ایک جانب ابلیس کو شکست فاش دی اور دوسری جانب حیثیت آدم کو بحالی کی طرف ایک اور جست دلا دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم عمل پر اپنا فضل خاص فرمایا اور روئے ارض پر نوع آدم کے لئے ولادت کی سنت کا اجراء فرمادیا اور حضرت شیث علیہ السلام اور پھر حضرت انس علیہ السلام کے ساتھ باضابطہ موجودہ انسانی سنت کا اجراء ہوا۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عن عبداللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاتقتل نفس ظلما الا کان ابن آدم الاول کفل من دمھا لانہ اول من سن القتل (رواہ البخاری کتاب احادیث الانبیاء: کتاب بدءالخلق)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (روئے زمین پر) جب بھی کوئی ظلماً قتل کیا جاتا ہے تو اس کے خون کے وبال کا دوہرا حصہ آدم کے پہلے بیٹے (قابیل) پر پڑتا ہے کیونکہ اس نے قتل کی بنیاد ڈالی ہے۔

اس ناکامی کے بعد ابلیس روئے ارض پر سلسلۂ قتل بنی آدم کو وسیع تر کرتا چلا گیا چنانچہ حضرت ہابیل کی شہادت کے بعد ابلیس نے بنی آدم سے خلافت چھین لینے اور اسے اس کے متوقع انعامات سے محروم کر دینے کی صورت اس کے قتل عام میں دیکھی۔ لہذا اس نے نسل آدم کا خود قتل کرنا شروع کیا یا قابیلی نسل کے ذریعہ قتل کروانا شروع کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے روئے ارض پر نسل آدم کو برکت سے نوازا اور ابلیس کی بالواسطہ اور بلاواسطہ ہر طرح کی کوششوں کے باوجود بنی آدم کی صالح ذریت کی افزائش کا سلسلہ ہمہ دم جاری رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''سفک دم'' وہ ابلیسی طریقہ اور منہج ہے جو حضرت شیث علیہ السلام سے لیکر حضرت انس بن یرد علیہ السلام تک جاری رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس طریقے سے اور اس کے ذریعہ حصول مقصد سے ابلیس مایوس ہوتا چلا گیا۔ یہ

مایوسی بالآخر ابلیس کو نسل آدم کی تباہی کے دوسرے راستوں کی تحقیق کی جانب لے گئی۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ اس کے بعد اس نے بنی آدم کی افزائش میں پنہاں سنت ربانی کو جاننے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے اس کا مقصد اسے جان کر افزائش کے اس سلسلے کو روکنا یا تباہ کر دینا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس سلسلے میں اسے کچھ کامیابی حضرت انس بن یرد علیہما السلام کے عہد تک آتے آتے مل ہی گئی۔ لہٰذا بنی آدم کی صالح ذریت کے سلسلۂ الذہب کی کنہہ پاتے ہی اس نے حضرت انس بن یرد پر حملہ بول دیا تا کہ ان کا خاتمہ کر کے اس سلسلۃ الذہب کو منقطع کر دے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ابلیس کے لئے اس نکتے تک پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا جب تک کہ اسے ملائکہ میں سے چند تک رسوخ نہ حاصل ہو گیا ہو جو تدبیر عالم پر متعین تھے۔ آثار و احوال بتاتے ہیں کہ یہی وہ زمانہ ہو سکتا ہے جب ابلیس از سر نو ابنائے نور میں سے بعض سے تعلقات استوار کرنے حتیٰ کہ انہیں ورغلا کر اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کرنے یا اپنے تفویض کردہ اختیارات میں از خود تصرف کرنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ اس لئے کہ کائنات میں مختلف امور پر متعین یہ ملائکہ ہی ہیں جنہیں ان کے تفویض کردہ کاموں سے متعلق راز اور کنہ معلوم ہوتے ہیں جو دوسروں کو معلوم نہیں اور ان رازوں میں بنی آدم کی افزائش اور موت کی کنہ بھی ہے۔ [۱۳]

چنانچہ ابلیس بعض ملائکہ کے تحالف سے اس مقام پر پہنچ گیا کہ وہ نسل آدم کی افزائش کے سلسلۃ الذہب کا ہی خاتمہ کر دے۔ یہی وہ گھڑی ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس سلسلۃ الذہب کی حفاظت کا حکم جاری فرمایا اور حضرت انس بن یرد علیہما السلام پر اللہ کی مدد کا فیضان ہوا اور وہ ''نصرت کفل'' سے نوازے گئے۔ چنانچہ اس طرح وہ ذوالکفل بنا دیئے گئے اور روئے ارض سے انہیں منتقل کر کے ایک محفوظ و اعلیٰ مقام پر اس طرح رکھ دیا گیا کہ اہل سماء کے ساتھ ساتھ اہل دنیا سے بھی ان کا تعلق برقرار رہا۔ یہ وہ صورتحال تھی جس نے ابلیس کو تھوڑی دیر کے لئے ہکا بکا کر دیا لیکن جلد ہی اس نے طریقۂ کار میں تبدیلی کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس نتیجے تک پہنچ گیا تھا کہ ''سفک دم'' (خون ریزی) سے وہ یہ جنگ نہیں جیت سکتا۔

منہج دوم: منہج فساد ملکوت

ابلیس نے روئے ارض پر منہج خوں ریزی کی ناکامی کے بعد جو دوسرا طریقہ اختیار کیا وہ منہج فساد فی ملکوت السموات والارض یعنی فساد ملکوت تھا۔ یہ ایک ہمہ جہت، ہمہ گیر، کائناتی اور متعدد السطوح (Multilinear) منہج تھا چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ محض ابلیس کے ذریعہ ممکن العمل نہیں ہوسکتا تھا تاوقتیکہ اس میں ابلیس کو ان لوگوں کا تعاون نہ مل جائے جو ملائکہ میں سے ہوں اور تدبیر عالم کے کاموں پر متعین ہوں۔ اور یہی وہ عظیم کامیابی ہے جو ابلیس نے حاصل کی۔ اس تحالف کے بعد ابلیس نے تدبیر عالم پر متعین بعض ملائکہ کے ذریعہ کائنات خلق میں بالعموم اور ارض و ماوراء ارض میں بالخصوص ایک ہمہ گیر فساد برپا کر دینا چاہا جس کی بنیاد عالم تخلیق میں سنت ربانی کے منہج کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دینا تھی تا کہ اس فساد عالم میں نسل آدم کا خاتمہ ہو جائے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر فساد ملکوت سے کیا مراد ہے؟

فساد ملکوت کی حقیقت جاننے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ملکوت اللہ اور ملکوت السمٰوٰت والارض کیا ہیں؟ قرآن کا ارشاد ہے:

الاله الخلق و الامر (الاعراف ۵۴)

ترجمہ: خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر اسی کا ہے۔

اللہ تعالیٰ خالق ارض و سموات ہے اور وہی حقیقی مدبر عالم ہے۔ اسی نے کائنات اور عالم خلق اور اس میں بے شمار مخلوقات پیدا کیں۔ عالم خلق میں ہمہ دم تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ تبدیلیاں خواہ پیدائش کی ہوں یا موت کی، افزائش کی ہوں یا گھٹنے کی، تزکیہ کی ہوں یا تدسیہ کی، بسط کی ہوں یا قبض کی، ترقی کی ہوں یا تنزلی کی، ارتباء کی ہوں یا احتباط کی ہمہ دم جاری ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے اور منشاء کی تکمیل کے لئے اور خلق میں ان تبدیلیوں کے لئے مخصوص سنتوں کا اجراء فرمایا ہے۔ یوں تو کائنات میں جاری تمام سنتوں کا علم صرف اللہ رب العالمین کو ہے لیکن اس نے نہ صرف یہ کہ بعض سنتوں کو مخلوقات پر ظاہر فرما دیا ہے بلکہ ان کو اس کے جاری رہنے میں جارحہ اور آلہ بھی بنا دیا ہے۔ عالم خلق میں موجود مخلوقات اپنا مستقل وجود رکھنے کے باوجود باہم مربوط اور اس طرح ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بنائی گئی ہیں۔ اس کی کنہ اسی میں مضمر ہے یعنی بحیثیت مجموعی یہ مخلوقات اللہ تعالیٰ کی بعض سنتوں کے اجراء میں جارحہ

prepared by M Aamir Mehmood
www.asrarialam.net

ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہر مخلوق اپنے اوپر جاری تمام سنتوں سے واقف ہو۔ مثلاً انسان کو اپنے لئے مفید بعض سنتوں کا جزوی علم دیا گیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کیسے سانس لی جائے اور کیسے کھایا اور پیا جائے وغیرہ لیکن جہاں اسے بعض متعلق سنتوں کا علم ہے وہیں خود اپنے متعلق بے شمار ایسی سنتیں ہیں جن کا نہ صرف یہ کہ اسے علم نہیں دیا گیا بلکہ ان کے اجراء میں اس کا کوئی ہاتھ بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً انسان سانس لینے، کھانے پینے یا مباشرت کرنے کی حد تک تو ذمہ دار اور واقف ہوتا ہے لیکن اس کے بعد نہ وہ جانتا ہے نہ اس میں اس کا کوئی عمل دخل ہے کہ کس طرح نظام تنفس کام کرتا ہے، کس طرح نظام دوران خون اور نظام ہضم کام کرتا ہے اور کس طرح نظام تولید جاری ہے۔ بعض اوقات انسانوں سے متعلق بہت سی ایسی سنتیں ہیں جن پر بعض دوسری مخلوقات مثلاً ملائکہ حتیٰ کہ حشرات الارض، جانور اور کیڑے مکوڑے اور جرثومے جارحہ کی حیثیت سے متعین ہیں اور وہ انسان کے لئے ان کا اجراء کرتے ہیں۔ مثلاً مادۂ منویہ یعنی جرثومہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ رحم مادر میں کیسے نطفہ علقہ میں اور علقہ مضغۂ مخلقہ اور غیر مخلقہ میں تبدیل ہوتا ہے کیسے ہڈی بنتی ہے اور کیسے انسانی ہڈیوں پر گوشت چڑھتا ہے طبیات اور جراحت کے اعتبار سے یہ محیر العقول کارنامے کون انجام دیتا ہے؟ ظاہر ہے ان سنتوں کے اجراء کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتے مقرر فرما دیئے ہیں۔ ایک ایک فرد بشر کے لئے اللہ تعالیٰ نے کتنے عظیم الشان انتظامات فرمائے ہیں کہ اگر ان کا موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں طبی سہولتوں اور ان پر مالی صرفے کے تناظر میں مقابلہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ صرف ایک مفلوک حال غریب انسان کے ایک دن زندہ رہنے پر اللہ تعالیٰ اتنا صرف کرتا ہے کہ اگر اسی میکانزم کو مصنوعی طور پر انجام دیا جائے تو اس کا تحمل دنیا کی امیر ترین مملکت بھی اپنی ساری دولت کے ساتھ بھی نہیں کر سکتی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محض ایک عضو کی پلاسٹک سرجری یا ایک دل کی تبدیلی (Heart Transplantation) میں جو محض (Assemble) کرنے کا کام ہے کس قدر صرفہ آتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے ملائکہ روزانہ ان سے کروڑوں گنا زیادہ کام صرف ایک روز میں روئے ارض پر کرتے ہیں جن کے لئے انسان کو کچھ بھی صرف کرنا نہیں پڑتا۔ روزانہ کروڑوں لوگ روئے ارض پر پیدا ہو رہے ہیں ان میں سے بھی بیشتر غریب ملکوں میں۔ اسی طرح روئے ارض پر انسانوں، جانداروں، نباتات حتیٰ کہ جمادات کے فضلوں تک کی صفائی اور انہیں استعمال کے لئے از سر نو قابل بنانے پر اللہ تعالیٰ نے کتنے ملائکہ اور کتنی ہی مخلوقات کو لگا رکھا ہے۔ آخر پتھروں کا ٹوٹنا اور ریت اور مٹی کا بننا، جمادات

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asraralan.net

کے فضلے ہی تو ہیں جن کو ہوا اور ندیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاکر ان کا (Sedimentation) کرتی ہیں پھر ان کی Metamorphosis ہوتی ہے۔ روزانہ کروڑوں مربع میل میں پھیلے پیڑوں اور پودوں سے لکڑیاں اور پتے گرتے ہیں جو ان کے فضلے ہی ہیں انہیں ہوا، بارش اور زمین صاف کر کے پھر قابل استعمال بناتی ہیں۔ انسانوں اور جانداروں کے فضلوں کو کتنے ہی جاندار، ہوا، زمین اور آگ دوبارا قابل استعمال بناتی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے علاوہ کتنے ہی دیگر مخلوقات کو ان سنتوں کے لئے جارحہ بنا رکھا ہے جو باہم ایک دوسرے کے لئے مفید ہیں۔ چنانچہ انسانوں سے متعلق بہت سی ایسی سنتیں ہیں جن کا علم انسان کو ہے نہ ہی اس میں کچھ عمل دخل لیکن ان کی تدبیر پر کیڑے مکوڑے متعین ہیں جنہیں ان کی کنہ کا علم ہے۔ اپنے اوپر جاری بعض سنتوں سے انسان خود واقف ہے بعض سے نباتات، حیوانات اور حشرات الارض واقف اور ان پر متعین ہیں اور بیشتر سنتوں سے صرف ملائکہ ہی واقف ہیں اور ان پر وہی متعین ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان سب سے واقف ہے اور اسی کا دیا ہوا علم ان تمام مخلوقات کو ملا ہے۔ ان سب پر اللہ کی قدرت کاملہ حاوی ہے جس کا ذکر قرآن میں اس طرح فرمایا گیا ہے:

(۱) قل من بیدہ ملکوت کل شیء وھو یجیر ولا یجار علیہ ان کنتم تعلمون (المومنون ۸۸)

ترجمہ: تو کہہ کس کے ہاتھ میں ہے ملکوت ہر چیز کی اور وہ بچالیتا ہے اور کوئی اس سے نہیں بچا سکتا بتاؤ اگر تم جانتے ہو۔

(۲) فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیء والیہ ترجعون (یٰس ۸۳)

ترجمہ: سو پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہے ملکوت ہر شئے کی اور اسی کی طرف پھر کر چلے جاؤ گے۔

(۳) وسع کرسیہ السموات والارض (البقرہ ۲۵۵)

ترجمہ: گنجائش ہے اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو

چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس سابقہ تعلقات اور معلومات کی بنیاد پر بعض ایسے ملائکہ میں جو تدبیر عالم کے امور میں ارض وسماء کے نظام سے بالعموم اور نظام حیات انسانی سے بالخصوص علاقہ رکھتے تھے رسوخ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی اور ان کے توسط سے رفتہ

prepared by M. Aamir Mehmood
www.esraralam.net

رفتہ نظام حیات انسانی سے متعلق بیشتر شعبوں میں مثلاً نظام حیات بناتات، نظام حیات حشرات الارض، نظام حیات حیوانات، نظام حیات جمادات اور سب سے بڑھ کر نظام حیات انسان سے متعلق سنتوں میں تبدیلی، بگاڑ اور الٹ پلٹ کرنے میں کامیاب ہوگیا جس سے روئے ارض اور ماوراء ارض میں فساد ملکوت پیدا ہوگیا۔ دیکھتے دیکھتے یہ فساد ملکوت زمین و ماوراء زمین کے بیشتر حصوں پر محیط ہوگیا۔ روئے زمین و ماوراء زمین میں قائم نظاموں سے متعلق سنتوں کی یہی بربادی و تباہی دراصل فساد ملکوت کہلاتی ہے۔

اسی مقام پر اس بات کا واضح طور پر ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا (ہر چند کہ اس کی تفصیلات ان شاءاللہ بعد میں بیان کی جائیں گی) کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد اور بالخصوص 1687 عیسوی سے ظاہر ہونے والی دجالی تہذیب جسے موجودہ مغربی تہذیب کہا جاتا ہے اور اس میں اشاعت پذیر سائنسی و تکنیکی صورتحال اسی فساد ملکوت کا تیسرا مرحلہ ہے۔

فساد ملکوت کا پہلا مرحلہ زیر بحث ہے یہ فساد دراصل جاری سنتوں سے متعلق ملائکہ کے تحالف سے روئے ارض پر برپا کیا گیا۔

فساد ملکوت کا دوسرا مرحلہ جنوں کے تحالف سے 1600 قبل مسیح میں روئے ارض پر برپا کیا گیا تھا۔

اور یہ موجودہ فساد ملکوت جسے ہم مغربی سائنسی تہذیب (The Western Scientific Civilization) کہتے ہیں انسانوں کے تحالف سے ابلیس نے برپا کیا ہے جو تیزی سے شدید تر ہوتا جارہا ہے۔ جسے عام اور سطحی آنکھیں اور دماغ سائنس کے محیرالعقول کارنامے قرار دے رہے ہیں وہ فساد ملکوت کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے ابلیس اب انسانوں کے تحالف سے انجام دے رہا ہے۔

چونکہ اول الذکر فساد ملائکہ کی مدد اور تحالف سے اور ملائکہ ہی کے ہاتھوں سے لایا گیا تھا اور اس کا دائرہ ارض و سماء کے تمام نظامات کا جن کا تعلق حیات انسانی سے ہے احاطہ کر رہا تھا اس لئے دیکھتے دیکھتے اس فساد نے پوری روئے زمین اور اس پر بسنے والوں کو فساد آلودہ کر دیا۔

سنت اللہ، سحر اور سائنس

سنت اللہ

کائنات میں اور بالخصوص روئے ارض پر 'فسادِ ملکوت' کی حقیقت جاننے اور اس کے دقیق خطوط تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان درج ذیل امور پر غور وفکر کرے:

(۱) اللہ رب العالمین
(۲) صفت ربوبیت اور اظہار ربوبیت
(۳) امر اللہ
(۴) کائنات امر
(۵) خلق اللہ
(۶) کائنات خلق
(۷) کائنات امر وخلق
(۸) سنت اللہ
(۹) ترزیق
(۱۰) فطرت اللہ
(۱۱) منصوبۂ ربانی
(۱۲) حیات الجنۃ
(۱۳) توسیع حیات آدم برزمین
(۱۴) حیات الآخرۃ بمعنی رجعت
(۱۵) حیات الجنۃ

(واضح رہے کہ ان امور کی کافی تشریح الحمد للہ 'عالم اسلام کی منصبی و مقصدی صورت حال۔ محور اول: کتاب اول: ماکان وما یکون' میں آگئی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے) آئندہ سطور میں ان شاء اللہ بطور خاص جس امر پر بحث مقصود ہے وہ 'سنت اللہ' ہے۔ اس لئے کہ 'فساد

ملکوت' کا براہ راست تعلق اسی 'سنت اللہ' سے ہے۔

(۱) عادۃ اللہ: 'سنت اللہ' عادۃ اللہ ہے جو اللہ رب العلمین کے ارادہ کا اظہار ہے۔ کائنات یعنی کائنات امر و خلق میں (اور چونکہ یہاں بحث بنیادی طور پر خلق اللہ کے تناظر میں ہو رہی ہے اس لئے مخلوقات کے تناظر میں) اللہ رب العلمین کی سنت کی دو قسمیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) سنت اللہ اول: کائنات خلق و امر میں اللہ رب العلمین کی آزاد سنت
(۲) سنت اللہ دوم: کائنات خلق و امر میں اللہ رب العلمین کی متعین سنت

جہاں تک سنت اللہ اول کا تعلق ہے تو اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ اس کے برخلاف سنت اللہ دوم دراصل وہ سنت ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے متعین فرما دیا ہے۔ یہی وہ سنت ہے جسے ہم مختلف شکلوں میں آفاق و انفس میں پاتے ہیں مثلاً:

(۱) پانی رقیق ہے اور برف ٹھوس
(۲) پانی ٹھنڈا ہوتا ہے اور آگ گرم اور جلانے والی
(۳) دوران خون اور تنفس کا جاری رہنا انسانوں میں زندگی کی علامت ہے۔
(۴) نامی ہونا یعنی جسم میں نمو ہونا حیاۃ کی علامت ہے۔

یہ اور اس طرح کے دیگر اربوں کھربوں امور جن کا انسان آفاق و انفس میں مشاہدہ اور تجربہ کرتا ہے دراصل اللہ رب العلمین کی وہ سنت ہے جسے اس نے متعین کر دیا ہے۔ اور اس میں تبدیلی صرف اس صورت میں ہی ممکن ہے جب کسی چیز کی حقیقت بدل جائے۔

'متعین سنت اللہ' کی آفاق و انفس میں دو قسمیں پائی جاتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) غیر اختیاری
(۲) اختیاری اور مشارکتی

غیر اختیاری اس 'متعین سنت اللہ' کو کہتے ہیں جس پر معمول کا یعنی جس مخلوق پر وہ سنت جاری ہوتی ہے کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ مثلاً انسانی جسم میں اس غیر اختیاری سنت کی درج ذیل مثالیں لی جا سکتی ہیں:

(۱) اس کے خون کا کون سا گروپ ہو یا اس کے DNA کی کون سی ترتیب ہو۔
(۲) وہ مرد پیدا ہو اور اس کی ساری حیات پر مردانہ سنت جاری ہو یا عورت اور اس پر ساری

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asarelahi.net

حیات زنانہ سنت جاری ہو۔

(۳) نظام دوران خون، نظام تنفس، نظام ہضم، اور دیگر نظامات وغیرہ

(۴) اس کی پیدائش کب ہو اور اس کی موت کب ہو؟

اختیاری اور مشارکتی اس 'متعین سنت اللہ' کو کہتے ہیں جس پر معمول کا یعنی جس مخلوق پر وہ سنت جاری ہوتی ہے نہ صرف اختیار ہوتا ہے بلکہ خود سنت اس کے بعض یا کل حصوں پر اس معمول سے شرکت اور معاونت کا حکم کرتی ہے۔ چنانچہ اگر 'معمول' اور اس مقام پر انسان اگر اپنی حد تک اس میں شراکت نہ کرے تو یا تو اس سنت کا پورا اجراء نہیں ہوتا یا سرے سے اس سنت کا اجراء ہی موقوف ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

(۱) زندہ رہنے کے لئے کھانا پینا اور کھانے اور پینے میں مخصوص اعمال مثلاً چبانا یا گھونٹ گھونٹ پینا۔

(۲) زوجیت قائم کرنا تا کہ توالد و تناسل کا اجراء ہو۔

(۳) دیکھنے کے لئے آنکھیں کھولنا کسی شئے پر نظر ڈالنا اور اتنی دیر تک خواہ وہ ایک ثانیہ کا ایک حصہ ہی کیوں نہ ہو کسی مخصوص مقام پر نظر کو ٹکائے رکھنا تا کہ دیکھنے کی سنت کا اجراء ہو سکے۔ وغیرہ

چنانچہ جب مذکورہ تمام امور و وجوہ پر مشتمل سنت اللہ کو کائنات خلق و امر کے 'مثال' یا پیراڈائم (Paradigm) میں مشخص کیا جاتا ہے تو اسے قرآن 'فطرت اللہ' کا نام دیتا ہے۔ اس پورے تناظر کو اللہ رب العزت اس طرح بیان فرماتا ہے:

(۱) **فسبحن الله حين تمسون وحين تصبحون** (الروم ۱۷)

ترجمہ: پس تسبیح کرو اللہ کی جب کہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو

(۲) **وله الحمد في السموات والارض وعشياً حين تظهرون** (الروم ۱۸)

ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں اسی کے لئے حمد ہے اور (تسبیح کرو اس کی) تیسرے پہر اور جبکہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے۔

(۳) **يخرج الحي من الميت، ويخرج الميت من الحي ويحي الارض بعد موتها وكذلك تخرجون** (الروم ۱۹)

ترجمہ: وہ زندہ میں سے مردے کو نکالتا ہے اور مردہ میں سے زندہ کو نکال لاتا ہے اور زمین کو اسکی

موت کے بعد زندگی بخشتا ہے اس طرح تم لوگ بھی (حالت موت سے) نکال لئے جاؤ گے۔

(۴) ومن آیته ان خلقکم من تراب ثم اذا انتم بشر تنتشرون (الروم ۲۰)

ترجمہ: اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک تم بشر ہو کہ (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔

(۵) ومن آیته ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیها وجعل بینکم مودة ورحمة ان فی ذلک لایت لقوم یتفکرون (الروم ۲۱)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

(۶) ومن آیته خلق السموات والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذلک لایت للعلمین (الروم ۲۲)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لئے۔

(۷) ومن آیته منامکم بالیل والنهار وابتغاؤکم من فضله ان فی ذلک لایت لقوم یسمعون (الروم ۲۳)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارے اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو (غور سے) سنتے ہیں۔

(۸) ومن آیته یریکم البرق خوفا وطمعا وینزل من السماء ماء فیحی به الارض بعد موتها ان فی ذلک لایت لقوم یعقلون (الروم ۲۴)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

(۹) ومن آیته ان تقوم السماء والارض بامره ثم اذا دعاکم دعوة من

الارض اذا انتم تخرجون (الروم ۲۵)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں پھر جونہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارا بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔

(۱۰) **ولہ من فی السموات والارض کل لہ قنتون (الروم ۲۶)**

ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اس کے بندے ہیں۔ سب کے سب اس کے تابع فرمان ہیں۔

(۱۱) **وھو الذی یبد ؤ الخلق ثم یعیدہ وھو اھون علیہ ولہ المثل الاعلی فی السموات والارض وھو العزیز الحکیم (الروم ۲۷)**

ترجمہ: وہی ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لئے آسان تر ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اسی کی مثل الاعلیٰ ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔

(۱۲) **ضرب لکم مثلا من انفسکم ھل لکم من ماملکت ایمانکم من شرکاء فی مارزقنکم فانتم فیہ سواء تخافونھم کخیفتکم انفسکم کذلک نفصل الایت لقوم یعقلون (الروم ۲۸)**

ترجمہ: وہ تمہیں خود تمہاری اپنی ہی ذات سے ایک مثال دیتا ہے۔ کیا تمہارے ان غلاموں میں سے جو تمہاری ملکیت میں ہیں کچھ غلام ایسے بھی ہیں جو ہمارے دیے ہوئے مال و دولت میں تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہوں اور تم ان سے اسی طرح ڈرتے ہو جس طرح آپس میں اپنے بڑوں سے ڈرتے ہو؟ اس طرح ہم آیات کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

(۱۳) **بل اتبع الذین ظلموا اھواء ھم بغیر علم فمن یھدی من اضل اللہ ومالھم من نصرین (الروم ۲۹)**

ترجمہ: مگر یہ ظالم بے سمجھ بوجھ اپنے تخیلات کے پیچھے چل پڑے ہیں اب کون اسے راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو۔ ایسے لوگوں کا تو کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔

(۱۴) **فاقم وجھک للدین حنیفا فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لاتبدیل لخلق اللہ ذلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون (الروم ۳۰)**

prepared by M. Aamir Memood

ترجمہ: (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور نبی کے پیرو) یک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو، قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

چنانچہ قرآن اللہ رب العلمین کی اس عظیم الشان شان ربوبیت کا اظہار اسے:

'فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا' کا نام دے کر کرتا ہے اور اسے ہی 'دین القیم' کہہ کر پکارتا ہے۔

یہی وہ 'فطرت' ہے جس پر 'حضرت آدم قدیم و اقدم' کو پیدا فرمایا گیا تھا اور اسی پر انہیں 'الجنہ' میں رکھا گیا تھا۔

(۲) روداد حیات الجنہ:

الجنہ میں اللہ رب العزت نے حضرت آدم اور پھر بعد میں حضرت حوا کے لئے حیات کا جو ماڈل رکھا تھا وہ کل ملا کر تین اور بنیادی طور پر دو امور پر مشتمل تھا۔

الجنہ کی حیات کا پورا ماڈل

(۱)	الست بربکم	ایمان باللہ
(۲)	اسکن انت وزوجک الجنہ	سکونت یعنی الجنہ میں رہنا
(۳)	کلا منہا رغدا حیث شئتما و تقربا هذه الشجرة فتكونا من الظالمين	کرنا اور نہ کرنا

یعنی (۱) ایمان باللہ (۲) سکونت (۳) کرنا (یعنی زندہ رہنے کے لئے الجنہ کی چیزوں سے استفادہ کرنا) اور نہ کرنا (یعنی الشجرۃ سے استفادہ نہ کرنا)

غور کیا جائے تو یہ تین امور دراصل دو امور پر مشتمل ہیں:

(۱) علم اور دوسرا (۲) عمل

چنانچہ جیسا کہ دجال حصہ اول میں واضح کیا جا چکا ہے کہ ابلیس نے بہت غور سے الجنہ میں جاری 'سنت اللہ' یعنی فطرت اللہ کا مطالعہ کیا اور اس میں فساد انگیزی کے لئے جو طریقہ وضع کیا وہ نہایت عجیب تھا۔ ابلیس حضرات آدم و حوا کو بالآخر یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ 'علم' کے تعلق سے انفاقی کے بجائے اکتشافی علم کی طرف راغب ہو جائیں۔ چنانچہ حضرات آدم و حوا

سے جو بنیادی گناہ سرزد ہوا وہ یہی تھا کہ وہ دونوں انفاقی علم کو چھوڑ کر اور اس پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے اکتشافی علم کی طرف راغب ہی نہیں ہوئے بلکہ اس علم میں سرگرم ہو گئے۔ یہی سبب ہے کہ میں نے لکھا تھا کہ انفاقی علم ربانی اور نبوی علم ہے اور اکتشافی علم ابلیسی (ملاحظہ فرمائیں ماکان وما یکون: ادراک کائنات صفحات ۱۷ تا ۴۳)

واضح رہے کہ ابلیس اس روئے ارض پر اسی 'طریقۂ انحراف، کو دوبارہ روبہ عمل لا رہا ہے جس کے ذریعہ اس نے الجنہ میں حضرات آدم وحوا کو گمراہ کیا تھا اور جس طریقے کو اس نے الجنہ میں موثر اور کامیاب پایا۔ چنانچہ الجنہ میں اس نے جو 'انفجار' (Dynamite) کیا وہ 'علم' کا انفجار تھا چنانچہ جنتی ربانی علم کو انفجار کر کے اڑا دینے سے اس کا براہ راست اثر ماڈل کے دوسرے اور آخری حصے 'عمل' پر پڑا اور نتیجتاً وہ گناہ سرزد ہو گیا جس نے حضرات آدم وحوا کو بالآخر اس روئے ارض پر آجانے پر مجبور کر دیا۔

ابلیس نے الجنہ میں حضرات آدم وحوا علیہما السلام کو باور کرایا:

(۱) انفاقی علم اصل نہیں بلکہ اکتشافی علم اصل ہے

(۲) اکتشافی علم انفاقی علم کے مقابلے میں نہایت مفید ہے

(۳) انفاقی علم قوای آدم کو پوری طرح ارتقاء پزیر نہیں کرتا جب کہ اکتشافی علم اسے پوری طرح ارتقاء پزیر کرتا ہے اور اس سے بھرپور استفادہ کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

(۴) انفاقی علم آدم کو معمولی اور سب سے نچلی سطح پر باقی رکھتا ہے جب کہ اکتشافی علم اسے حیات دوام سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

لہٰذا ابلیس نے باور کرا دیا کہ آدم وحوا کے لئے یہی نافع ترین بات ہے کہ وہ انفاقی علم اور انفاقی علم پر مبنی اور اس سے مضبوط (regulated) عمل کو ترک کر دیں اور اکتشافی علم اور اکتشافی علم پر مبنی اور اس سے مضبوط (regulated) عمل کو اختیار کر لیں۔ اس طرح ابلیس نے حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کو باور کرایا کہ وہ دو چیزوں کو ایجاد کریں اور ان سے استفادہ کریں۔ چنانچہ حضرات آدم وحوا نے یہی کیا۔ یہ دو چیزیں تھیں:

(۱) علم طبیعیات (Physical Science) اور

(۲) علم ہنر (Technology)

الجنہ میں گناہ آدم اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ حضرات آدم وحوا نے ابلیس کے گمراہ کرنے کے بعد علم طبعیات (Physical Science) اور علم ہنر (Technology) کا آغاز اور اس سے استفادہ کیا۔ اور یہی دونوں اسباب بنے اس ناکامی کے جس کا نتیجہ الجنہ سے محرومی اور روئے ارضی پر بسا دیئے جانے کی صورت میں سامنے آیا۔

(انشاء اللہ ان امور کی تشریح عن قریب آ رہی ہے)

(۳) روداد حیات ارضی:

جیسا کہ ابھی ابھی عرض کیا گیا کہ ابلیس اس روئے ارض پر اسی 'طریقہ انحراف' کو دوبارا روبہ عمل لا رہا ہے جس کے ذریعہ اس نے الجنہ میں حضرات آدم وحوا علیہما السلام کو گمراہ کیا تھا اور جس طریقے کو اس نے الجنہ میں موثر اور کامیاب پایا۔ چنانچہ روئے ارضی پر ابلیس کے ذریعہ معرکۂ خیر وشر میں بنیادی طور پر اسی طریقہ کار سے منصوبۂ ربانی کو ناکام بنانے کی روداد ملتی ہے۔

(۴) سحر اور ساحر: 'سحر' کیا ہے؟ قرآن اور احادیث مبارکہ میں 'سحر' کا جو ذکر ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ علوم اسلامی ـــــ تفسیر قرآن، تشریحات احادیث، تاریخ اسلام، تدوین علوم اسلامی اور تاریخ علوم اسلامی ـــــ میں جن امور اور موضوعات کے ساتھ لاعلمی، جہالت اور بدمعاملگی کی کوئی انتہاء نہیں ان میں سے ایک موضوع 'سحر' بھی ہے۔ قرآن جیسی کتاب اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اسوہ کی موجودگی میں بھی کوئی قوم فہم وادراک کے معاملہ میں لاعلمی، جہالت اور بدمعاملت کی ان سرحدوں تک جا سکتی ہے تصور میں نہیں آتا۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صورت حال عہد تابعین سے لیکر آج تک اور مفسرین، محدثین، فقہا، مورخین، منطقیین سے لیکر روحانیین تک یکساں ہے۔ بعض نے چند الفاظ میں اور بعض نے صفحات کے صفحات میں اس عنوان پر کلام و بحث فرمائی ہے لیکن ان تمام ذخیرے کے مطالعے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی تین باتوں کا علم نہ تھا یعنی:

(۱) لفظ 'سحر' کا معنی کیا ہے؟ یعنی تاریخ امت کے پہلے حصے کو چھوڑ کر امت میں 'سحر' کے معنی سے لاعلمی عام رہی ہے۔

(۲) 'سحر' کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی تاریخ امت کے پہلے حصے کو چھوڑ کر امت میں 'سحر' کی حقیقت سے لاعلمی عام رہی ہے۔

(۳) ‘سحر’ کی تفہیم اور اس کا ادراک کیا ہے؟ یعنی تاریخ امت کے پہلے حصے کو چھوڑ کر امت میں سحر کے مفہوم اور مدرک سے لاعلمی عام رہی ہے۔

چنانچہ ‘سحر’ کے لفظی اور لغوی معنی جاننے تک سے عاری ہونے کی کیفیت نے علوم اسلامی کے بڑے بڑے اساطین کو گول مول بات کرنے کا فن سکھایا۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

اعلم ان لفظ السحر فی عرف الشرع مختص بکل امر ..... (تفسیر کبیر تفسیر سورہ البقرہ جلد ۱ صفحہ ۴۲۰)

ترجمہ: جاننا چاہئے کہ بے شک لفظ ‘سحر’ شرع میں عرفاً (یعنی شہرت یافتہ) اس بات کے لئے خاص ہے جو..... چنانچہ ‘فی عرف الشرع’ دراصل وہ چلمن ہے جس کے پیچھے سے بات کرنے کی ضرورت صرف اس لئے آن پڑی کہ لفظ ‘سحر’ کا جو معنی معلوم تھا وہ منطبق نہیں ہوتا تھا اور جسے بیان کرنا تھا اس کا معنی معلوم نہیں تھا۔

یہی صورتحال امام ابوبکر جصاص کو پیش آئی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

‘ومتی اطلق فھو اسم لکل امر .... (احکام القرآن جلد ۱ صفحہ ۴۸)

ترجمہ: اور جب اسے مطلق استعمال کیا جائے تو یہ ہر اس بات کے لئے........

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہی کام جو امام رازی نے ‘فی عرف الشرع’ سے چلایا ہے امام جصاص ان سے پہلے ‘ومتی اطلق’ سے چلا چکے ہیں۔

امت مسلمہ تھوڑے ہی عرصے بعد ایسی بنا دی گئی جس کو لفظ ‘سحر’ کا معنی نہیں معلوم۔ اور واضح رہے کہ یہ کوئی معمولی لفظ نہیں بلکہ وہ لفظ ہے جس کا استعمال قرآن عظیم الشان اور احادیث مبارکہ کے ساتھ ساتھ حیات طیبہ کے ذیل میں بھی ہوا ہے۔ اس لئے ایسی قوم کے علماء کے ذریعہ اس لفظ ‘سحر’ کی بیان کردہ حقیقت اور اس کا مفہوم و مدرک کس پایہ کے ہونگے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بڑے سوال کا جواب یعنی یہ کہ اس قوم کے علماء کا قرآن، احادیث مبارکہ اور حیات طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنا تعلق اور اس میں کتنا رسوخ رہا ہے؟ خود بخود مل جاتا ہے۔

چنانچہ لفظ ‘سحر’ کے تعلق سے اساطین علماء اسلام نے جو کچھ فرمایا ہے اسے آسانی کے

prepared by M. Aamir
www.urdumoviez.net

لئے سات بڑے طبقات میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) **بے حقیقت اور باطل:** یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو بے حقیقت سمجھتا، جانتا اور بیان کرتا ہے لہذا اسے باطل قرار دیتا ہے۔ اس میں اگر چہ کئی طبقات ہیں لیکن مجموعی طور پر ان سبھوں میں یہی تاثر مشترک ہے۔ چنانچہ اس طبقے میں ابوبکر جصاص، ابواسحق اسفرائنی، ابن حزم اور معتزلہ آتے ہیں۔

(۲) **بے حقیقت اور باطل:** یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو بے حقیقت بیان کرتا ہے لہذا اسے باطل قرار دیتا ہے۔ اس طبقہ میں صرف ایک ہستی کا شمار ہو سکتا ہے اور وہ ہیں ابوحنیفہ نعمان جو امام اعظم کے نام سے مشہور ہیں۔

(۳) **حقیقت اور حق:** یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو حق سمجھتا ہے اس لئے کہ اس کی حقیقت ہے اس طبقے میں مشہور نام ابوعبداللہ القرطبی کا ہے۔

(۴) **حقیقت اور صحیح:** یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو صحیح سمجھتا ہے اس لئے کہ اس کی حقیقت ہے۔ عام طور پر اس طبقے میں محدثین شامل ہیں اور ان میں امام نووی سب سے مشہور ہیں۔ اس طبقے کے نزدیک حقیقت اور صحیح کا صرف یہ مفہوم ہے کہ اس کا ذکر احادیث میں آیا ہے جس کا تعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں پیش آنے والے واقعہ سے ہے لہذا چونکہ وہاں یہ ایک حقیقت اور موثر نظر آتا ہے اس لئے وہ اسے حقیقت اور صحیح کہتے ہیں۔

(۵) **حقیقت اور صحیح:** یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو صحیح سمجھتا ہے اس لئے کہ اس کی حقیقت ہے۔ لیکن اس طبقے کی رائے میں محدثین کی طرح صرف احادیث اور حیات طیبہ میں سحر کے 'وجود' اور اسکے تاثر کی موجودگی کے علاوہ اسباب بھی شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس میں وہ طبقہ مراد لیا جاتا ہے جو امت میں 'جمہور' یا 'عام علماء' کے نام سے مشہور ہیں۔

(۶) **حقیقت، صحیح اور کلی:** یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو ایک کلی حقیقت کے بطور سمجھتا ہے یعنی اس میں قوت ہے اور یہ قوت اس درجے کی ہے کہ کلی تبدیلی واقع ہونا ممکن ہے مثلاً پتھر گھوڑا ہو جائے یا گھوڑا پتھر، آدمی بکری ہو جائے یا بکری آدمی۔

(۷) **حقیقت، صحیح اور جزوی:** یہ وہ طبقہ ہے جو 'سحر' کو ایک جزوی حقیقت کے بطور تسلیم کرتا ہے یعنی اس سے تبدیلیٔ مزاج اور تغیر حالات جزوی طور پر واقع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً آدمی بیمار ہو سکتا

prepared by M. Aamir Mehmood
www.urdunovlesnet

ہے یا بیمار سے اچھا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ طبقہ اسے تسلیم نہیں کرتا کہ آدمی پتھر ہو جائے یا پتھر گھوڑا۔ عام طور پر 'جمہور' اس خیال کے حامل ہیں۔

یہ ساتوں طبقات تاریخ اسلام میں بعض اوقات باہم ممیز اور بعض اوقات جزواً آمیختہ بھی پائے جاتے ہیں تاہم ان میں دو طبقات ایسے ہیں جو بقیہ دوسروں سے ممتاز ہیں۔ ان میں پہلا وہ ہے جو شمار نمبر ۲ کے تحت ہے اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو شمار نمبر ۴ کے تحت ہے۔ ان میں شمار نمبر ۴ کے تحت محدثین آتے ہیں۔ اس طبقے کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے نزدیک کسی امر کے صحیح اور درست ہونے کی صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی امر کے تعلق سے کوئی حدیث ملتی ہے اور وہ اس 'روایت' کے اعتبار سے اور اس 'درایت' کے اعتبار سے جو محدثین میں رائج رہے ہیں اگر 'سمین' ہے تو پھر وہ امر صحیح اور درست ہے۔ شمار نمبر ۲ کے تحت جو طبقہ آتا ہے وہ بنیادی طور پر 'امام اعظم' ابو حنیفہ پر مشتمل ہے۔ امام اعظم سے منسوب جو بات ہے اس میں وہ 'سحر' کو صرف بے حقیقت بیان کرتے ہیں اور اس وجہ سے اسے باطل قرار دیتے ہیں۔ اس میں اکی چنداں صراحت نہیں کہ وہ 'سحر' کو بے حقیقت سمجھتے اور جانتے بھی ہیں۔

لیکن ان تمام یعنی ساتوں طبقات میں 'مشترک' یہ بات ہے کہ ان میں سے کسی طبقے کو 'سحر' کا معنی، اس کی حقیقت اور اس کے مفہوم کا علم نہیں۔ اور جو کچھ انہیں معلوم ہے اور جس کو یہ بیان کرتے ہیں (نمبر شمار ۴ کو چھوڑ کر) اس کا تعلق قرآن اور احادیث سے قطعاً نہیں بلکہ ان کی ساری آراء کی بنیاد وہ تفصیلات اور خرافات ہیں جو یہودیوں، یونانیوں، مجوسیوں اور ہندوؤں کے ذریعہ ان تک پہنچے تھے جن میں نبطیوں، بابلیوں اور مصریوں کی معلومات بھی شامل تھیں۔ چنانچہ 'سحر' کے تعلق سے جو 'علمی' ذخیرہ امت میں جمع ہو گیا اور جس کی مختصر مگر بہترین ترتیب اور تدوین ابن خلدون کے ذریعہ مقدمہ میں کی گئی ہے اور جن کی تفصیلات 'الفلاحة النبطية' اور 'مصاحف الكواكب السبعة' میں یا جابر بن حیان، مسلمہ بن احمد المجریطی یا فخر بن الخطیب کے حوالے سے ملتی ہیں۔ وہ انہیں 'خرافات' پر مشتمل ہے جو امت میں رائج ہو گئے تھے جن کا قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور دور کا کوئی تعلق نہ تھا۔ چنانچہ ان 'خرافات' نے اس 'سحر' کا حکم معلوم کرنے کے ذیل میں کلامی مباحث کا ایک نیا دروازہ وا کر دیا جس میں نہ صرف یہ کہ 'سحر' اور 'ساحر' کے تعلق سے شریعت کا حکم جاننے کی کوشش کی گئی بلکہ اس کا مقابلہ 'معجزہ' سے بھی

کیا گیا چنانچہ ابن تیمیہ ہوں یا محمد سفارینی وہ بھی ان بحثوں میں پڑ گئے جو قرآن اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بیان کردہ حقیقت سے دور لے جانے والے تھے۔

امت میں یہ صورتحال کیسے پیدا ہو گئی کہ امت قرآن و سنت کے سمجھنے اور اس کی باریکیوں سے نابلد ہوتی چلی گئی۔ کیا یہ سب اتفاقاً، حادثاتی طور پر اور اچانک ہو گیا؟ حقیقت یہ ہے کہ نہ یہ حادثاتی طور پر ہوا نہ ہی اتفاقاً اور نہ اچانک۔ یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے اور سازش کے تحت ہوا۔ چنانچہ مذکورہ صورتحال کے پیچھے درج ذیل اسباب تھے:

(۱) عربی مبین سے ناواقفیت: امت ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اور تدبیر کے ذریعہ عربی مبین سے ناواقف بنا ڈالی گئی۔ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور اجل تابعین کی شہادت، انتقال یا انہیں حاشیہ پہ پہنچا دینے کو اس میں سب سے بڑا دخل ہے۔ اس عربی مبین کے بعد عربی مبین کے نام سے ایک ایسی زبان رائج کی گئی جو نہ صرف یہ کہ عربی مبین نہیں تھی بلکہ اس کا ظرف اتنا تھا ہی نہیں کہ وہ قرآن و سنت کو اخذ کر سکے اور ان کے لئے ذریعۂ اظہار بن سکے لہٰذا چند ہی دقائق میں اس زبان کا پیالہ لب ریز ہو گیا اور بقیہ گنج ہای گراں مایہ بہہ کر زمین میں معدوم ہو گئے اور یہ سب کچھ صرف چند دہوں میں ہو گیا۔

(۲) حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور اجل تابعین کی شہادت، انتقال اور انہیں حاشیئے پر لادیئے جانے نے ان مفاہیم کو بھی جو قرآن و سنت میں مذکور امور سے متعلق تھے ان کے ساتھ ہی مدفون کر دیا۔ اور امت نہ صرف یہ کہ ان سے ناواقف ہو گئی بلکہ ان جیسے ہی عنوانات پر ایسی چیزوں سے بالارادہ واقف کرا دی گئی جن سے حضرات صحابۂ کرام تک واقف نہ تھے۔

(۳) یہی صورتحال بالآخر قرآن کے ساتھ ساتھ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باریک خطوط اور در و بست کے بھی معدوم ہو جانے کا سبب بنی۔ اور اس طرح سنت الانبیاء اور بالخصوص سنت نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حالت باقی نہیں رہی جن سے حضرات صحابۂ کرام واقف تھے۔

(۴) جب یہ سب کچھ امت مسلمہ میں ہو رہا تھا اسی وقت اس امت میں ایسے علوم بالجبر داخل کرا دیئے گئے جن کا قرآن و سنت سے نہ صرف یہ کہ تعلق نہیں تھا بلکہ وہ ان کی ضد تھے۔ ان علوم

www.booktube.net
prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

نے جلد رواج پالیا اور اب اسلام، قرآن اور سنت کے دقائق کی تحقیق ان علوم کے سہارے ہونے لگی۔ چنانچہ علوم کی یہ مداخلت بے جا بھی سبب بنی اسلامی علوم کا قرآن وسنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی سرچشمے سے دور ہو جانے کا۔

(۵) سخر اور تسخیر:

(الف) 'سخر' کیا ہے؟ 'تسخیر' کیا ہے؟ کوئی چیز مسخر کیسے ہوتی ہے؟ اسے کون مسخر کرتا ہے؟ یہ چند سوالات ہیں جو نہایت اہم ہیں۔

عربی مبین میں 'سخر' کے معانی درج ذیل ہیں:

(۱) بڑا بننا
(۲) حکمرانی کرنا
(۳) باندھنا، مضبوط کرنا
(۴) منضبط کرنا
(۵) کسی فرد یا شئے کو ضبط یا قرق کرنا
(۶) کسی کو کسی مخصوص کام میں لگانا
(۷) کسی کو کسی مخصوص کام کے لائق بنانا
(۸) کسی کو کسی مخصوص کام کا حکم کرنا
(۹) کسی سے کوئی مخصوص کام لینا

(ب) قرآنی استعمالات: قرآن کے مطابق 'سخر' کا براہ راست تعلق 'سنت اللہ' سے ہے۔ اس کا واضح مفہوم ہے کہ 'سخر' دراصل 'سنت اللہ' کا اجراء اور اجازت استعمال (Order of Application) ہے۔ لہذا کائنات کی کوئی شئے اس وقت تک قابل استفادہ اور قابل استعمال نہیں ہو سکتی جب تک اسے 'سخر' نہ کر دیا جائے۔ لہذا 'سخر' کرنا علی الاطلاق صرف اور صرف اللہ رب العالمین کا حق اور اختیار ہے۔ کائنات کی کوئی شئے اس وقت تک 'سخر' نہیں ہو سکتی جب تک اللہ تعالیٰ اس شئے سے متعلق اپنی سنت کو جعل نہ کرے اس طرح 'سخر' دراصل کسی شئے کے تعلق سے خود رب العالمین کے ذریعہ اسکی جعل کردہ 'سنت' کا اجراء ہے۔ اس طرح 'سخر' اللہ تعالیٰ کا اختیار خاص ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ کسی شئے کا صرف ایک ہی استعمال

ہوسکتا ہے اور وہ استعمال ہے اس شئے سے متعلق ’سحر‘ کے عین مطابق استعمال۔ یعنی کائنات میں کسی مخلوق کا صرف ایک استعمال ہوسکتا ہے اور وہ استعمال اس سے متعلق ’سحر‘ اور ’سنت اللہ‘ سے عین مطابقت رکھتا ہو۔ کسی مخلوق کا اسکے ’سحر‘ اور ’سنت‘ کے خلاف استعمال و استفادہ ہی ’فساد‘ ہے۔

یہی سبب ہے کہ قرآن نے ’سحر‘ کو صرف دو طریقوں سے استعمال کیا ہے اور دونوں کی نسبت اللہ رب العالمین کی طرف ہے۔

(ج) پہلا استعمال: ’سحر‘ کا پہلا استعمال مطلق ہے۔ چنانچہ اس صورت میں اس کا تعلق علی الاطلاق صرف رب العالمین سے ہوتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

(۱) **اللہ الذی رفع السموات بغیر عمد ترونہا ثم استوی علی العرش وسخر الشمس والقمر** (الرعد۲)

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے اونچے بنائے آسمان بغیر ستون دیکھتے ہو پھر قائم ہوا عرش پر اور سخر کیا سورج اور چاند کو۔

(۲) **ولئن سالتہم من خلق السموات والارض وسخر الشمس والقمر لیقولن اللہ فانی یوفکون** (العنکبوت ۶۱)

ترجمہ: اور اگر تو لوگوں سے پوچھے کہ کس نے بنایا ہے آسمانوں اور زمین کو اور سخر کیا ہے سورج چاند کو تو کہیں اللہ نے پھر کہاں سے الٹ جاتے ہیں۔

(۳) **الم تران اللہ یولج الیل فی النہار ویولج النہار فی الیل وسخر الشمس والقمر** (لقمن: ۲۹)

ترجمہ: تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور سخر کیا سورج اور چاند کو۔

(۴) **یولج الیل فی النہار ویولج النہار فی الیل وسخر الشمس والقمر** (فاطر۱۳)

ترجمہ: رات داخل کرتا ہے دن میں اور دن داخل کرتا ہے رات میں اور سخر کیا سورج اور چاند کو۔

(۵) **خلق السموات والارض بالحق یکور الیل علی النہار ویکور النہار**

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

علی الیل وسخر الشمس والقمر (الزمر ۵)

ترجمہ: بنائے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک لپیٹتا ہے رات کو دن پر اور لپیٹتا ہے دن کو رات پر اور سخر کیا سورج اور چاند کو۔

'سخر' وہ عمل اور اختیار و حق ہے جو صرف اللہ رب العالمین کے لئے خاص ہے۔

دوسرا استعمال: 'سخر' کا دوسرا استعمال 'ل' صلہ کے ساتھ ہے۔ اس کا مفہوم اللہ کا فضل، اس کا انعام، اس کی ودیعت، اس کی رزاقیت اور اس کی ربوبیت کا اظہار ہے۔ چنانچہ 'سخر' 'ل' کے ساتھ اللہ کا فضل، انعام، ودیعت، ترزیق یا مظہر ربوبیت ہوتا ہے۔

(۱) اللہ الذی خلق السموات والارض وانزل من السماء ماء فاخرج به من الثمرات رزقا لکم وسخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ وسخر لکم الانهار و سخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم الیل والنهار وآتکم من کل ما سالتموہ وان تعدوا نعمت الله لا تحصو ها ان الانسان لظلوم کفار (ابراہیم ۳۲_۳۴)

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے بنایا آسمانوں اور زمین کو اور اتارا آسمان سے پانی پھر اس سے نکالی روزی تمہاری میوے اور سخر کیا تمہارے لئے کشتی کو کہ چلے پانی میں اس کے حکم سے اور سخر کیا تمہارے لئے ندیاں کو اور سخر کیا تمہارے لئے سورج اور چاند کو ایک دستور پر برابر اور سخر کیا تمہارے لئے رات اور دن کو اور دیا تم کو ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی اور گنو احسان اللہ کے نہ پورے کر سکو۔ بے شک آدمی بڑا بے انصاف ہے ناشکر۔

یہی مفاہیم النحل، الحج، لقمان، الزخرف، الجاثیہ، الانبیاء، ص، وغیرہ میں بیان ہوئے ہیں۔ قرآن کے اس استعمال سے اندازہ ہوتا ہے کہ کائنات اور اس کے اندر تکوین و تخلیق کردہ کسی فرد اور شے کو کسی دوسرے کے لئے 'مسخر' کرنا یعنی اس کو 'سخر' کرنا بھی اللہ رب العالمین کا حق اور اختیار خاص ہے۔ اس طرح کائنات کی کوئی شئے نہ تو کسی دوسرے کے ذریعہ 'مسخر' کی جا سکتی ہے اور نہ دوسرے کے ذریعہ دوسروں کے لے 'سخر' کی جا سکتی ہے۔ اور اگر ان دو صورتوں کے علاوہ کوئی اور صورت پائی جاتی ہے تو وہ ممنوع، حرام، اور فساد ہوگی۔ اس لئے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اللہ رب العالمین کے اختیار خاص اور حق خاص میں تجاوز ہے بلکہ 'سنت اللہ' کے خلاف بھی ہے۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.aeraralam.net

(د) **انفاقی نقطۂ نظر :** اللہ تعالیٰ رب العالمین کی تکوین اور تخلیق مقصدی ہے۔ کائنات ایک مقصد کے تحت بنائی گئی ہے۔ یہ مقصد رب العالمین کا اپنا مقصد ہے۔ اس لئے اس کی ’سنت‘ اور ’سحر‘ میں بھی وہی مقصدیت کارفرما ہے۔ وہی ربانی مقصد ساری کائنات کا مقصد ہے اور ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ انفاقی نقطۂ نظر بھی مقصدی ہے۔ اور اس میں وہی مقصدیت پائی جاتی ہے جو ربانی مقصد ہے۔

(ا) **الجنہ میں انفاقی صورتحال :** اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ الجنہ میں جو ربانی منہج یا ماڈل دیا گیا تھا اس کے دو بنیادی جز تھے جو مقصد سے مل کر کل تین ہوتے تھے:

(۱) علم
(۲) عمل
نتیجہ
مقصد کا حصول

الجنہ میں اللہ تعالیٰ نے علم اور عمل دونوں کے درجوں کی تعیین فرمادی تھی۔ یہ تعیین ہی الجنہ کی ’سنت‘ تھی۔ اس سنت کی تفہیم کے لئے چند باتوں کا سمجھنا ضروری ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) **علم صالح اور علم غیر صالح:** الجنہ کی مذکورہ ’سنت‘ کے تحت اللہ تعالیٰ نے حضرات آدم وحوا کو ’علم‘ دیا۔ یہ علم کی تعلیم و تعلم کی انفاقی سطح تھی۔ چنانچہ تعلم کی انفاقی سطح یہ مقرر کی گئی کہ آدم وحوا اسی تعلیم کی انفاقی سطح پر رہتے ہوئے تعلم کو توسیع دیں۔ اس طرح یہ تعلیم و تعلم کی وہ انفاقی سطح ہوتی جو الجنہ میں مطلوب تھی۔ یہی علم علم صالح ہے۔ یہ وہی سطح تھی جس پر رہتے ہوئے آدم وحوا مقصد ربانی کی احسن طریقے سے تکمیل کر سکتے تھے۔ اس سطح کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اور کسی اور سطح پر جا کر تعلیم و تعلم کرنا دراصل اکتشافی نقطۂ نظر قرار پاتا ہے۔ ایسا کرنا آدم وحوا کے لئے مہلک اور نقصان دہ تھا اور انہیں اس سے روکا گیا تھا۔ تعلیم و تعلم کی یہ اکتشافی سطح فساد پیدا کرنے والی اور مقصد سے بھٹکا دینے والی تھی۔ اس طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ علم صالح تعلیم و تعلم کی وہ مخصوص سطح ہے جو کسی مخلوق اور یہاں اس سے مراد انسان ہے کے لئے خاص ہے۔ اس سطح پر افقی توسیع (Horizontal Extension) کی پوری گنجائش موجود ہے۔ جبکہ علم غیر صالح تعلیم و تعلم کی انسانی سطح کے علاوہ دوسری مخلوقات و حالات کے لئے مخصوص سطح پر جا کر تعلیم و تعلم کو توسیع دینا ہے اور ایسا عمودی حرکت (Vertical Movement) کئے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ انسان کے ذریعہ کوئی ایسی عمودی حرکت کر کے تعلیم و تعلم کو عمودی اور افقی توسیع دینا دراصل علم غیر صالح

prepared by M.Aamir Mehmood
www.urdumovie.net
www.asrarealam.net

ہے۔ یہی علم غیر صالح اکتشافی سطح کا علم ہے۔

(۲) عمل صالح اور عمل غیر صالح: الجنہ کی مذکورہ 'سنت' کے تحت اللہ تعالیٰ نے حضرات آدم وحوا کو 'عمل' کی تلقین کی۔ الجنہ میں 'عمل' کی تلقین کی یہ انفاقی سطح تھی جو تخلیق آدم کے مقصد کی تکمیل کرنے والی اور مطلوب تھی۔ چنانچہ جو عمل انسان کے مقصد تخلیق کو پورا کرنے میں معاون ہو اور اس کے لئے خاص ہو وہی عمل صالح ہے۔ اس کے برخلاف 'وہ عمل' جو اس مقصد تخلیق سے ہٹا ہوا یا اس سے ہٹا دینے والا ہو یا جس عمل کے کرنے سے انسان بے جا مشکلات اور دشواریوں سے اپنے مقصد تک پہنچتا ہو وہ 'عمل غیر صالح' ہے۔ چنانچہ انفاقی علم کی سطح پر رہتے ہوئے انفاقی عمل کا صدور مقصد کو پورا کرنے میں سب سے احسن صورت پیدا کرتا ہے۔ انفاقی سطح پر رہتے ہوئے 'عمل' کی توسیع کی ساری گنجائش موجود ہے لیکن اس انفاقی سطح کو چھوڑ کر اور عمودی حرکت کرتے ہوئے دوسروں کے لئے مخصوص سطحوں پر چلا جانا اور 'عمل' کو جاری رکھنا 'اکتشافی عمل' ہے جو انسان کے لئے ہلاکت اور مقصد سے دور رکھنے والا ہے۔ 'اکتشافی عمل' کے لئے عمودی حرکت (Vertical Movement) ضروری ہے۔ اور ایسی حرکت کرنا فساد انگیزی ہے۔ چنانچہ انسان کا اپنی انسانی انفاقی سطح سے عمودی حرکت کر کے دوسروں کے لئے خاص انفاقی سطح پر جا کر عمل کرنا عمل غیر صالح ہے۔

(۳) نتیجۂ صالح اور نتیجۂ غیر صالح: انفاقی علم یعنی انفاقی تعلیم و تعلم اور انفاقی عمل کے ذریعہ نتیجۂ صالح کا حصول ہوتا ہے خواہ فرد کی صورت میں ہو یا شئے کی صورت میں یا اجر اور ثواب کی صورت میں۔ مثلاً فرد کی صورت میں نتیجۂ صالح یہ ہوتا ہے کہ 'صالح اولاد' نصیب ہوتی ہے۔ شئے کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ 'صالح رزق' ملتا ہے اور اجر وثواب کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ عنداللہ جزا ملتی ہے۔ جنہیں دعوات صالحہ اور اعمال صالحہ کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف اکتشافی علم یعنی اکتشافی تعلیم و تعلم اور اکتشافی عمل کے ذریعہ نتیجۂ 'غیر صالح' کا حصول ہوتا ہے خواہ ایسا اولاد کی صورت میں ہو جو 'عمل غیر صالح' قرار پائے یا اس شئے کی صورت میں ہو جو 'رزق غیر صالح' قرار پائے یا ایسے اجر وثواب کی صورت میں ہو جو 'اعمال غیر صالح' قرار پائے۔

چنانچہ الجنہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرات آدم وحوا کو انفاقی تعلیم و تعلم اور انفاقی عمل کا حکم فرمایا اور اکتشافی تعلیم و تعلم اور عمل سے روکا تا کہ نتیجۂ صالح کا حصول ہو۔ اس کو منہدم کرنے کے

لئے ابلیس نے جو فساد برپا کیا اور حضرات آدم وحوا جس کے شکار ہو گئے وہ دراصل علم اور عمل کی ہر دو سطح پر انفجار (Explosion) کر دینا تھا۔ چنانچہ ابلیس نے حضرات آدم وحوا کو انفاقی تعلیم و تعلم سے اکتشافی تعلیم و تعلم کی طرف مائل کر دیا۔ اور ان دونوں نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انفاقی تعلیم و تعلم کو انفاقی توسیع (Infaqi Extension) دینے کے بجائے اکتشافی تعلیم و تعلم کو پورا کرنے کے لئے عمودی حرکت یا چھلانگ (Vertical Movement or Jump) لگا دی جو دراصل ایک اکتشافی عمل تھا۔ اس طرح اکتشافی تعلیم و تعلم اور اکتشافی عمل کے ذریعہ الجنہ میں پہلے مرحلے میں دو عظیم فسادات کا ظہور ہوا یہ دو فسادات تھے:

(۱) اکتشافی علم یعنی علم طبیعیات (Physical Science) اور

(۲) اکتشافی ہنر یعنی ٹکنالوجی (Technology)

الجنہ کی 'سنت اللہ' اور اس میں اللہ کی جانب سے حضرات آدم وحوا کے لئے 'سحر' انفاقی تھے۔ اس مخصوص 'سحر' کے تحت الجنہ نہ کسی 'علم طبیعیات' کو قبول کر سکتی تھی نہ کسی علم ہنر یعنی ٹکنالوجی کو۔ لہذا ایسا کرتے ہی الجنہ میں فساد کا آغاز ہو گیا۔ ظاہر ہے یہ اکتشافی تعلیم و تعلم اور اکتشافی عمل یعنی علم طبیعیات (Physical Science) اور علم ہنر (Technology) نتیجۂ غیر صالحہ پیدا کرتا۔ چنانچہ وہ نتائج کئی صورتوں میں ظاہر ہونے لگا:

(۱) احساس عورات اور شرمگاہ شروع ہو گیا۔

(۲) احساس وخواہش مقاربت بصورت جدید اور بذریعہ آلہ جات ہونے لگا۔

(۳) ضرورت بول و براز ہونے لگی

(۴) حادثۂ حمل اولاد ہو گیا یعنی حمل قرار پا گیا۔

چنانچہ بہت جلد الجنہ حضرات آدم وحوا کے لئے ناقابل برداشت اور اس کے لئے یہ حضرات ناقابل برداشت ہو گئے۔ اس ناقابل برداشتگی (Unsustainability) کی بنیادی وجہ تھی الجنہ میں علم طبیعیات یعنی سائنس (Physical Science or Natural Science) اور علم ہنر یعنی ٹکنالوجی (Technology) کا ایجاد اور اس سے استفادہ کی مجبوری۔ چنانچہ بالآخر حضرات آدم وحوا کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوا۔ وہ تائب ہوئے اور ان

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

کی خطا معاف کردی گئی مگر اس طبیعی بگاڑ نے جو بہر حال اس فساد انگیزی سے پیدا ہو گیا تھا لازم کردیا کہ آدم وحوا اس روئے ارض پر منتقل ہو جائیں جو اس طبیعیات' (Physics) کے قریب تر تھی۔

(۲) **ابلیسی طریقۂ فساد:** ابلیس کا الجنہ اور الارض دونوں پر فساد انگیزی کا طریقہ اور عمل یکساں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس منہج کو سمجھنے سے قبل چند امور کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(الف) **موقفی منہج (Positional Approach):** ابلیس کا پہلا منہج موقفی ہے اور وہ یہ ہے کہ ابلیس آدم کو تین طرح کی حرکات کرنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ حرکات درج ذیل ہیں:

(۱) **پہلی حرکت: عمودی حرکت:** ابلیس آدم وحوا کو باور کراتا ہے کہ انہیں عمودی حرکت کرنی چاہئے۔ یہ حرکت ان کے لئے نافع ہے اور اس میں فلاں فلاں فوائد ہیں۔ یہ عمودی حرکت دراصل آدم وحوا کو انفاقی تعلیم وتعلم اور انفاقی عمل سے ہٹا کر اکتشافی تعلیم وتعلم اور اکتشافی عمل کی طرف منتقل کر دینے کے لئے ہوتی ہے۔

(۲) **دوسری حرکت: افقی توسیع:** جب آدم وحوا ابلیس کی بات مان کر اور انفاقی تعلیم وتعلم اور انفاقی عمل کی سطح کو چھوڑ کر اکتشافی تعلیم وتعلم اور اکتشافی عمل کی سطح پر آنے کے لئے عمودی چھلانگ لگا دیتے ہیں تو وہ پھر انہیں باور کراتا ہے کہ اب انہیں وہیں ٹھیرنا نہیں چاہئے بلکہ افقی توسیعات کی طرف جانا چاہئے۔ ابلیس کے نزدیک افقی توسیعات کے چار مدارج ہیں چنانچہ وہ چاہتا ہے کہ آدم وحوا ان چاروں افقی مدارج کو طے کرلیں۔

(۳) **تیسری حرکت: عمودی متواتر حرکت:** ابلیس کی کوشش ہوتی ہے کہ ایک عمودی حرکت کے بعد اور اس میں افقی چاروں مدارج طے کر لینے کے بعد آدم وحوا اگلی عمودی حرکت کریں اور اسی طرح اس کا تواتر برقرار رہے۔

(ب) **علمی منہج (Intellectual Approach):** ابلیس کا دوسرا منہج علمی منہج ہے اور وہ یہ ہے کہ ابلیس آدم وحوا کو علمی استفادہ کے پہلے درجے یعنی انفاقی درجے پر برقرار رہنے نہیں دیتا۔ یوں تو انسان کی اپنی انفاقی سطح ہے اور اس سطح پر پہلا درجہ انفاقی استفادہ کا درجہ ہے۔ اسی طرح انسانوں کے علاوہ دوسروں کے انفاقی سطحوں پر بھی ان کے لئے پہلا درجہ انفاقی استفادہ کا درجہ ہوتا ہے۔

Prepared by M. Aamir Mahmood
www.asrarulam.net

ابلیس اولاً تو انسان کو اس کی انفاقی سطح پر رہنے نہیں دیتا اور اکتشافی باب کھول کر عمودی حرکت پر مجبور کرتا ہے پھر اس سطح کی انفاقی استفادہ کے درجے پر بھی رہنے نہیں دیتا بلکہ ایک افقی توسیع شروع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس کے چار درجات ہوتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) درجۂ اول: درجۂ انفاقی استفادہ: اس درجے میں اس سطح پر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ترزیق کی ایک صورت ہے ٹھیک اللہ کی رضا کے مطابق اس سے استفادہ کرنا یہی اس کا انفاقی درجہ ہے۔

(۲) درجۂ دوم: درجۂ معلومات خواص: انفاقی استفادہ پر بس نہ کرتے ہوئے اور درجۂ انفاقی استفادہ سے آگے جا کر یہ جاننا کہ اس استفادہ کے پیچھے یعنی اس شے میں جس سے استفادہ کیا گیا ہے کیا خواص ہیں۔

(۳) درجۂ سوم: درجۂ معلومات و تجربہ، خلق جدید یا درجۂ 'سحر': درجۂ خواص سے آگے جا کر اس بات کی کوشش کرنا کہ استفادہ کی جانے والی چیزوں کو مصنوعی طور پر خود بنائے جانے کا علم حاصل کیا جائے یعنی انہیں از سرِ نو خلق کیا جائے۔ یہی درجۂ 'سحر' ہے یعنی اس درجہ پر آ کر انسان انہیں 'مسخر' کرنے کا علم حاصل کرتا ہے۔

(۴) درجۂ چہارم: درجۂ تبدیلیٔ سنت: درجۂ معلومات و تجربہ، خلق جدید یعنی درجۂ 'سحر' کے بعد کا درجہ ہے۔ یہ درجہ ہے انسان کے ذریعہ کسی چیز میں ربانی سنت یعنی 'سنت اللہ' کے بالمقابل اور متوازی اس سے الگ اپنی مصنوعی اور من چاہی ہوئی سنت کا اجراء کرنا۔ چنانچہ کسی سطح پر یہ آخری درجہ ہے۔ جب کسی سطح پر کوئی اس آخری درجے پر پہنچ جاتا ہے تو اس کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ تمام کام جو 'اللہ رب العالمین' کرتا ہے وہ بھی کر سکتا ہے۔ یہی وہ سطح ہے جہاں مخلوق اپنے خدا، رب اور رب العالمین ہونے کا دعویٰ کرنے لگتی ہے۔ ابلیس یہی چاہتا ہے کہ انسان 'رب العالمین' ہونے کا دعویٰ کرے۔ چنانچہ اپنے اپنے زمانے میں جن جن لوگوں نے اللہ کے مقابلے میں 'رب العالمین' ہونے کا دعویٰ کیا وہ سب لوگ ایسے ہی تھے جن کو ابلیس نے اس درجے تک پہنچانے کی کوشش تھی یا کم از کم انہیں باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس قوت کے مالک ہیں کہ جو کچھ رب العالمین کرتا ہے وہ بھی کر سکتے ہیں۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asraram.net

(ج) ہنری منہج (Technological Approach): ابلیس کا تیسرا منہج ہنری منہج ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ابلیس آدم وحوا کو علم ہنر (Technology) سے آگاہ کرتا ہے اور اس تعلق سے انہیں افقی درجات طے کرنے پر اکساتا یا مجبور کرتا ہے۔ علم ہنر بھی علم طبیعیات کی طرح الجنہ میں صفر کے برابر تھا یا بالکل نا قابل بیان حد تک ابتدائی مرحلے میں یا اندرونی یعنی Inbuilt تھا۔ گویا علم ہنر بھی علم طبیعیات کے مانند ایک فساد کی طرح الجنہ میں پیدا ہوا۔ چنانچہ اس زمین پر انسانی حیات کا آنا اور آدم وحوا کا بسایا جانا اپنے لوازم کے اعتبار سے الجنہ سے قدرے متوسع ہو گئے۔ اس کے درج ذیل دو اسباب خاص ہیں:

(ا) فساد کے مابقیہ کے سبب: اس روئے ارض پر علم ہنر (Technology) کے پیدا ہونے اور کسی درجے میں اس سے استفادہ کی اجازت دیئے جانے کی بنیادی وجہ یہ ہوئی کہ الجنہ میں ابلیس کے اکسانے اور آدم وحوا کے گناہ کرنے کے سبب جو فساد پیدا ہوا تھا اس نے آدم وحوا پر بعض مستقل اثرات عارض کر دیئے جو الجنہ سے منتقلی کی صورت میں یہاں زمین پر ان کے ساتھ آ گئے اس لئے کہ اب تک وہ آدم وحوا کے جزو لازم بن چکے تھے۔ الجنہ میں کوئی ہنر (Technology) نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ چونکہ الجنہ میں ہنر یا ٹکنالوجی کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی اس لئے وہاں ابتداء میں جوارح نہیں پائے جاتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ الجنہ میں آدم وحوا کے اس زمین میں واقع صورتحال سے مختلف نہ ہاتھ تھے نہ پاؤں، نہ ناک تھی نہ کان، نہ آنکھیں تھیں نہ منھ، نہ مردانہ شرمگاہیں تھیں نہ زنانہ۔ ان متصل جوارح کے نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہاں ان کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کھانے کی ضرورت ہو تو جا کر لانے کے لئے پاؤں، دیکھ کر کھانا اٹھانے کے لئے آنکھیں اور ہاتھ، چبانے کے لئے دانت اور زبان چاہئیں۔ اگر کسی چیز کی خواہش کرنا ہی اس سے استفادہ کے صورت میں تبدیل ہو جائے تو ان سب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ لیکن ابلیس نے آدم وحوا کو خطا کار بنایا اور انہوں نے پہلے موقفی اقدامات کئے پھر علمی اقدامات جس کے نتیجے میں الجنہ میں علم طبیعیات کا ظہور ہوا اور پھر جب انہوں نے عملی اقدامات کر لئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے جسم میں بیک وقت کئی جوارح پیدا ہو گئے جو الجنہ میں ہنر کا پہلا ظہور تھا۔ بالکل ابتداء میں پیدا ہونے والے جوارح آنکھ، ناک، منھ، اعضاء تناسل، مقام براز و اعضاء تنفس، اعضاء دوران خون، اعضاء ہضم، اعضاء حیض

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asiaalam.net

واحتلام، اور اعضاء تولید تھے۔ چنانچہ اس گناہ کے بعد الجنہ کی دنیا ہی بدل گئی۔ اب دیکھنے کی ضرورت پڑنے لگی اور نظر آنے والی چیز پر شرم آنے لگی، اب پیشاب کرنے، رفع حاجت کرنے، سانس لینے، کھانے پینے کی ضرورت پیش آنے لگی۔ اور یہ ظاہر ہوجانے والے جوارح مستقلاً بروئے کار آنے لگے۔ چنانچہ جب اس صورت میں الجنہ کا سارا نظام درہم برہم ہونے لگا تو آدم وحوا کو الجنہ سے منتقل ہوجانے کو کہا گیا۔ لہذا جب آدم وحوا اس روئے ارض پر منتقل ہوئے تو یہ جوارح جواب ان دونوں کے جزو بدن اور جزو لازم بن چکے تھے ان کے ساتھ یہاں آگئے۔ یہ زمین چونکہ الجنہ کی طرح لطیف نہیں تھی اس لئے رفتہ رفتہ دونوں یعنی روئے ارض اور آدم وحوا کے جوارح باہم ہم آہنگ (Accultured & Acclimatized) ہونے لگے۔ اس طرح اس روئے ارض پر انسانی زندگی الجنہ سے مختلف ہوگئی جس میں کسی حد تک جوارح کے استعمال کو 'جائز' ٹھہرادیا گیا اور اس طرح ایک حد تک بالکل ابتدائی درجے میں علم طبیعیات (Physical Science) اور علم ہنر (Technology) 'جائز' قرار پائے۔

(۲) زمین اور روئے ارض کی کثافت : یہ زمین اور یہ روئے ارض ابتداً آدم وحوا کے لئے نہیں بنائی گئی تھیں اس لئے جب اس کی ضرورت آن پڑی تو اللہ تعالیٰ نے اس ارض کو آدم وحوا کے لئے 'مسخر' فرمادیا۔ اور اب یہ زمین آدم وحوا کے لئے مسخر کردی گئی تھی۔ زمین الجنہ کے مقابلے میں طبعی لوازم سے زیادہ پر تھی اس لئے یہاں اس 'سنت' کے مطابق آدم وحوا کی زندگی نہیں گزر سکتی تھی جیسی الجنہ میں تھی۔ چنانچہ یہاں طبیعیات اور ہنر سے استفادہ کی ایک حد کو جائز ٹھہرا دیا گیا۔

اس روئے زمین پر ابلیس کے ہنری منہج (Technological Approach) میں سابق مناہج کی طرح ہی چار درجات ہیں۔ اور ابلیس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ بنی آدم کو اس افقی سطح پر انفاقی درجے یعنی اول درجے پر برقرار نہ رہنے دے اور اسے مہمیز کرے تاکہ وہ دوسرے، تیسرے، یہاں تک کہ چوتھے درجے پر پہنچ جائے۔ یہ چوتھا درجہ ہی وہ درجہ ہے جہاں ہنری طور پر پہنچ کر انسان سمجھنے لگتا ہے کہ وہ رب العالمین ہوگیا ہے چنانچہ وہ عملاً اس کا اظہار کرنا شروع کردیتا ہے اور یہی ابلیس کا مقصد اور منشاء ہے۔ علم ہنر (Technology) کے یہ چاروں مدارج درج ذیل ہیں:

(۱) درجۂ اول: درجۂ اتفاقی استفادہ: درجۂ جارحہ: درجۂ جارحہ روئے ارض پر ہنر کا اتفاقی درجہ ہے۔ یہی پہلا درجہ ہے۔ اس سے آگے تجاوز کرنا انسان کے لئے مضرت رساں بلکہ مہلک اور اس کے مقصد سے دور لے جانے والا ہے۔ لیکن ابلیس کی پوری پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ انسان کو اس درجۂ جارحہ پر بس نہ کرنے پر مجبور کرے اور اسے اکسائے اور مہمیز کرے کہ وہ اگلے درجات کو بھی طے کرے۔ درجۂ جارحہ وہ درجہ ہے جسے علم ہنر (Technology) میں پہلا درجہ کہا جاتا ہے اس درجہ میں انسان زیست اور مقاصد حیات کی تکمیل کے لئے صرف جارحہ یعنی Tool سے کام لیتا ہے اس لئے اس مرحلہ کو مرحلۂ یا درجۂ جارحہ (The Stage of Tool) کہا جاسکتا ہے۔

(۲) درجۂ دوم: درجۂ آلہ: روئے زمین چونکہ کثیف ہے اور طبیعیات یہاں کے لوازم لہٰذا اللہ تعالیٰ نے درجۂ جارحہ ____ جو اگرچہ بنی آدم کے لئے روئے ارض پر ہنر کا اتفاقی درجہ ہے اور وہی انفع اور احسن ہے ____ سے آگے جا کر بھی استفادہ کرنے کو جائز قرار دیا۔ دوسرا درجہ یعنی درجۂ آلہ اگرچہ ’جائز‘ قرار پایا اور اس درجے پر رہنا اور اس سے استفادہ کرنا اگرچہ معصیت قرار نہیں پایا لیکن ان سب کے باوجود یہ درجہ بنی نوع آدم کے لئے مناسب درجہ نہیں تھا۔ چنانچہ احسن اور مقصد برآری میں زیادہ نافع وہی درجہ باقی رہا جو درجۂ اول یعنی درجۂ جارحہ تھا۔ علم ہنر (Technology) میں اس دوسرے درجہ یعنی درجۂ آلہ کو (The Stage of Instrument) کہتے ہیں۔ اس درجہ میں انسان جارحہ سے آگے جا کر آلہ ایجاد کرتا ہے۔ اور شیطان مزید سے مزید آلات ایجاد کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ چونکہ اس تعلق سے ابلیس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ انسان کو درجۂ جارحہ پر باقی نہ رہنے دے اور اسے مہمیز کر کے درجۂ آلہ پر لے آئے بلکہ اس میں بھی آخری حد تک لے جائے۔

(۳) درجۂ سوم: درجۂ کل: علم ہنر (Technology) کا یہ تیسرا درجہ ہے۔ اگرچہ عنداللہ معیار مطلوب اور اتفاقی درجۂ ہنر پہلا ہی درجہ ہے اور دوسرا درجہ صرف ’جائز‘ قرار دیا گیا ہے لیکن ابلیس کی کوشش یہی رہتی ہے کہ وہ انسان کو اس ’جائز‘ کے درجہ پر بھی بس کرنے کی اجازت نہ دے۔ چنانچہ وہ انسان کو گمراہ کرتا ہے اور آگے بڑھا کر تیسرے درجہ میں داخل کرتا ہے۔ یہ درجہ درجۂ کل یعنی (The Stage of Machine) ہے۔ اس درجہ میں انسان

prepared by M. Aamir Mehmood
www.urdunovies.net
www.asiaralam.net

جارحہ اور آلہ جات سے آگے جا کر باضابطہ کل یعنی مشین ایجاد کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کرتا ہے۔ ابلیس اسے مزید سے مزید کل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مشین ایجاد کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

(۴) درجۂ چہارم: درجۂ مکلفۃ: علم ہنر (Technology) کا یہ چوتھا درجہ ہے۔ یہ ابلیس کے نزدیک معیار مطلوب کا درجہ ہے اس درجہ پر آکر انسان علم ہنر (Technology) کے ذریعہ 'سنت اللہ' کو بدلنے اور اس کی جگہ دوسری سنت رائج کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کوشش میں اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ رب العالمین ہوگیا ہے۔ چنانچہ وہ اس کا دعویٰ بھی کر دیتا ہے کہ وہ رب العالمین ہے۔ اس درجہ کو درجۂ مکلفۃ (The Stage of Automaton) کہتے ہیں۔ چنانچہ اس درجہ میں انسان پیچیدہ مشین سے آگے جا کر ایسی مشین ایجاد کرتا ہے جس کے اندر ایک مکمل 'پروگرام' (Program) ہو یعنی اسے خود کار (Automation) والا بناتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کی کوشش کرتا ہے۔ کسی 'مخلوق' میں یہ درجہ درجۂ تکلیف ہے یعنی وہ مخلوق مکلّف بنائی گئی ہے۔ لہذا پروگرامنگ (Programming) تکلیف یعنی مکلّف بناتا ہے۔ یہی انسان کا درجہ ہے۔ انسان کو اللہ نے مکلّف بنایا ہے۔ انسان ایک مکلفہ یعنی (Automaton) ہے۔ جب انسان خود مکلفہ بنانے لگے تو وہ خود کو رب العالمین سمجھنے لگتا ہے۔ ابلیس انسان کو اسی درجہ تک لانا چاہتا ہے تاکہ وہ یہاں آکر خدا سے کلیتاً بغاوت اور اس کی ہمسری کرے۔ یہی نمرود اور فرعون نے کیا تھا۔ آج کا مغربی عہد ابلیس کے ذریعہ اسی جگہ لا دیا گیا ہے۔

۳۔ روئے ارض میں اتفاقی صورتحال:

(الف) سحر علم: اللہ تعالیٰ 'العلیم' ہے۔ سارا علم اور اس کی ساری وسعت کا وہ سرچشمہ ہے۔ علم اس کی صفت ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تکوین اور مخلوقات کی تخلیق فرمائی تو اسے ایسی 'ہدایت' سے نوازا جو اس کے لئے کافی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

سبح اسم ربک الاعلیٰ الذی خلق فسوی و الذی قدر فھدی (الاعلیٰ ۳۔۱)

ترجمہ: پاکی بیان کر اپنے رب کے نام سے جو الاعلیٰ ہے جس نے بنایا پھر درست کیا اور جس نے ٹھیرا دیا اور پھر ہدایت کی۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asraram.net

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم قدیم کی تخلیق فرمائی تو آپ کو 'علم' عطا فرمایا۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وعلم آدم الاسماء کلھا (البقرہ ۳۱)

ترجمہ: اور سکھایا آدم کو نام سارے

پھر جب روئے ارض پر انسان بسایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے یہاں کے مطابق 'علم' عطا فرمایا۔ یہ علم روئے ارض پر منصوبہ ربانی کی تکمیل میں انسان کو کفایت کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

علم الانسان مالم یعلم (العلق ۵)

ترجمہ: سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔

یہ 'مالم یعلم' ہی روئے ارض پر مسخر 'علم' ہے جو اللہ رب العزت کی طرف سے انعام فرمایا گیا۔ اس 'علم' میں تین علوم شامل ہیں جو کئی طرح سے انسانوں کے مابین منتقل ہوتے رہے ہیں۔ انتقال علم کے یہ ذرائع درج ذیل ہیں:

(۱) جینیاتی طور پر Genetically
(۲) معاشرتی طور پر Socially
(۳) انفرادی طور پر Individually

انفرادی طور پر انتقال علم کا واحد ذریعہ سیکھنا (Learning) ہے۔ یہ سیکھنا کئی ذرائع سے ہو سکتا ہے۔

مذکورہ تین طرح کے علوم جو رب العالمین کی طرف سے ودیعت کیے گئے درج ذیل ہیں:

(۱) علم محسوسات (Knowledge Through Senses)۔ ان میں وہ سارے علوم شامل ہیں جن کے حصول کا ذریعہ جوارح محسوسات ہیں۔

یعنی (۱) باصرہ (۲) ذائقہ (۳) لامسہ (۴) شامہ (۵) سامعہ

(۲) علم مدرکہ (Knowledge Through Mind): اس میں وہ سارے علوم شامل ہیں جن کے حصول کا ذریعہ قوت مدرکہ یعنی عقل ہے۔ علم مدرکہ وہ علم ہے جسے جوارح محسوسات گرفت نہیں کر سکتے۔

(۳) علم غیب (Knowledge Through Revelation): وہ سارے علوم

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarialam.net

غیب ہیں جن کا محسوسات اور مدرکہ احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے (۱) براہ راست (۲) ملائکہ کے ذریعہ (۳) اور انبیاء کے ذریعہ انسان تک پہنچتے ہیں۔

یہ تینوں قسم کے علوم 'علم' کہلاتے ہیں اور ان سب کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے لیکن ان میں باہم فرق ہے۔ علم محسوسات اور علم مدرکہ ظنی علوم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ودیعت اور اخذ کے مابین طبائع اور صلاحیتوں کے فرق سے ان کا یقینی ہونا مشکوک ہو جاتا ہے اس لئے یہ ظنی قرار پاتے ہیں۔ جبکہ علم غیب جسے علم الوحی بھی کہتے ہیں یقینی علم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان تینوں علوم کے تعلق سے درجہ اول کو انفاقی درجہ قرار دیا ہے جو انسان کے لئے کافی ہے۔ بلاشبہ اس سطح پر رسوخ فی العلم کے لئے افقی توسیع کی پوری گنجائش موجود رہتی ہے۔ ہر چند کہ جس کی ضرورت عام حالات میں قطعاً پیش نہیں آتی۔

(ب) سحرِ ہنر: جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس روئے ارض کی مخصوص صورتحال کے پیش نظر انسان کے لئے سحرِ ہنر کی بھی اجازت دی ہے۔ ہنر سے استفادہ کے لئے معیار مطلوب یعنی انفاقی درجہ بہر حال درجہ اول یعنی درجہ جارحہ ہی ہے لیکن مخصوص صورتحال میں 'درجہ آلہ' کو بھی 'جائز' قرار دیا گیا ہے۔ جہاں تک درجہ سوم اور درجہ چہارم یعنی درجہ کل اور درجہ مکلفہ کی بات ہے تو وہ موبقات و مہلکات بلکہ کھلی کھلی ہلاکت ہیں۔

(ج) سحرِ عمل: اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے 'سحرِ عمل' فرمایا ہے یعنی عمل کرنا ممکن بنا دیا ہے۔ تاہم روئے ارض پر 'عمل' الجنہ کے مقابلے میں بہت وسیع ہو گیا ہے جو یقیناً سخت آزمائش ہے۔ سحرِ عمل کے انفاقی درجہ میں چار امور داخل ہیں۔

(۱) عبادت: عبادت فی الواقع 'اقامت ملک اللہ' ہے۔ یعنی اقامت صلوۃ سے لیکر اقامت جہاد تک۔

(۲) تناسل: 'ملک اللہ' کے لئے صالح اولاد دینا اور روئے ارض پر آدم کے بسائے جانے کی مدت پوری کرنے کے لئے نسل آدم کو جاری رکھنا تناسل ہے۔

(۳) استرزاق: استرزاق سے مراد روئے ارض پر رزق حاصل کرنا ہے۔ روئے ارض پر استرزاق کا معیار مطلوب توکلی توکل علی اللہ ہے۔ تاہم جائز درجات میں علی الترتیب (۱) تجارت (۲) زراعت (۳) اور صناعت ہیں۔

(۴) تعمیر: تعمیر سے اصلاً مراد تو بسنا اور بسانا ہے لیکن روئے ارض پر تعمیر سے مراد وہ سارے کام ہیں جو اجتماعیت کے لئے ضروری ہیں۔ ان کاموں میں (۱) ذاتی ضروریات کے کام مثلاً اپنے کپڑے دھولینا (۲) تاھلی ضروریات کے کام مثلاً بیوی بچوں کی ضروریات پوری کردینا (۳) قرابتی ضروریات کے کام مثلاً رشتہ داروں، پڑوسیوں، ضعیفوں کے کام کردینا (۴) ملی ضروریات کے کام مثلاً حاجتمند مسلمین و مسلمات کی مدد کرنا (۵) اور انسانی ضروریات کے کام یعنی انسانی رشتوں کے حوالے سے لوگوں کی مدد کرنا۔

(د) سحر عمل کی اصولیات: روئے ارض پر حیات انسانی کے پانچ اصولیات ہیں اور ہر اصل کے تحت، نعمت، حقوق اور فرائض ہیں۔ یہ پانچ اصولیات درج ذیل ہیں:

(۱) مستقر: اللہ تعالیٰ نے اس روئے ارض کو بنی نوع آدم کے لئے مستقر قرار دیا لہذا اس نے اس روئے ارض کو انسانوں کے رہنے کے قابل (Sustainable) بنایا۔ اگر انسان انفاقی طور پر اس سے استفادہ کرے تو یہ مدت موعودہ تک قابل برداشت رہے گی۔

(۲) متاع: اللہ تعالیٰ نے انسانی حیات کے لئے زمین میں متاع رکھی ہے جو اس کے لئے اس مدت کے لئے کافی ہے جس دوران بنی نوع انسان کو اس پر رہنا ہے۔ اگر انسان انفاقی طور پر متاع حاصل کرے اور اس سے استفادہ کرے تو یہ متاع اس پوری مدت کے لئے کافی ہوگی۔

(۳) حیات: اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مدت تک یہاں بنی آدم کے لئے زندہ رہنا مقدر فرما رکھا ہے لہذا اس میں سنت تناسل کا اجراء فرما دیا گیا۔ یہ تناسل انفاقی سطح اور انفاقی درجہ میں ہر اعتبار سے روئے ارض کے لئے نعمت ہے۔ اور نہ یہ کبھی مسئلہ بن سکتا ہے نہ بوجھ۔ اس تناسل کے تحت انسانوں کا پیدا ہونا اور مرنا جاری رہتا ہے۔

(۴) رزق: مستقر، متاع اور حیات کی طرح رزق بھی اللہ کا ایک فضل ہے۔ ابتداء آفرینش سے آج تک کس فرد بشر نے روئے ارض پر اپنے مستقر، متاع اور حیات کے لئے جدوجہد، محنت اور کسب کیا ہے؟ لہذا رزق بھی اسی طرح بغیر جدوجہد، محنت اور کسب کے دی جانے والی چیز ہے۔ چونکہ انسان اس معیار مطلوب پر عموماً قائم نہیں اس لئے اسے کسب کی ضرورت آن پڑی ہے۔ یا اس نے کسب کو اپنی ضرورت بنالیا ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ما ارید منهم من رزق وما ارید

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asarnalam.net

ان يطعمون ان الله هو الرزاق ذو القوة المتين (الذاريات ۵۸-۵۶)

ترجمہ: اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سو اپنی بندگی کو میں نہیں چاہتا ان سے روزینہ اور نہیں چاہتا کہ مجھ کو کھلائیں۔ اللہ جو ہے وہی ہے روزی دینے والا زور آور مضبوط۔

کون اس کی گواہی نہیں دے سکتا کہ روزانہ اربوں بلکہ کھربوں نباتات، چرند، پرند، درند اور حشرات الارض، اور سمندر کی لاتعداد مچھلیوں کو اللہ رب العزت بغیر جدوجہد، بغیر محنت اور بغیر کسب کے کھلاتا اور پلاتا ہے اور سب سیر ہو کر کھاتے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ چند ارب انسانوں کو بغیر جدوجہد، بغیر محنت اور بغیر کسب کے کھلانے پر قادر نہیں؟ ایسا قطعاً نہیں بلکہ اصلی حقیقت یہ ہے کہ نباتات، چرند و پرند، درند و حشرات الارض اور مچھلیاں اپنی اپنی سطحوں پر جس معیار مطلوب پر ہیں انسان اس پر نہیں ہے۔ اس لئے روئے ارض پر بنی آدم کا اصل انفاقی درجہ تو یہی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ بغیر محنت جدوجہد اور کسب کے کھلائے۔

روئے ارض پر رزق کے حصول میں توسیع کے دو عنوانات ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) 'جائز توسیع': 'جائز توسیع' ایسی توسیع ہے جو مذکورہ وجوہات سے خود رب العلمین کی طرف سے جائز قرار دی گئی ہو۔

(۲) 'ناجائز توسیع': 'ناجائز توسیع' ایسی توسیع ہے جو دراصل ابلیس کے اتباع میں توسیع پذیر ہوئی چنانچہ ان میں سے بعض کو تشریعی طور پر گوارا کر لیا گیا اور بعض کو علیٰ حالہ ناجائز باقی رکھا گیا۔ یہ بات واضح رہے کہ 'توسیع' اصولِ دین اللہ میں اصلاً غیر محمود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض غیر محمود توسیع کی بھی جو اجازت ملی ہے وہ اس صورت میں ہے کہ انہیں محض 'مجازاً' قابل استفادہ قرار دیا گیا ہے۔ حصول رزق کے لئے حقیقی طور پر غیر محمود مگر جائز توسیعات درج ذیل ہیں:

(۱) تعلم: انفاقی سطح پر یہ ایک توسیع ہے چنانچہ 'جائز' ہے اور اسکی حد صرف مالا بدمنہ یعنی ناگزیر (Inevitable) ہے۔

(۲) تجربہ (ہنر سیکھنا)۔ انفاقی سطح پر یہ ایک توسیع ہے چنانچہ جائز ہے اور اسکی بھی حد مالا بدمنہ (Inevitable) ہے۔

(۳) علم ہنر (مددگار چیز بنانا اور اس سے استفادہ کرنا): یہ بھی ایک توسیع ہے جو انفاقی سطح سے پرے ہے۔ چنانچہ 'جائز' ہے اور اسکی انفاقی سطح درجۂ اول یعنی درجۂ جارحہ ہے۔ اس تعلق

www.bookstube.net www.urdutube.net prepared by M. Aamir Mehmood www.urdumovies.net www.asraralam.net

سے چار توسیعات بنیادی ہیں:

(۱) آگ بنانا (Making fire) اور اس کے استعمال کو توسیع دینا۔ برائے جسمانی استعمال و طباخت ابتدائی یعنی بدرجۂ اول

(۲) زمین کھودنا (Digging Earth) اور اس کے استعمال کو توسیع دینا۔ برائے کاشت ابتدائی یعنی بدرجۂ اول

(۳) پہیہ بنانا (Making Wheel) اور اس کے استعمال کو توسیع دینا۔ برائے حمل و نقل ابتدائی بدرجۂ اول

(۴) آلۂ حرب بنانا (Making Weapon) اور اس کے استعمال کو توسیع دینا۔ برائے حفاظت و دفاع ابتدائی یعنی بدرجۂ اول

(۵) عبادت: عبادت تخلیق آدم کا بنیادی سبب ہے۔ مستقر، متاع، حیات اور رزق کی فراہمی رب العالمین نے صرف اسی مقصد کی تکمیل کے لئے کی ہے۔ یہی بنی آدم کا بنیادی وظیفہ اور فرض منصبی ہے۔ الجنۃ میں جن دو بنیادی اجزاء پر مشتمل آدم و حوا کا ماڈل تھا اس کا دوسرا جزء عمل اسی عبادت سے عبارت تھا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ الجنۃ میں 'عمل' کی وسعت صفر کے برابر تھی اس لئے مثلاً عمل کا مقام اگر الجنۃ میں ایک تھا تو روئے ارض پر اس کا مقام ایک لاکھ ہے۔ اس کا یہ مفہوم قطعاً نہیں کہ عبادت میں توسیع عند اللہ محمود اور مطلوب ہے۔ بلکہ صرف اتنا ہے کہ چونکہ الجنۃ کی الطف فضا کے مقابلے میں روئے زمین کی فضا کثیف ہے لہذا جس طرح دیگر امور میں مثلاً مستقر، متاع، حیات اور رزق اور ان کے حصول و استفادہ میں کثافت کے سبب وسعت آگئی اور اس وسعت کو ایک حد تک 'جائز' قرار دیا گیا یہاں بھی ہر چند کہ اسی سبب سے لیکن ایک دوسری بات ہوئی اور وہ یہ ہے کہ الجنۃ میں ابتلاء یا تو برائے نام تھی یا سرے سے تھی ہی نہیں لیکن روئے ارض پر اس کے مقابلے میں ابتلاء کو شامل کر دیا گیا۔ اس لئے روئے ارض پر 'عبادت' الجنۃ میں مامور عبادت کے مقابلے میں ابتلاء سے پر ہو گئی ہے۔ اس طرح مستقر، متاع، حیات اور رزق میں دی گئی وسعت محض مجازاً وسعت ہے جبکہ عبادت میں توسیع مجازاً وسعت نہیں بلکہ ابتلاءً توسیع ہے۔

اس کے بالمقابل مستقر، متاع، حیات اور رزق میں عمودی اور افقی حرکت اور توسیع کی

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

طرح 'عبادت' میں بھی عمودی اور افقی حرکت اور توسیع ایک ابلیسی عمل ہے۔ بلکہ واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ روئے ارض پر ابلیس کی سب سے بڑی توسیع اور اس کے لئے عمودی اور افقی حرکت عبادت کے ذیل ہی میں ہوئی ہے۔ اور اس کا سبب ظاہر ہے اور وہ یہ کہ عبادت ہی دراصل وظیفۂ آدم ہے۔ یہی عبادت وجہ تخلیق ہے۔ اس کی خرابی اور اس میں مفسدہ پیدا کرنا پورے منصوبۂ ربانی میں بنیادی اور فیصلہ کن مفسدہ پیدا کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ابلیس نے مستقر، متاع، حیات اور رزق اور ان کے حصول واستفادہ میں جو فساد پیدا کیا ہے وہ سب مل کر بھی اس فساد کے برابر نہیں جو عبادت میں پیدا کیا گیا ہے۔

روئے ارض پر 'عبادت' میں توسیع کے تین بنیادی اجزاء ہیں۔ یہی توسیع 'جائز' ہے۔ یہ تین اجزاء درج ذیل ہیں:

(۱) علم: (الف) تعلیم: اس کے تین شعبے ہیں: (۱) تلاوت آیات
(۲) تزکیہ
(۳) تعلیم الکتاب والحکمۃ

(ب) تعلم: (۱) تلاوت آیات
(۲) تزکیہ
(۳) تعلیم الکتاب والحکمۃ

اس تعلم کے 'جائز' توسیعات ہیں:

(۱) تعقل (۲) تفکر (۳) تدبر (۴) تذکر (۵) تراء

ان توسیعات کی تشریح بے حد تفصیل طلب ہوگی اس لئے ان سے سردست صرف نظر کیا جاتا ہے۔ ان شاء اللہ موقعہ بموقعہ حسب ضرورت تشریح آتی جائے گی۔

(۲) عمل: (الف) تعمیل: (۱) اقامت ملک اللہ
(۲) اقامت صلوٰۃ
(۳) اقامت جہاد

(ب) تعمل: (۱) اقامت ملک اللہ
(۲) اقامت صلوٰۃ

(۳) اقامتِ جہاد

اصول دین میں 'عبادت' کے تحت تعلیم وتعلم اور تعمیل وتعمل کو تین چیزیں منضبط اور مضبوط کرتی ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تعلیم وتعلم اور تعمیل وتعمل کا یہ عمل نہ لامتناہی جاری رہے گا نہ اس میں غیر ضروری چیزیں شامل سمجھی جائیں گی نہ اس کی سطح میں تبدیلی ہوگی نہ اس کی غیر ضروری توسیع ہوگی۔ ایسی تمام باتیں، کوششیں، عمل اور رواج جو عبادت کو لامتناہی جاری رکھیں، یا اس میں غیر ضروری چیزیں شامل کردیں، یا اس کی سطح میں تبدیلی کردیں یا اس میں غیر ضروری توسیع کردیں دراصل 'عبادت' میں ایک 'ابلیسی عمل' اور ابلیسی تحریف (Satanic Manipulation) قرار دی جائیں گی۔ چنانچہ اصول دین تین امور پر مشتمل ہیں:

(۱) آیة محکمه

(۲) سنة قائمه

(۳) فریضة عادله

یہی تین امور روئے ارض پر تمام انسانی 'علم وعمل' کو منضبط (regulate) کرنے والے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عن عبداللہ بن عمر وقال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلثة آیة محکمة اوسنة قائمة اوفریضة عادلة وما کان سویٰ ذلک فھو فضل (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اصل تین ہیں: آیۂ محکمہ، سنۂ قائمہ اور فریضۂ عادلہ، اور جو کچھ ان کے علاوہ ہے وہ لایعنی ہے۔

اس طرح تعلیم وتعلم اور تعمیل وتعمل ہر دو امور میں انفاقی سطح اور انفاقی درجہ یعنی ابتدائی درجہ کے علاوہ جتنی توسیعات ہیں وہ اصلاً نامحمود، ممنوع بلکہ اکثر حرام ہیں۔

اس صورت حال میں تعلیم وتعلم اور تعمیل وتعمل کی سطح پر درج ذیل چیزیں عنداللہ اور عندالرسول اصلاً نامحمود، ممنوع بلکہ اکثر حرام ہیں:

(۱) عصری سائنسی اور ٹکنالوجیکل تعلیم (Contemporary Scientific & Technological Knowledge) کا نوے فیصد حصہ جو پڑھایا اور سیکھا جاتا

ہے: عصری تعلیم گاہوں میں بالخصوص مغرب میں اور ان کے تتبع میں بلاد مشرق اور مسلم معاشرے میں سائنسی اور تکنیکی علم کے نام پر جو کچھ پڑھایا اور سیکھا جاتا ہے اس کا نوے سے پچانوے فیصد حصہ اسی نامحمود، ممنوع بلکہ اکثر حرام توسیعات کا حصہ ہے۔ روئے ارض پر یہ ایک بہت بڑا فساد اور مقصد خلق آدم کو برباد کرنے والا علم و عمل ہے۔

(۲) عصری مذہبی تعلیم (Contemporary Religious Knowledge) کا نوے فیصد حصہ جو پڑھایا اور سیکھا جاتا ہے۔

روایتی تعلیم گاہوں یعنی اسلامی مدارس، دارالعلوم اور جامعات میں بالخصوص عالم اسلام میں دینی اور مذہبی علم کے نام پر جو کچھ پڑھایا اور سیکھا جاتا ہے اس کا نوے سے پچانوے فیصد حصہ اسی اصلاً نامحمود، ممنوع بلکہ اکثر حرام توسیعات کا حصہ ہے۔ یہ سب کچھ دینی علم کے نام پر پڑھایا اور پڑھا جاتا ہے جب کہ اس کا نوے فیصد سے زاید حصہ اس علم پر مبنی ہے جو دینی ہے ہی نہیں بلکہ 'دین مخالف' ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حصہ دین کے نام پر دراصل اس مذہبی علم کا حصہ ہے جو دین اللہ میں تحریف اور توسیع کی فسادانگیزی کے ذریعہ رائج کیا گیا ہے۔ چنانچہ امت مسلمہ کی موجودہ صورتحال یہ ہے کہ ان کے یہاں دینی علم یعنی آیت محکمہ، سنت قائمہ اور فریضۂ عادلہ کا پچانوے فیصد حصہ پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ اور جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کا پچانوے فیصد حصہ آیت محکمہ، سنۃ قائمہ اور فریضۂ عادلہ کی نفی کرنے والا بلکہ عملاً ان کو منہدم کرنے والا ہے۔ ظاہر ہے جس معاشرے میں دین اللہ کے نام پر یہی پڑھایا اور پڑھا جائے گا جو اس وقت پڑھایا اور پڑھا جاتا ہے تو اس معاشرے میں دین اللہ اس کا متقاضی رہے گا کہ اللہ محض اپنے فضل خاص سے ہر صدی کے سرے پر ایک ایسا بطل جلیل پیدا کرے جو اس دوران مردہ بنادیئے جانے والے دین کو پھر تازہ کردے۔ حدیث کے الفاظ 'من یجدد لها دینها' تو بہر حال ابتدائی احوال ہیں وگرنہ اس دین کی مسلم معاشرہ میں وہ حالت بنادی جائے گی جسے حدیث 'سیعود کما بداء' کہتی ہے۔ اجنبیوں کی طرح وہی چیز عود کرتی ہے جو معاشرہ میں اجنبی اور معدوم ہو چکی ہوتی ہے۔

(۳) عصری روحانی تعلیم و تعلم اور تعمیل و تعمل یعنی (Contemporary Spiritual Knowledge & observance): عالم اسلام میں عصری روایتی روحانی تعلیم و تعلم اور تعمیل و تعمل کے تحت جو کچھ قائم ہے اس کا پچانوے فیصد حصہ اسی اصلاً نامحمود، ممنوع بلکہ اکثر حرام

توسیعات کا حصہ ہے۔ مسلم معاشرے میں یہ سارے روحانی امور دین اللہ کے نام پر جاری ہیں۔ انہیں سیکھا اور سکھایا جاتا ہے، ان کا استعمال کیا جاتا ہے اور ان کے حاملین کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور دینی اعتبار سے بلند مقام دیا جاتا ہے عہد صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد انہیں ہی 'اولیاء اللہ' سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے اور انہیں قرآن وسنت رسول اللہ کے لئے اجنبی اور نامانوس مناصب ومدارج پر سرفراز فرمایا جاتا ہے۔۔ جب کہ ان امور کا پچانوے فیصد حصہ 'دینی علم' سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا اور نہ عنداللہ وعندالرسول ان کا کوئی مقام ہے۔ ان امور کا پچانوے فیصد دراصل نامحمود، ممنوع اور اکثر حرام ہے اور ان توسیعات پر مشتمل ہے جو آیۃ محکمہ، سنۃ قائمہ اور فریضۂ عادلہ کے خلاف ہی نہیں بلکہ انہیں اور پورے دین اللہ کو ڈھا دینے والی ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ ساری توسیعات خواہ وہ (۱) عصری سائنس وٹکنالوجی کی تعلیم وتعلم اور تعمیل وتعمل کی توسیعات ہوں یا (۲) عصری مذہبی علوم کی تعلیم وتعلم اور تعمیل وتعمل کی یا (۳) عصری روایتی روحانی علوم کی تعلیم وتعلم اور تعمیل اور تعمل کی۔ سب کا مبلغ اور منبع اور محرک ابلیس ہے۔ ان کا اللہ تعالیٰ کی سنت اس کے ہدیٰ، اللہ، اس کے انبیاء ورسل اور ان کی سنت سے کوئی تعلق نہیں۔

دین اللہ روئے ارض پر:

(۱) صالح علم کو فروغ دیتا ہے اس لئے وہ انفاقی علم کو فروغ دیتا ہے،

(۲) صالح ہنر کو فروغ دیتا ہے اس لئے وہ انفاقی ہنر کو فروغ دیتا ہے،

(۳) صالح عمل کو فروغ دیتا ہے اس لئے وہ انفاقی عمل کو فروغ دیتا ہے تاکہ

(۴) صالح نتیجہ برآمد ہو۔ صالح نتیجہ ہی بنی نوع آدم کی کامیابی کی ضمانت اور منصوبۂ ربانی کی تکمیل کا زینہ ہے۔

اس لئے 'دین اللہ' میں:

(۱) مثالی علم (سائنس) وہ ہے جو درج ذیل باتیں متعین طور پر بتاتا ہے:

(۱) حقیقت کا علم

(۲) مقصد کا علم

(۳) تعمیل کا علم اور

prepared by M. Aamir Mehmood
www.urdunovels.net
www.aqsaalam.net

(۴) کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے یعنی حلال وحرام کا علم

(۲) مثالی ہنر (ٹکنالوجی) وہ ہے جو درج ذیل امور میں احسن طور پر (optimally) معاون ہو:

(۱) حقیقت تک پہنچنے میں
(۲) مقصد کے حصول میں
(۳) تعمیل کے پورا کرنے میں اور
(۴) کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے یعنی حلال وحرام کی رعایت کرنے میں

(۳) مثالی عمل (observance) وہ ہے جو درج ذیل امور میں احسن طور پر (optimally) منتج ہو:

(۱) حقیقت تک پہنچنے پر
(۲) مقصد کے حصول پر
(۳) تعمیل کے پورا کرنے پر
(۴) کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے یعنی حلال وحرام کی رعایت کرنے پر

(۴) سنت اللہ اور سنت الانبیاء:

(الف) سنت اللہ: روئے ارض پر 'سنت اللہ' کیا ہے؟ یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ جس کو سمجھے بغیر 'دین اللہ' کا فہم ممکن ہی نہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ:

روئے ارض پر 'سنت اللہ' 'عادۃ اللہ' ہے ___ جس میں سنت اللہ اول ودوم دونوں شامل ہیں اور 'سحر' یعنی انسانوں کے مطابق اسے بنایا جانا اور اس سے استفادہ کے لئے انسان کو بااختیار کرنا پر قائم نظام ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ روئے ارض پر سنت اللہ کے دو وجوہ ہیں جن میں پہلی وجہ 'عادۃ اللہ' ہے اور دوسری وجہ 'تسخیر للانسان' ہے۔ 'تسخیر للانسان' محض ایک عمل نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے یونہی کر دیا ہو بلکہ اس میں ایک 'مقصدیت' ہے جو منصوبۂ ربانی کی تکمیل کا اظہار ہے۔ اس طرح روئے ارض پر سنت اللہ عادۃ اللہ، تسخیر للانسان اور منصوبۂ ربانی کے مجموعی نظام کو کہتے ہیں۔

(ب) سنت الانبیاء:

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asiaradar.net

اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت یعنی 'سنت اللہ' کی تعلیم کے لئے وحی کا نزول فرمایا اور اسکے ذریعہ اس نے 'ہدیٰ' کا نظم فرمایا۔ یہی وہ فضل خاص ہے جس کا حضرات آدم وحوا سے اس وقت وعدہ فرمایا گیا تھا جب روئے ارض پر انہیں بسایا جا رہا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

فاما یاتینکم منی ھدی (البقرہ ۳۸)

ترجمہ: پس جب تمہارے پاس آئے میری طرف سے ہدیٰ

یہ 'ہدیٰ' دراصل وہ چیز ہے جو وقت نزول روئے ارض پر 'سنت اللہ' کی پوری تفصیل اور اس کی اس عہد خاص میں پوری تطبیق سے باخبر کرتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ بنیادی ہدیٰ کے ایک ہوتے ہوئے بھی اس میں اس عہد کی تطبیق شامل ہوتی تھی جس کی وجہ سے ایک عہد کی کتاب دوسرے عہد میں اپنی اصل میں ایک ہوتے ہوئے بھی نا قابل عمل ہو جاتی تھی۔ اس عصر کی حقیقی زمینی صورتحال اور تطبیق کا اضافی حصہ ایک اور چیز کی ضرورت کو لازم کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس ضرورت کی تکمیل فرمادی۔ اور وہ ضرورت تھی سنت کی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو مبعوث فرمایا جو سنت لے کر تشریف لائے۔

سنت الرسول کیا ہے؟

سنت الرسول یا سنت رسول 'سنت اللہ' کی تطبیق کی تعمیل ہے۔ لیکن اس سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی تفصیل کیا ہے؟ چنانچہ ان سوالات کے جواب کو اس طرح ملخص کیا جا سکتا ہے:

(۱) سنت رسول.... 'سنت اللہ' یعنی 'عادۃ اللہ'، 'تسخیر للانسان' اور 'مقصد و منصوبہ ربانی' کے عین مطابق اور ان کی ہر جگہ رعایت کرتی ہوئی کسی عہد میں اور اس عہد کیلئے وہ تعمیلی نتیجہ ہے جس کے لئے رسول کی بعثت ہوتی ہے۔

(۲) سنت رسول..... مثالی علم پر قائم اور اس کی پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم و تعمیل ہے یعنی سنت رسول انفاقی علم، اس کی انفاقی سطح اور اس کے انفاقی درجہ پر قائم اور ان سب کی پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم و تعمیل ہے۔

(۳) سنت رسول.... مثالی ہنر پر قائم اور اس کی پوری پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم و تعمیل ہے یعنی سنت رسول انفاقی علم، اس کی انفاقی سطح اور اس کے انفاقی درجہ پر قائم اور ان سب کی پوری پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم و تعمیل ہے۔

(۴) سنت رسول.... مثالی عمل پر قائم اور اس کی پوری پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم وتعمیل ہے۔ یعنی سنت رسول اتفاقی علم، اس کی اتفاقی سطح اور اس کے اتفاقی درجہ پر قائم اور ان سب کی پوری پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم وتعمیل ہے۔

(۵) سنت رسول..... دین اللہ کے بنیادی اصول پر قائم بنی نوع آدم کی انفرادی، اجتماعی اور نوعی حیات کی مقصدیت کی پوری پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم وتعمیل ہے۔ یعنی اس میں:

(الف) مستقر کی سطح پر یعنی روئے ارض پر بسنے کے تعلق سے انفرادی، اجتماعی اور نوعی طور پر اصول دین کی پوری پوری رعایت اور اسکی تعلیم وتعمیل ملتی ہے۔

(ب) متاع کی سطح پر یعنی روئے ارض پر جینے اور مقصد حیات پورا کرنے کے لئے اس سے استفادہ کے تعلق سے انفرادی، اجتماعی اور نوعی طور پر اصول دین کی پوری پوری رعایت اور اسکی تعلیم وتعمیل ملتی ہے۔

(ج) حیات کی سطح پر یعنی روئے ارض پر پیدا ہونے، زندہ رہنے، روئے ارض پر حیات کو باقی رکھنے اور مقصد حیات کو پورا کرتے ہوئے مرجانے کے تعلق سے انفرادی، اجتماعی اور نوعی طور پر اصول دین کی پوری پوری رعایت اور اس کی تعلیم وتعمیل ملتی ہے۔

(د) رزق کی سطح پر یعنی روئے ارض پر زندہ رہنے اور مقصد حیات کو پورا کرنے کے تعلق سے انفرادی، اجتماعی اور نوعی طور پر اصول دین کی پوری پوری رعایت اور اس کی تعلیم وتعمیل ملتی ہے۔

(ہ) عبادت کی سطح پر یعنی روئے ارض پر اس بنیادی فریضے کی تکمیل کے لئے جس کے لئے مستقر، متاع، حیات، اور رزق کا نظم کیا گیا... انفرادی، اجتماعی اور نوعی طور پر اصول دین کی پوری پوری رعایت اور اس کی تعلیم وتعمیل ملتی ہے۔

(٦) سنت رسول...... مقصد تخلیق آدم یعنی 'عبادت' کی 'ذیلی' اور 'کلی' اور اجمالی اور تفصیلی ہر توازن کو برقرار رکھتی ہوئی اور ان کی پوری رعایت کرتی ہوئی تعلیم وتعمیل کرتی ہے۔

(ج) سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد وہ 'سنت نبوی' ہے جسے نبی آخرالزماں، خاتم النبیین، ختم الرسل، عاقب، حاشر، شفیع، شہید اور محمود نے عرصۂ ختم زماں میں روئے ارض پر قائم فرمایا۔ یہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم 'سنت اللہ' کے عین مطابق اور سنت

الانبیاء کی جامع اور سب کی خاتم ہے۔

(د) **سنت خلفاء راشدین مہدیین:** سنت خلفاء راشدین مہدیین سے مراد صرف چار خلفاء راشدین کی سنت نہیں بلکہ سنت صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور سنت عدول من کل خلف بھی ہیں۔ جس طرح سنت الانبیاء اور بالخصوص سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم 'سنت اللہ' پر پوری طرح قائم اور اس کی پوری پوری رعایت کرتی ہے اسی طرح سنت خلفاء راشدین مہدیین سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری طرح قائم اور اس کی پوری پوری رعایت کرتی ہے۔ سنت خلفاء راشدین مہدیین بنیادی طور پر سنت صحابہ ہے۔ اور اسی سے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما انا علیه و اصحابی

(جس پر میں اور میرے ساتھی ہیں)

اور یہی وہ سنت ہے جس کے تعلق سے اس بات کی گواہی دی گئی:

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم

ترجمہ: میرے ساتھی ستاروں کے مانند ہیں۔ ان میں جس کی بھی تم اقتداء کرو گے ہدایت یاب ہو گے۔

(ہ) **سنت مومنین:**

جس طرح سنت الانبیاء اور بالخصوص سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم 'سنت اللہ' پر پوری طرح قائم اور اس کی پوری پوری رعایت کرتی ہے اور 'سنت صحابہ' 'سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم' پر پوری طرح قائم اور اس کی پوری پوری رعایت کرتی ہے اسی طرح مومنین پر لازم ہے کہ وہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر پوری طرح قائم ہوں اور ان کی پوری پوری رعایت کریں۔ ان پر پوری طرح قائم ہونا اور ان کی پوری رعایت کرنا ہی تمسک بالکتاب والسنہ ہے جسے اعتصام بالکتاب والسنہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہی وہ امر ہے جس پر مداومت کا حکم دیا گیا ہے اور یہی وہ بات ہے جس پر 'فساد' کے وقت عمل کرنا مشکل تر ہو جاتا ہے اور اس وقت مخلصین بھی محسوس کرنے لگتے ہیں کہ گویا ان امور دین پر عمل کرنا تقریباً محال ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asraraam.net

۷۱

من تمسک بسنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شهید

ترجمہ: امت میں عام فساد کے وقت جو میری سنت کو مضبوطی سے پکڑ لے گا اسے سو شہیدوں کا اجر ملے گا۔

سحر اور تسحیر

’عربیٔ مبین‘ میں ’سحر‘ کے درج ذیل معانی ہیں:

(۱) مخلوق کا از خود بڑا بننا

(۲) مخلوق کا از خود حکمراں بننا، کسی چیز کو قابو میں کرنا، کسی کو اپنے تابع کرنا، کسی کو مغلوب کرنا، کسی کو مرعوب کرنا

(۳) مخلوق کا از خود باندھنا، مضبوط کرنا،

(۴) مخلوق کا از خود منضبط کرنا

(۵) مخلوق کا از خود کسی فرد یا شئے کو ضبط یا قرق کرنا

(۶) مخلوق کا از خود کسی کو کسی مخصوص کام میں لگانا

(۷) مخلوق کا از خود کسی کو کسی مخصوص کام کے لائق بنانا

(۸) مخلوق کا از خود کسی کو کسی مخصوص کام کا حکم دینا

(۹) مخلوق کا از خود کسی سے کوئی مخصوص کام لینا

(۱۰) مخلوق کا از خود کسی چیز کی تلاش کرنا

(۱۱) مخلوق کا از خود کسی چیز کی تفتیش کرنا

(۱۲) مخلوق کا از خود کسی چیز کو چاہنا

(۱۳) مخلوق کا از خود کسی چیز کا مطالبہ کرنا

(۱۴) مخلوق کا از خود کسی انجان زمین، علاقہ، علوم میں گھومنا، پھرنا، مشاہدہ کرنا، تجربہ کرنا۔

(۱) قرآنی استعمالات: ’سحر‘ اور ’سحر‘ حقیقت اور نتیجے کے اعتبار سے یکساں اور مبلغ اور صورت حصول کے اعتبار سے بالکل مخالف ہیں۔ ’سحر‘ اور ’سحر‘ دونوں کا تعلق ’سنت اللہ‘ سے ہے لیکن ’سحر‘ ’سنت اللہ‘ کا اجراء اور استعمال اور ’سحر لہٗ‘ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا عطیہ و اختیار ہے جب کہ ’سحر‘ ’سنت اللہ‘ کی خیانت، چوری اور غصب ہے اور سحر بہٗ اس خیانت کردہ، چوری اور

غصب کردہ شئے اور قوت کا خودمختارانہ، باغیانہ، اور دشمنانہ استعمال ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ 'سخر' اور 'سحر' حقیقت اور نتیجے یعنی اثر کے اعتبار سے یکساں ہیں لیکن مبلغ اور صورت حصول کے اعتبار سے بالکل مخالف ہیں یعنی:

(۱) 'سخر' اور 'سحر' دونوں سنت اللہ کا حصہ ہیں۔

(۲) 'سخر' کے تحت وہ امور آتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مخلوق اور یہاں انسان کے لئے 'سخر لہٗ' بنایا ہے یعنی اس کے اختیار میں دیا ہے جب کہ 'سحر' وہ امور ہیں جن کو انسان نے از خود اور بغیر اللہ تعالیٰ کے 'مسخر لہٗ' بنائے ہوئے اور اس کی رضا کے بغیر بلکہ منع کرنے کے باوجود اس پر اختیار حاصل کرلیا ہے۔ ان دونوں کے مابین وہی فرق ہے جو Merchandise (قابل فروخت وخرید اشیاء) اور Contraband (وہ اشیاء جن کا حصول، درآمد، برآمد، خرید وفروخت ممنوع ہے) کے مابین ہوتا ہے۔ ہرچند کہ دونوں اپنی حقیقت اور اثر میں 'مال' (Good) ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ 'سحر' **امر مموہ باطل لاحقیقة له، ولا ثبات،** (سحر ایک ایسا امر ہے جو محض دھوکا اور باطل ہے اور اس کی نہ حقیقت ہے نہ اسے ثبات ہے) وہ غلط کہتے ہیں۔ ایسا کہنے والے ممکن ہے اس اعتبار سے درست کہتے ہوں کہ وہ اس 'سحر' کو جانتے ہوں جو ان کے اردگرد مشہور ہوگا۔ لیکن وہ اس 'سحر' کو جاننے والے قطعاً نہیں ہوسکتے جس کا ذکر قرآن اور احادیث مبارکہ میں ہے۔ 'سحر' کو بے حقیقت کہنا غلط ہے خواہ کہنے والے امام ابوبکر جصاص، ابو اسحاق اسفرائنی، علامہ ابن حزم یا ابوجعفر شافعی جیسے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔

(۳) 'سخر' اور اس میں سنت کی پیروی دراصل 'سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' کی پیروی ہے جو 'سنت اللہ' کی بالعین پیروی ہے۔ اور یہ عبدیت کا افضل ترین درجہ ہے۔ اس کے بالمقابل 'سحر' اور اس سے استفادہ دراصل سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت الانبیاء کو کچل ڈالنا اور اس کے متوازی اپنی خودمختارانہ، باغیانہ اور دشمنانہ سنت جاری کرنا ہے بلکہ فی الواقع ایسا کرنا 'سنت اللہ' کو کچل ڈالنا اور اس کے متوازی اپنی خودمختارانہ، باغیانہ اور دشمنانہ سنت جاری کرنا ہے۔

یہی سبب ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلق سے ایک اصولی بات بیان فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عن ابی هريرة ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قال اجتنبوا

الموبقات: الشرک باللہ والسحر (بخاری: کتاب الطب)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کی: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: ہلاک کرنے والی چیز سے بچو۔ شرک باللہ اور 'سحر'

شرک باللہ مطلقاً اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں شرک ہے۔ لیکن عموماً اسے اللہ تعالیٰ کی ذات میں شرک کو کہتے ہیں۔ اس شرک کے دو وجوہ ہیں:

(۱) اللہ کے علاوہ کسی ذات کو اللہ کی ذات وصفات میں شریک سمجھنا اور ماننا۔

(۲) خود اپنے آپ کو اللہ کی ذات وصفات میں شریک سمجھنا۔

'سحر' دراصل اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اختیار میں شرک ہے۔ اور اس کے بھی دو وجوہ ہیں:

(۱) ساحر کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اختیار میں شریک سمجھنا یا ماننا۔

(۲) ساحر کا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی قدرت واختیار میں شریک سمجھنا اور ماننا۔

اس لئے غور کیا جائے تو 'سحر' پہلے مرحلے میں یا بادی النظر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اختیار میں شرک ہے لیکن بالآخر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات میں شرک ہو جاتا ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی دونوں 'الموبقات' ہیں۔

قرآن میں 'سحر' کے دو استعمالات وارد ہوئے ہیں:

(۱) پہلا استعمال: پہلا استعمال مطلق ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

(الف) قال القوا فلما القوا سحروا اعین الناس واسترھبو ھم وجاء و بسحر عظیم (الاعراف ۱۱۶)

ترجمہ: کہا ڈالو۔ پس جب انہوں نے ڈالا مرعوب کر دیا لوگوں کو آنکھوں کے سامنے اور ان کو دہشت زدہ کر دیا اور وہ لائے بڑا 'سحر'۔

یہاں 'سحر' سے مراد اپنی طاقت، قدرت اور ناقابل یقین قوت کا استعمال کر کے کسی اعتبار سے ہو خواہ علمی، عملی، فکری، عقلی، نفسیاتی اور ذہنی طور پر کسی کو مرعوب کر دینا۔ یہ مظاہرہ آنکھوں کے سامنے بھی ہو سکتا ہے اور لوگ اسے ہوتے ہوئے دیکھ بھی سکتے ہیں اور آنکھوں سے پرے بھی جس کا صرف نتیجہ دیکھا جا سکتا ہے۔

(۲) **قل من بیدہ ملکوت کل شی وھو یجیر ولا یجار علیہ ان کنتم**

تعلمون. سیقولون للله قل فانی تسحرون (المومنون ٩۔٨٨)

ترجمہ: تو کہہ! کس کے ہاتھ میں ہے ملکوت ہر چیز کی اور وہ بچالیتا ہے اور اس سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ اب بتائیں گے اللہ کو۔ تو کہہ! پھر کہاں تم مرعوب ہو جاتے ہو (اور اسے یعنی غیر اللہ کو قدرت والا سمجھنے لگتے ہو)

ان دونوں جگہ 'سحر' کا مطلق استعمال ہے اور اس کا مفہوم ہے غیر معمولی یا محیر العقول قوت و طاقت کا استعمال کر کے کسی کو مغلوب و مرعوب کر دینا اور اسے باور کرانا کہ اس کا استعمال کرنے والا کس طاقت اور قوت کا ملک ہے۔

(۲) دوسرا استعمال: دوسرا استعمال 'ب' صلہ کے ساتھ ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے کوئی چیز، طاقت اور قوت مراد ہے جس کا 'استعمال' اس کیفیت کا مظاہرہ کرتا ہے یا وہ تاثیر پیدا کرتا ہے جس سے کسی کے صاحب طاقت وقدرت ہونے اور صاحب اختیار ہونے کا اظہار ہو۔

(۲) سحر اور تسحیر کا اکتشافی نقطۂ نظر: 'سحر' اور 'تسحیر' کا اکتشافی نقطۂ نظر انفاقی نقطۂ نظر کے بالکل برعکس ہے جس کا کسی قدر اجمالی ذکر 'ابلیسی طریقۂ فساد' کے عنوان کے تحت اور دیگر مقامات پر کیا جا چکا ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔

(۳) روئے ارض پر سحر و تسحیر کی اکتشافی صورتحال: الجنہ کی طرح روئے ارض پر بھی ابلیس نے وہی طریقۂ فساد اختیار کیا۔ اس نے اس تعلق سے متعدد السطوح تدابیر اختیار کیں جن کا ذکر مختصراً ذیل میں کیا جاتا ہے:

(۱) تحریف مقصد: سب سے پہلے ابلیس نے بنی آدم کے دل میں اسکی تخلیق اور روئے ارض پر اس کے بسائے جانے کے پیچھے اصل مقصد کی تحریف کرنے کی کوشش کی۔ اس نے یا تو بنی آدم کو بھلا دیا کہ روئے ارض پر بسانے اور اس سے پہلے الجنہ میں بسائے جانے اور سب سے پہلے آدم کی تخلیق کئے جانے کے پیچھے کیا ربانی مقاصد تھے۔ جن لوگوں کو وہ مقصد یاد تھا انہیں اس نے شک میں ڈال دیا۔ اس نے ان کے دلوں میں شک ڈالا کہ 'عبادت' انسانی تخلیق اور روئے ارض پر بسائے جانے کا مقصد نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے اس نے دو دلیلیں دیں۔

(۱) وہ صلاحیت جو انسان کے اندر پائی جاتی ہے۔ اس نے ان حیرتناک صلاحیتوں کی یاد دلا کر اسے باور کرایا کہ ان صلاحیتوں کا دیا جانا محض 'عبادت' کے لئے نہیں ہو سکتا۔

(۲) وہ چیزیں اور امکانات جو روئے ارض پر پائی جاتی ہیں۔ ہوا، بادل، پانی،

پھیلے میدان، نباتات، حیوانات، چمکتا سورج، معدنیات وغیرہ۔ اس نے ان حیرتناک چیزوں، امکانات اور صورتحال کی یاد دلا کر اسے باور کرایا کہ ان چیزوں اور امکانات کا دیا جانا محض 'عبادت' کے لئے نہیں ہو سکتا۔ اس طرح ٹھیک الجنہ کی طرح روئے ارض پر بھی انسان سب سے پہلے ربانی مقصد کے تعلق سے 'شک' میں پڑ گیا۔ روئے ارض پر الجنہ کی طرح ہی ابلیس اس امر میں کامیاب ہو گیا جس کا ذکر قرآن نے یوں فرمایا ہے:

فازلھما الشیطن عنھا فاخر جھما مما کانا فیه (البقرہ ۳۶)

ترجمہ: پھر ہلا دیا ان کو شیطان نے اس سے پھر باہر کر دیا ان کو اس صورتحال سے جس میں وہ تھے۔

یہاں 'ہلا دیا' سے مراد ہے 'مقصد تخلیق' اور 'مقصد ربانی' کے تعلق سے 'شک' میں ڈال دیا۔ انسان کو محسوس ہونے لگا کہ ضرور کوئی اور بات ہے اور یہ بات درست نہیں کہ عبادت مقصد حیات ہے۔ اسی طرح 'مما کانا فیه' سے الجنہ یا وہ راحت و آرام جو وہاں پایا جاتا تھا مراد نہیں۔ بلکہ اس سے اصلاً وہ ذہنی صورتحال مراد ہے جس کے تحت درج ذیل امور وہاں موجود تھے۔

(۱) انفاقی علم پر اکتفاء کرنا اور صرف اسی سے استفادہ کرنا اور وہ بھی صرف انفاقی درجے پر استفادہ کرنا

(۲) انفاقی عمل پر اکتفاء کرنا اور وہ بھی صرف انفاقی درجے پر اکتفاء کرنا۔

اسی طرح روئے ارض پر بھی ابلیس نے بنی آدم کو 'ہلا دیا' اور اس 'ذہنی صورتحال' سے اسے باہر کر دیا جس کے تحت وہ روئے ارض پر انفاقی عمل پر اکتفاء کرتا تھا۔ صرف اسی سے استفادہ کرتا تھا اور صرف انفاقی درجے پر استفادہ کرتا تھا اسی طرح انفاقی ہنر پر اکتفاء کرتا تھا اور صرف انفاقی درجے پر اس سے استفادہ کرتا تھا اور اسی طرح انفاقی عمل پر اکتفاء کرتا تھا اور صرف انفاقی درجے پر یہ عمل کرتا تھا۔

جب بنی آدم نے ابلیسی تحریک پر یہ باور کر لیا کہ اس کی حیات کا وہ مقصد نہیں جو اللہ بتا رہا ہے تو پھر اس نے اس دائرے سے قدم آگے بڑھا لئے۔ اور یہی وہ بات ہے جسے قرآن نے 'اصلاح کے بعد فساد' کہا ہے قرآن کا ارشاد ہے:

ولا تفسدو افی الارض بعد اصلاحھا (الاعراف ۵۶)

ترجمہ: اور فساد نہ ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد

(۲)　**ضرورت علم:** جب انسان نے باور کر لیا کہ اس کی حیات کا وہ مقصد نہیں جو اللہ تعالیٰ بتا رہا ہے بلکہ کچھ اور ہی ہے تو اس نے ابلیس کی مدد سے دوسرے دوسرے مقاصد حیات متعین کر لئے۔ اب اللہ تعالیٰ نے اپنے مقاصد کے تحت ہی 'سنت اللہ' کا اس ارض پر اجراء فرمایا تھا اور انسان کیلئے 'سحر' کا فیصلہ بھی اس مقصد کے تحت ہوا تھا۔ جو اس مقصد کی تکمیل کیلئے کافی تھا۔ لیکن جب انسان نے ربانی مقصد کو چھوڑ کر دوسرے مقاصد متعین کر لئے تو اب نئی صورتحال پیدا ہو گئی جو درج ذیل تھی:

(۱) ان نئے مقاصد کی تکمیل میں ربانی علم کفایت نہیں کرنے لگا اور مزید علم کی ضرورت آن پڑی۔

(۲) ان نئے مقاصد کی تکمیل میں 'سحر' یعنی ربانی تسخیر کفایت نہیں کرنے لگی اور مزید تسخیر کی ضرورت آن پڑی۔

(۳)　**ضرورت اکتشاف:** اس مرحلے میں ابلیس نے انسان کو باور کرایا کہ اسے اکتشاف کی طرف جانا چاہئے اور انفاقی علم اور اس انفاقی علم کے حصول کے راستے کو خیر آباد کہہ دینا چاہئے۔ اس مقام پر مشکل یہ آن پڑی کہ اللہ تعالیٰ علم کا سرچشمہ ہے۔ صرف وہی 'علیم' ہے یعنی العلیم ہے۔ اس کے علاوہ 'علم' کہیں اور پایا نہیں جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے مقصد کی تکمیل کیلئے کافی 'علم' عطا فرمایا ہے۔ یہ کافی علم انفاقی علم تھا۔ اس سے زیادہ علم انسان کیلئے ضروری تھا نہ مفید۔ چنانچہ اس انفاقی علم کے ہوتے ہوئے مزید علم روئے ارض پر انسان کو نہیں مل سکتا تھا۔ اب علم حاصل کرنے کی دو ہی صورتیں تھیں۔ یہ دو صورتیں تھیں:

(۱) عمودی حرکت

(۲) افقی حرکت

اور یہ دونوں صورتیں غصب' چوری اور ناجائز حصول سے ہی حاصل ہو سکتی تھیں لہذا ممنوع اور حرام تھیں۔ ابلیس نے انسان کو اسی راہ کی طرف رہنمائی کی۔

عمودی حرکت کے ذریعہ اکتشاف: اللہ تعالیٰ نے کائنات میں بے شمار مخلوقات بنائے ہیں۔ ہر مخلوق کیلئے اللہ تعالیٰ نے 'سنت اللہ' کا اجراء فرمایا ہے۔ اور ہر مخلوق کیلئے اس نے 'سحر' فرمایا ہے۔ ہر مخلوق کیلئے 'شرعۃ' اور 'منہاج' ہے۔ چنانچہ ہر مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے انفاقی علم اور انفاقی ہنر

عطا فرمایا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے اپنے انفاقی عمل کو انجام دینے کے پابند ہیں۔ ان مخلوقات کی اپنی جگہ الگ الگ کئی حالتیں بھی ہیں جو اپنی دوسری حالت سے بالکل جدا ہیں اور ان کے درمیان شعوری ربط نہیں۔ پھر ان کی تفصیلات ہیں۔ مثلاً خود انسان کی کئی حالتیں درج ذیل ہیں:

(۱) کسی فرد مثلاً 'زید' کی جو سن ۱۹۲۰ میں پیدا ہوا ہے وہ حالت جب وہ پشت آدم میں الجنتہ میں تھا۔

(۲) جب وہ پشت قابیل و ہابیل و شیث میں تھا۔

(۳) جب وہ اپنے والد کے پشت میں تھا۔

(۴) جب وہ رحم مادر میں جان آنے سے قبل تھا

(۵) جب وہ رحم مادر میں جان آنے کے بعد تھا

(۶) جب وہ بچپن' نوجوانی' جوانی' ادھیڑپن میں تھا اور اب بڑھاپا میں ہے۔

(۷) جب وہ برزخ میں ہوگا

ظاہر ہے ان میں سے ہر حالت میں اللہ نے اسے انفاقی علم سے نوازا ہوگا۔ یہ انفاقی علم اس کی دوسری حالتوں کے انفاقی علم سے مختلف ہوگا۔ اس پر دیگر تمام مخلوقات اور ان کی حالتوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ابلیس نے انسان کو باور کرایا کہ اس کے نئے مقاصد کے لئے ضروری علم عمودی حرکت سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یعنی انسان اپنی سطح چھوڑ کر دوسری مخلوقات کی سطح پر جا کر یا اس سطح کی مخلوقات سے ربط کرکے اس سطح کا انفاقی علم حاصل کرلے۔ اس حصول کی تین ہی صورتیں تھیں:

(۱) چوری۔ چوری سے مراد یہ ہے کہ دوسری مخلوق کے انفاقی علم کو غیر قانونی طریقے اور اس مخلوق کے علم کے بغیر اسے حاصل کرلینا۔

(۲) غصب۔ غصب سے مراد یہ ہے کہ دوسری مخلوق کے انفاقی علم کو اسے مغلوب کرکے یا مجبور کرکے غیر قانونی طریقے سے حاصل کرلینا۔

(۳) خیانت۔ خیانت سے مراد یہ ہے کہ دوسری مخلوق کے انفاقی علم کو اس کے ساتھ تحالف کرکے اس کی رضا سے حاصل کرلینا اور اس مخلوق کا اپنا انفاقی علم ابلیس اور اس کے حلیفوں کو دے دینا۔

چنانچہ ابلیس کی رہنمائی میں انسان نے دوسری مخلوقات کے انفاقی علم کو حاصل کرنے کیلئے چوری، غصب اور خیانت کا راستہ اختیار کیا۔

پھر ہر مخلوق کی اور خود انسان کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں چنانچہ ان الگ الگ حالتوں میں پائے جانے والے انفاقی علم کو مذکورہ راستوں سے حاصل کرنے کا آغاز کیا گیا۔

حرکیت (Mobility) اور دیگر امور کے اعتبار سے اگر انسان کے اردگرد پائی جانے والی مخلوقات اور انکی حالتوں کو ترتیب دیا جائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انسان کی اکتشافی جدوجہد کا دائرہ کس قدر وسیع ہوسکتا ہے۔

(۳) ملائکہ	روح/امر	امر/روح	ماقبل پیدائش ۔ مابعد موت
(۲) ملک	امر/روح	امر/روح	ماقبل پیدائش ۔ مابعد موت
(۱) جن	امر/روح	امر/روح	ماقبل پیدائش ۔ مابعد موت
(۰) آدمی	امر/روح	امر/روح	ماقبل پیدائش ۔ مابعد موت
(۱) حیوان مطلق	امر/روح	امر/روح	ماقبل پیدائش ۔ مابعد موت
(۲) نباتات	امر/روح	امر/روح	ماقبل پیدائش ۔ مابعد موت
(۳) جمادات	امر/روح	امر/روح	ماقبل پیدائش ۔ مابعد موت

چنانچہ انسان نے ان ذرائع سے علوم حاصل کرنا شروع کر دیئے۔ اس طرح ان ذرائع سے حاصل کردہ سارا علم اکتشافی علم تھا جو ممنوع، حرام، مضر اور غیر محمود تھا۔ اور یہی ’سحر‘ کا علم ہے۔

افقی حرکت کے ذریعہ اکتشاف: افقی حرکت کا ذکر اکتشاف کے ذیل میں بالعموم نہیں ہوتا

چاہئے۔ اس لئے کہ افقی حرکت کے غیر محمود ہونے کی بات تو وہاں آتی ہے جہاں یہ بات انفاقی سطح پر ہو یعنی انسان کیلئے انسانی انفاقی سطح۔ جب انسان نے اپنی انسانی سطح چھوڑ کر مثلاً جنوں کی سطح پر آ کر وہ علوم حاصل کئے جو جنون کیلئے انفاقی علم تھا تو اب اگر انسان اس علم کو حاصل کرنے کے بعد اس میں مزید توسیع کرتا ہے تو یہ تو حرام علی الحرام کے درجے کی بات ہوگی۔ اس لئے کہ انسان کیلئے اپنی انفاقی سطح چھوڑ کر جنون کی سطح پر آنا ہی ممنوع و حرام تھا۔ چہ جائکہ وہ اس میں اس جانب قدم بڑھانے جدھر قدم بڑھانا خود جنون کیلئے ناپسندیدہ اور نامحمود تھا اور اگر جن ایسا کرتے تو ان کی اللہ گرفت کرتا یا وہ بالآخر تباہ ہو جاتے۔ تاہم صرف تقریب فہم کیلئے ان چاروں افقی سطحوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) درجۂ اول: درجۂ انفاقی استفادہ

(۲) درجۂ دوم: درجۂ معلومات خاص

(۳) درجۂ سوم: درجۂ معلومات و تجربۂ خلق جدید یا درجۂ تسخیر

(۴) درجۂ چہارم: درجۂ تبدیلی سنت

چنانچہ انسان نے ابلیس کی رہنمائی میں طرح طرح کی مخلوقات سے حاصل ہونے والے انفاقی علم میں افقی حرکت کا آغاز کر دیا۔

(۴) ضرورت توسیع: اس صورتحال نے انسانوں کے درمیان فساد کا ایک نہ ختم ہونے والا دائرہ (Vicious Circle) کے بنانے کا آغاز کر دیا۔ ہر معلومات اور ہر عمل ایک نئے علم اور ایک نئے عمل کی توسیع کا متقاضی ہونے لگا۔ چنانچہ

(۱) علمی توسیع (Scientific or Intellectual Extension)

(۲) ہنری توسیع (Technological Extension)

(۳) عملی توسیع (Practical or Observational Extension) کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ ایک ایسا پاگل پن تھا جس نے بالآخر انسان کو بوجھل بنا دیا۔ یہی وہ گھڑی تھی جب شیطان نے اسے ایک عام نسخہ بتایا تا کہ وہ اپنی اس حرکت کو ہمہ دم جاری بھی رکھ سکے اور پر نشاط بھی رہے۔ ابلیس نے ان دونوں حرکتوں کا نام 'تسخیر کائنات' رکھ دیا یعنی اس نے سادہ سبق یہ سکھایا کہ انسان کا بنیادی وظیفہ یہ ہے کہ وہ 'کائنات کو مسخر' کرے۔ چنانچہ یہاں سے اس

prepared by M. Nazir Mehmood

دائرہ کے بننے کا آغاز ہوا جو بالآخر ایک خطرناک مقام پر پہنچ جاتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ روئے ارض پر سائنس کی کوئی تاریخ نہیں۔ کارل پوپر (Karl Popper) نے اسے ادھورا سفر اور نامکمل دائرہ قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں: ما کان و ما یکون باب: ادراک کائنات) لیکن ایسا کہنا درست نہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی (Science & Technology) کی فی الواقع تاریخ ہے لیکن یہ تاریخ دائروی (Cyclical) ہے۔ یہ تاریخ دراصل اکتشافی علم، اکتشافی ہنر اور اکتشافی عمل کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ علمی طور پر افقی سطح پر درجۂ اول پر شروع ہوتی ہے اور جب درجۂ چہارم پر پہنچ جاتی ہے تو اس اکتشافی علم کا حامل خود کو رب العالمین' سمجھنے لگتا ہے اور اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کا روئے ارض سے خاتمہ کر دیتا ہے۔

اسی طرح یہ تاریخ ہنری طور پر افقی سطح پر درجۂ اول پر شروع ہوتی ہے اور جب درجۂ چہارم یعنی درجۂ مکلفہ پر پہنچ جاتی ہے تو اس اکتشافی ہنر کا حامل خود کو' رب العالمین' سمجھنے لگتا ہے اور اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دعویٰ کر بیٹھتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

اسی طرح یہ تاریخ جب عملی طور پر افقی سطح پر درجۂ اول پر شروع ہوتی ہے اور درجۂ چہارم پر پہنچ جاتی ہے تو اس اکتشافی عمل کا حامل خود کو' رب العالمین' سمجھنے لگتا ہے اور اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ مقام ہے جہاں اسے 'سنت اللہ' کو تبدیل کر کے اپنی سنت کے اجراء کا حوصلہ ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے انا ربکم الاعلیٰ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ روئے ارض سے اس کا خاتمہ کر دیتا ہے اور ہر بار اس راہ پر چل پڑنے والے اس گمان میں رہتے ہیں کہ وہ پہلے لوگ ہیں جو اس راہ پر اس قدر آگے جا رہے ہیں۔

(۴) روئے ارض پر 'سحر و تسخیر' کی یعنی اکتشافی علم ہنر اور عمل کی تاریخ: عہد حاضر میں دنیا کی جو تاریخ بیان کی جاتی ہے وہ ناقص اور غلط ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہے۔ آج بیان کی جانے والی تاریخ میں جسے سائنسی تاریخ نویسی (Scientific Historiography) کہا جاتا ہے دو باتیں نمایاں ہیں:

(۱) روئے ارض پر انسان کی تاریخ اتنے سالوں قبل شروع ہوئی۔ انسان ارتقائی مراحل (Evolutionary Phases) طے کرتا رہا، پہلے غاروں میں رہتا تھا تو یہ سنگی زمانہ

ان میں سے ہر عہد میں حاملین اکتشاف نے بالآخر اپنے رب العالمین ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ قرآن اس پر صریح ہے کہ روئے ارض پر نیوکلیر عہد' کیمیاوی عہد' جراثیمی عہد اور خلائی عہد آج پہلی بار شروع نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس سے پہلے کئی بار یہ فسادات پیدا ہو چکے ہیں اور اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔

(۵) قرآن میں مذکور 'سحر':

(الف) قرآنی نقطۂ نظر: اس تعلق سے سب سے چونکانے والی بات جو قرآن میں نظر آتی ہے وہ 'سحر' کا استعمال ہے۔ قرآن میں 'سحر' کا جہاں جہاں استعمال ہوا اس میں دو پہلو نمایاں ہیں:

(۱) منفی اور

(۲) الزامی

منفی پہلو سے مراد ہے کہ 'سحر' قرآن میں جہاں جہاں استعمال کیا گیا ہے کہیں بھی اس کا اثباتی یا مثبت استعمال نہیں ملتا۔ بلکہ منفی استعمال ہی ملتا ہے گویا سحر کوئی ایسی چیز ہے جو قابل نفرت یا قابل مذمت ہے۔ الزامی پہلو سے مراد یہ ہے کہ اس کا استعمال جہاں جہاں ہوا ہے وہاں قائل اسے اپنے مخالف پر الزام لگانے اور اسے قابل مذمت ٹھہرانے کیلئے استعمال کرتا ہے۔ یہاں مزید حیرت میں ڈالنے والی بات یہ ہے کہ ایسے استعمال میں حق (یعنی اللہ' رسول اور مومنین) کی جانب سے استعمال برائے نام یعنی زیادہ سے زیادہ ۳ مقامات پر ہے ورنہ بقیہ ۲۰ مقامات پر اس کا استعمال شر اور باطل حق کے خلاف کرتا ہے۔ یعنی ابلیس اور اس کے حلیف اہل حق کے خلاف یہ الزام عاید کرتے ہیں کہ وہ 'سحر' کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور 'ساحر' ہیں۔

چنانچہ (۱) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو

(الف) سورۂ یونس آیت ۲ اور (ب) سورۂ ص آیت ۴ میں علی الترتیب ساحر مبین اور ساحر کذاب کہا گیا۔

(۲) حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو:

(الف) سورۂ الشعراء آیت ۳۴ (ب) سورۂ غافر آیت ۲۴ میں علی الترتیب ساحر علیم اور ساحر کذاب کہا گیا۔

اس کے برخلاف ان انبیاء کرام علیہما السلام کے مقابلے میں لائے گئے لوگوں کو :

(الف) سورۃ الاعراف آیت ۱۱۲ (۲) سورۂ یونس آیت ۷۹ اور (۳) سورۂ الشعراء آیت ۳۷ میں علی الترتیب ساحر علیم، ساحر علیم اور سحار علیم کہا گیا ہے۔

آخر ماجرا کیا ہے؟ اگر 'سحر' بری یا واہمہ اور بے حقیقت چیز ہوتی تو حق اور اہل حق کو اس 'سحر' اور 'ساحر' کا الزام شر اور باطل پر لگانا چاہئے تھا۔ مفسرین کی ساری تشریح ''فقہ اسلامی' کی ساری تعریف مناط، تنقیح مناط اور تحقیق مناط اور علوم اسلامی میں درج ساری تفصیلات قرآن سے نہ صرف یہ کہ مطابقت نہیں رکھتیں بلکہ اس کے برخلاف ہیں۔ قرآن کا سارا بیان یہ ہے کہ:

حق باطل پر 'سحر' کا الزام عاید نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو صرف بیانیہ جب کہ باطل حق پر (یعنی انبیاء پر) 'سحر' کرنے اور 'ساحر' ہونے کا الزام عاید کرتا ہے۔ اور انہیں قابل سزا بلکہ قابل سزائے موت قرار دیتا ہے۔

مفسرین کی تفسیریں 'فقہ اسلامی' کی تحقیق مناط اور علوم اسلامی میں درج تفصیلات کا بیان یہ ہے کہ:

'سحر' ایک بے حقیقت اور جمہور کے نزدیک حقیقت اور ہر دو صورت میں باطل ہے اور 'سحر' کرنا غلط اور 'ساحر' قابل سزا ہے اور بعض صورتوں میں قابل سزائے موت۔

(ب) قرآنی بیان: قرآن میں 'سحر' کا استعمال درج ذیل اعتبار سے ہوا ہے:

(۱) سحر (اسم)

(۲) سحر (فعل)

(۳) سحر مبین، سحر مفتری، سحر مستمر، سحر یوثر، سحر عظیم

(۴) ساحر علیم، ساحر مبین، ساحر کذاب

(۵) سحار علیم

(۱) ان استعمالات میں دو امور نہایت اہم ہیں جن پر غور کیا جانا چاہئے۔

پہلا امر: سحر عظیم کا استعمال،

(۲) دوسرا امر: سحر مبین، سحر مفتری، سحر مستمر، سحر یوثر اور سحر عظیم کا استعمال۔

(۳) تیسرا امر: ساحر مبین، ساحر علیم اور ساحر کذاب کا استعمال۔

پہلا امر: جہاں تک پہلے امر کا ذکر ہے اس میں 'عظیم' صفت کا ہونا عام ہے۔ یعنی یہ سحر کی کوئی مخصوص قسم نہیں بلکہ ہر قسم کا 'سحر' جو غیر معمولی ہو اسے 'سحر عظیم' کہا جا سکتا ہے۔ قرآن نے اسی اعتبار سے اس کا استعمال کیا ہے۔ یعنی جو کچھ اہل فراعنہ نے کیا وہ غیر معمولی سحر کا مظاہرہ تھا۔

دوسرا امر: دوسرے امر میں اصل 'سحر مبین' ہے۔ جہاں تک سحر مفتری 'سحر مستمر اور سحر یؤثر کا تعلق ہے قرآن کا استعمال بتاتا ہے کہ یہ وہ جھوٹے الزامات تھے جو باطل نے انبیاء کرام اور ان کے ہاتھوں ظہور میں آنے والے معجزات کی 'بزعم خویش' حقیقت اجاگر کرتے ہوئے اور لوگوں کو فی الواقع ان معجزات کی حقیقت' انبیاء کی عظمت اور ان کی دعوت کو بے حقیقت اور قابل رد قرار دینے کیلئے لگایا تھا۔ تاہم دیکھا جانا چاہئے کہ اس الزامی اور غلط اور بے حقیقت بہتان کی معنویت کیا تھی؟

(۱) سحر مفتری: قرآن کا ارشاد ہے:

فلما جاء هم موسى بايتنا بينت قالو ا ما هذا الا سحر مفترى و ما سمعنا بهذا فى آبا ئنا الا ولين '(القصص:۳۶)

ترجمہ: پھر جب پہنچا ان کے پاس موسیٰ ہماری 'آیات بینات' لیکر تو وہ بولے: (یہ) کچھ نہیں ہے مگر 'سحر مفتری' اور ہم نے (کبھی) سنا نہیں یہ اپنے اگلے باپ دادوں میں۔

غور کیا جائے تو کئی باتیں نظر آتی ہیں: (۱) ان لوگوں نے حضرت موسیٰ کے جس امر پر 'سحر مفتری' کا الزام عاید کیا وہ قرآن کے مطابق 'آیات بینات' تھا یعنی وہ معجزے جو حضرت موسیٰ نے دکھایا۔ تھوڑی دیر کیلئے فرض کیجئے کہ حضرت موسیٰ نے 'ید' کے استعمال سے سارے ملک فرعون میں قحط لا دیا یا پانی کو خون بنا دیا یا ٹڈیاں لا دیں یا وباء پھیلا دی۔ اس پر فرعون نے کہا کہ یہ 'سحر مفتری' ہے۔ ظاہر ہے ایسا کہنا حضرت موسیٰ کے اثر کو قوم میں زائل کرنے اور ان کے ذریعہ حق کی قوت کے مظاہرے کو بے حقیقت بتانے کے لئے ہی ہوا ہوگا۔ تو یہ آیات بینات بھلا بے حقیقت اور واہمہ کیسے ہو سکتی ہے؟ ہاں فرعون کا ایسا کہنا درست ہے کہ ایسا ہوتے تو ہم نے کبھی نہیں سنا تھا؟ واضح ہو کہ یہاں یہ استعمال منفی طور پر اور الزاما ہے۔ یعنی اگر مثبت اور بیانیہ حقیقت جانی ہو تو 'سحر' کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان کے ذریعہ ایسی قوت حاصل کر لینا جسے اللہ نے انسان کیلئے 'سحر' نہیں کیا تھا۔ مثلاً یہ کہ فرانس میں بیٹھ کر ایک ڈاکٹر کا لاس انجلس (امریکہ) میں ایک

www.bookstube.net www.urdutube.net prepared by M. Aamir Mehmood www.urdumovies.net www.asrarelahi.net

(Stone Age) تھا' پھر ارتقاء پزیر ہوتا ہوا تانبے کے زمانے (Copper Age) میں پھر کانسے کے زمانے (Bronze Age) میں، پھر لوہے کے زمانے (Iron Age) میں پھر عہد قدیم (Ancient Age) میں پھر عہد وسطیٰ (Medieval Age) میں پھر عہد جدید (Modern Age) میں پھر اب عہد خلا (Space Age) میں داخل ہو گیا ہے۔

(۲) روئے ارض پر انسان نے جیسی آج ترقی کی ہے اور جیسا علمی و ہنری اور عملی انفجار (Scientific, Technological & Applicational Explosion) آج ہوا ہے اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔

یہ دونوں باتیں نادرست' غلط اور گمراہ کن ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ روئے ارض پر 'سحر' اور 'تسخیر' کی انفاقی تاریخ ہی صلاح فی الارض کی تاریخ ہے اور یہی تاریخ انسانی تاریخ ہے۔ صرف اسی تاریخ میں 'وقت' (Time) خط مستقیم (Linear) میں آگے بڑھ رہا ہے۔

اس کے متوازی ایک اور تاریخ ہے جو 'سحر' اور 'تسخیر' کی اکتشافی تاریخ ہے۔ یہی تاریخ فساد فی الارض کی انسانی تاریخ ہے۔ یہی تاریخ مفسدین فی الارض کی تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں 'وقت' (Time) خط مستقیم (Linear) میں نہیں بلکہ دائروی (Cyclical) طور پر آگے بڑھ رہا ہے۔ جب یہ دائرہ مکمل ہو جاتا ہے تو اللہ اس اکتشافی علم' اس اکتشافی ہنر اور اس اکتشافی عمل کو کلی طور پر نابود کر دیتا ہے۔ اور بعد والے جب پھر اسی فساد کا آغاز کرتے ہیں اور ویسا ہی اکتشافی تعلیم و تعلم' اکتشافی ہنر اور اکتشافی تعمیل و تعمل کا آغاز کرتے ہیں تو انہیں لگتا ہے کہ وہی سب سے پہلے اس کے کرنے والے ہیں۔ جیسا کہ آج کے عہد کے سائنسی تاریخ والے سمجھتے ہیں۔ جب کہ حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس روئے ارض پر آج کی طرح درجہ' کمال تک پہنچی ہوئی اکتشافی صورتحال اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ اس سے قبل بھی کم از کم تین بار روئے ارض پر طاری ہو چکی ہے۔ یہ تین سائنسی اور تکنیکی عہد (Scientific & Technological Age) درج ذیل ہیں:

(۱) ماقبل نوح
(۲) ماقبل شعیب
(۳) ماقبل بعثت نبوی ﷺ

شخص کا روبوٹ کے ذریعہ دل کا کھلا آپریشن (Open Heart Surgery) کرنا۔ یا ایک شخص (موجودہ اصطلاح میں بزرگ) کا دہلی میں بیٹھ کر آنکھیں موند کر یا کسی جن موکل کے ذریعہ یہ بتانا کہ زید کا بیٹا جو گھر سے بھاگ گیا ہے وہ اس وقت لکھنؤ میں ہے۔ یہ دونوں امور الگ الگ ذرائع یعنی ان 'علم' اور 'ہنر' (Science & Technology) کے استعمال سے انجام دیئے گئے ہیں جنہیں اللہ نے انسان کو 'سخر لہٗ' کے تحت نہیں دیا تھا۔ فرعون کا ایسا کہنا ہر چند کہ منفی طور پر اور الزاماً تھا لیکن صدفی صد درست تھا کہ ایسا ہوتے یعنی کسی شخص کا 'ید' کا استعمال کر کے پانی کو خون کر دینا' سارے ملک میں بیماریاں پیدا کر دینا۔ تو ہم نے نہ کبھی دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ کوئی انسان ایسا کرے ممکن نہیں۔ اب ایک شخص جو (الف) یہ مانتا ہو کہ یہ قوت کسی عام انسان کے بس سے باہر ہے۔ اس لئے کہ یہ ان قوتوں میں سے نہیں جو 'مسخر لہٗ' کے دائرے میں داخل ہیں (ب) اور جو یہ ماننا نہیں چاہتا ہو کہ اس شخص کو اسی ذات اور ہستی نے یہ مافوق الانسانی قوت عطا کی ہے جس نے سارے جہان کے انسانوں کو 'مسخر لہٗ' کے تحت طاقت دی ہے۔ تو پھر اب صرف تیسرا راستہ ہی بچ رہتا ہے یعنی یہ کہ ضرور اس شخص نے ان مافوق الانسانی قوت کو 'سحر' اور 'تسحیر' کیا ہے۔ لیکن اس مقام پر وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اسی 'سحر' ہی سے سہی مرعوب ہو جائیں۔ لہذا اس نے اس تاثر کو بھی دور کرنے کیلئے ایک اور الزام لگایا کہ یہ سحر 'مفتری' ہے۔ یعنی ایسا محیر العقول کارنامہ جس میں دھوکا اور نمائش ہو۔ یہاں فرعون کے اصلا مخاطب موسیٰ نہیں بلکہ خود اس کے ملاء ہیں۔

(۲) سحر مستمر: قرآن کا ارشاد ہے:

اقتربت السـاعة و انشق الـقـمـر و ان يروا آية يعرضوا ويقولوا سحر مستمر (القمر: ۲-۱)

ترجمہ: پاس آ لگی قیامت اور پھٹ گیا چاند اور اگر وہ دیکھیں کوئی نشانی تو ٹال جائیں اور کہیں یہ 'سحر مستمر' ہے۔

یہاں بھی وہی بات صادق آتی اور وہی صورتحال منطبق ہوتی ہے۔ آنحضور ﷺ کے ذریعہ ظاہر کی گئیں 'آیات بینات' یعنی معجزات واہمہ' بے حقیقت اور خیالی باتیں نہیں تھیں بلکہ اٹل حقیقت تھیں اور لوگوں نے 'انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جس پر اہل مکہ یعنی علماء یہود دیگر

www.booksube.net
prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrardan.net

یہود اور مشرکین مکہ نے یہ الزام عاید کیا کہ: یہ 'سحر مستمر' ہے۔ اس الزام سے کیا مراد ہے؟

اس الزام سے وہ معنی قطعاً مراد نہیں جو عام ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ جادو ہے پہلے سے چلا آتا (ترجمہ شیخ الہند) بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ (ا) بلا شبہ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے سب کی آنکھوں نے بہ اطمینان دیکھا ہے لیکن ایسا کارنامہ کسی انسان کے بس سے باہر ہے (ب) اور وہ یہ ماننا نہیں چاہتے کہ یہ اللہ کے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور اللہ جس نے کائنات کو انسان کیلئے مسخر بنایا ہے اسی نے یہ قوت اپنے رسول کو دی ہے۔ (ج) ظاہر ہے اس صورت میں یہی کہا جائے گا کہ اس شخص نے کسی ذریعہ سے یہ 'سحر' کیا ہے یعنی ایسی حیرتناک قوت حاصل کر لی ہے۔ چونکہ یہ غیر معمولی کارنامہ نظر آنے والا اور بتکلف بنایا ہوا لگتا ہے اس لئے اسے 'مستمر' کہا گیا جو فی الواقع 'راء' سے مشتق ہے۔

(۳) سحر یؤثر: قرآن کا ارشاد ہے:

انہ فکر و قدر فقتل کیف قدر ثم قتل کیف قدر ثم نظر ثم عبس و بسر ثم ادبر واستکبر فقال ان ھذا الا سحر یؤثر ان ھذا الا قول البشر (المدثر ۲۵۔۱۸)

ترجمہ: اس نے سوچا پھر ٹھہرالیا۔ سو مارا جائے کیسا ٹھہرایا۔ ہاں مارا جائے کیسا ٹھہرایا! پھر نظر ڈالی' پھر تیوری چڑھائی اور منہ تھتھایا۔ پھر پیٹھ پھیری اور غرور کیا پھر بولا یہ کچھ نہیں مگر سحر یؤثر۔ یہ کچھ نہیں مگر قول آدمی۔

یہاں بھی وہی بات صادق آتی ہے اور وہی صورتحال منطبق ہوتی ہے۔ یہاں جو کارنامہ ہے اس کا حسی اعضاء کے ساتھ ساتھ عقل یعنی مدرکہ پر بھی یکساں اثر پایا جاتا ہے۔ اس لئے اسے بھی 'سحر' کہا گیا۔ یہ غیر معمولی اور موثر قوت کا اظہار ہے جو صرف محسوس صیغے سے نہیں بلکہ ایسے صیغوں سے بھی ہو سکتا ہے جو غیر مرئی اور غیر محسوس ہیں اور صرف عقلی طور پر سمجھے جا سکتے ہیں۔

چنانچہ اسی تعلق سے آنحضور ﷺ نے فرمایا:

''ان من البیان لسحر''

ترجمہ: بے شک بیان کے اندر 'سحر' ہے یا بیان ایک قسم کا 'سحر' ہے۔

(۳) 'سحر مبین' جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اصل 'سحر مبین' ہے۔ چنانچہ یہی وہ 'سحر' ہے جسے

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asreralam.net

قرآن بیان کرتا ہے۔ 'سحر مبین' سے کیا مراد ہے؟

یہ وہ ترکیب ہے جس کا استعمال قرآن کی نو سورتوں میں ہوا ہے یعنی (۱) المائدہ آیت ۱۱۰ (۲) الانعام آیت ۷ (۳) یونس آیت ۷۶ (۴) ہود آیت ۷ (۵) نحل آیت ۱۳ (۶) سبا آیت ۴۳ (۷) صافات آیت ۱۵ (۸) الاحقاف آیت ۷ اور (۹) القف آیت ۶۔ میں۔

مبین کا کیا مفہوم ہے؟ 'مبین' 'عربی مبین' کے نہایت بلیغ الفاظ میں سے ایک لفظ ہے۔ بدقسمتی سے یہ ان الفاظ میں سے ایک ہے، جن کی جمہور مفسرین کرام نے عربی مبین سے ناواقفیت کے سبب خوب خوب 'تواضع' کی ہے۔

'عربی مبین' میں 'مبین' کے درج ذیل معانی ہیں:

(۱) ممیز، امتیاز کردہ، امتیاز شدہ

(۲) الگ، الگ کردہ،

(۳) ایسی بات جو واضح، ممتاز، جدا جدا ہو۔

(۴) سمجھنا، سمجھ میں آنا، جس کی معنویت قابل فہم ہو۔

(۵) نظر آنا۔

(۶) وہ چیز جو قوای محوسہ یعنی، باصرہ، شامہ، لامسہ، ذائقہ، سامعہ اور قوت مدرکہ میں سے ایک یا کئی یا سبھوں سے سمجھی جائے۔ یا سمجھائی یا واضح کی جا سکے، یا سمجھائی یا واضح کی گئی ہو یا جانی یا بتائی اور علم میں لائی گئی ہو۔

(۷) مشاہدہ کی گئی، متعین کی گئی، دھیان دی گئی، ممتاز کی گئی، سوچی اور سمجھی گئی چیز یا بات۔ اس طرح 'سحر مبین' کا مفہوم یوں متعین کیا جا سکتا ہے:

''ایسا تخلیقی کارنامہ جو فوق العادۃ ہو یا خرق عادۃ میں سے کسی صورت سے معرض وجود میں آئے یا لایا جائے اور جو قوای محوسہ و مدرکہ کے اعتبار سے واضح اور سمجھا جانے والا ہو۔''

۶۔ (الف) سرف اور اس کی حقیقت:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

ان اللہ لا یھدی من ھو مسرف کذاب (المومن: ۴۰)

ترجمہ: بے شک اللہ ہدایت نہیں دیتا اس کو جو مسرف جھوٹا ہو۔

'مسرف کذاب' کون ہے؟

یہ آیت بڑی عجیب ہے۔ اس کا تناظر یہ ہے کہ:

(۱) فرعون نے ایک عظیم الشان نظام قائم کیا جو اپنی سائنس، ٹکنالوجی اور عسکری قوت کے اعتبار سے ناقابل چیلنج تھا اور اس غیر معمولی قوت کے غرور میں اس نے ظلم کرنا اور حق بات کے ماننے سے انکار کرنا یہاں تک کہ اپنے کو رب الاعلیٰ کہنا اور کہلوانا شروع کیا۔

(۲) حضرت موسیٰ اللہ کے حکم سے اس کے پاس تشریف لے گئے، اسے دعوت دی اور اس کے سامنے 'آیات بینات' یعنی معجزات پیش کئے۔

(۳) ان 'آیات بینات' کو اس نے 'سحر' اور حضرت موسیٰ پر 'ساحر کذاب' کا الزام عاید کیا اور ان کے خاتمے کے درپے ہوا۔

(۴) نظام فرعون کے ایک صالح مومن شخص نے فرعون اور اس کے نظام کو اس اقدام سے باز رکھنا چاہا اور اس تعلق سے دو باتیں پیش کیں۔ اس کی پہلی بات یہ تھی کہ موسیٰ کی بات درست لگتی ہے اور جو معجزے انہوں نے پیش کئے وہ سحر نہیں بلکہ آیات بینات ہیں اور وہ ساحر نہیں بلکہ نبی ہیں۔ گویا ان سے تعرض نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ نبی ہونے کی صورت میں ان کی وعید ضرور سچ ہو کر رہے گی۔ اس سے بچنا چاہئے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اگر وہ نبی نہیں بلکہ اس کا جھوٹا دعویٰ کر رہے ہیں تو ان سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ لہٰذا ہر دو صورت میں تعرض نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

(۵) اس کے بعد وہ شخص ایک نہایت عجیب بات کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ 'مسرف کذاب' کو ہدایت نہیں دیتا۔

اس کے دو پہلو ہیں: (۱) اگر موسیٰ مسرف کذاب ہے تو اس کا اللہ کے یہاں کوئی مقام نہیں اور وہ تمہارا ابھی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ (۲) کہیں ایسا تو نہیں یعنی ایسا ہی ہے کہ موسیٰ نہیں بلکہ اے فرعون تو اور تیرا نظام مسرف کذاب ہے۔ ظاہر ہے بعد کی بات اس نکتہ کو متعین کر دیتی ہے کہ وہ صالح شخص کی بات دراصل یہی تھی کہ اے فرعون تمہارا نظام مسرف کذاب ہے اور میں اسی میں تمہاری خیر دیکھ رہا ہوں کہ تم موسیٰ کی بات مان لو۔ ورنہ مجھے ایسا یقین ہو چلا ہے کہ تمہارا اور تمہارے اس نظام کا وہی انجام ہونے والا ہے جو تم سے قبل 'یوم الاحزاب' یعنی قوم نوح، ثمود اور قوم شعیب کا ہو چکا ہے۔

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asarealam.net

(۶) اس بات پر بالآخر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے وہ صالح شخص گویا ہوتا ہے:

كذالک يضل الله من هو مسرف مرتاب (المومن:۳۴) اسی طرح بھٹکاتا ہے اللہ اس کو جو 'مسرف مرتاب' ہے۔

اور اسکی مزید تشریح کرتے ہوئے کہا گیا: یہ وہی ہے جو جدال کرتے ہیں اللہ کی آیات پر اس حال میں کہ ان کے پاس کوئی سلطان نہیں پہنچی ہوتی ہے۔ دراصل وہ اللہ اور اہل ایمان کے نزدیک بڑے بیزار ہیں۔ اس طرح اللہ ان تمام لوگوں کے دلوں پر مہر کردیتا ہے جو متکبر اور جبار ہوجاتے ہیں۔

(۷) 'متکبر جبار' روئے ارض پر وہی ہوتے ہیں جو اپنے 'سحر' سے اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں انہیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ 'رب العالمین' کی طرح ہوگئے ہیں۔

'مسرف' کیا ہے؟

'عربی مبین' میں 'سرف' اور 'سعف' ایک ہی چیز ہیں۔ جس کا مفہوم ہے کسی چیز کو پھاڑ ڈالنا ۔ کسی چیز کا پھٹ جانا۔

'سرف' آفاق والنفس میں یہ ہے کہ کوئی انسان 'مسخر لہ' چیزوں' باتوں اور قوتوں کو اللہ تعالی کی مرضی کے برخلاف جا کر اس کی سنت کو پھاڑ ڈالے اور اس پر قابض ہوجائے۔ اس اعتبار سے 'سرف' 'سحر' ہے اور 'مسرف' 'ساحر'۔

الجنتہ میں ابلیس نے حضرات آدم وحوا کو اس 'سرف' کی طرف راغب کیا تھا اور وہاں جو گناہ سرزد ہوا وہ دراصل 'سرف' کا ہی گناہ تھا۔

اس روئے ارض پر 'سرف' وہ بنیادی گناہ ہے جو بعد کے تمام گناہوں کا سبب بنا۔

روئے ارض پر 'سرف' کی دو قسمیں ہیں۔ گذشتہ صفحات میں اس عاجز نے اسی کو توسیعات کہا ہے۔

وہ دو اقسام کے 'سرف' درج ذیل ہیں:

(۱) صعود: 'صعود' وہ سرف ہے جو عمودی تبدیلی کے ساتھ ہو۔ یعنی انسان کا انسانی انفاقی سطح سے عمودی چھلانگ لگا کر نیچے یعنی حیوان مطلق' نباتات اور جمادات کی انفاقی سطح کے علم' ہنر اور عمل کو قابو میں کرلینا۔ اور اسی طرح انسانی انفاقی سطح سے اوپر یعنی جن' ملک' ملائکہ' اور تمام اقسام

کی ارواح کی انفاقی سطح کے علم، ہنر اور عمل کو قابو میں کر لینا۔ صعود کے وہ مختلف طریقے جو ابلیس نے انسان کو بتائے ہیں ان میں چند درج ذیل ہیں۔

(۱) سمع۔ سمع کا تعلق انسان کیلئے نا جائز علوم کو خلاف قانون حاصل کرنے سے ہے۔

(۲) خطف۔ خطف کا تعلق انسان کیلئے نا جائز علوم کو خلاف قانون چرا لینے سے ہے

(۳) تعلم۔ تعلم کا تعلق انسان کے ذریعہ نا جائز علوم کا ان کے مجاز حاملین کی مدد سے خلاف ضابطہ حاصل کر لینے سے ہے۔

(۴) بحث۔ بحث کا تعلق انسان کا عطا کردہ علوم کی جائز حد سے آگے جا کر یا ان کے اندر نا جائز علوم کو حاصل کرنے سے ہے۔

انسان نے ابلیس کی تحریک اور رہنمائی میں سمع، خطف، تعلم اور بحث کے ذریعہ یہ عمودی چھلانگ لگائی اور اس طرح صعود کر کے سرف کیا اور ان چیزوں کو 'سحر' کیا جس کا وہ مجاز نہ تھا۔

(۲) اعتداد: 'اعتداد' وہ سرف ہے جو افقی تبدیلی کے ساتھ ہو۔ یعنی انسان اپنی انفاقی سطح کے انفاقی درجہ سے افقاً (Horizontally) تجاوز کرے اور اسی طرح بلکہ اس سے اشد سرف وہ ہے کہ انسان اپنی انفاقی سطح سے عمودی چھلانگ لگائے اور دیگر مخلوقات کی انفاقی سطح کے انفاقی درجہ پر پہنچ کر وہاں سے پھر آگے جا کر افقی حرکت کرے اور اس طرح تجاوز پر تجاوز کرتا جائے۔ اس طرح روئے ارض پر اعتداد کی دو شکلیں پائی جاتی ہیں:

(۱) انسان کا انسانی انفاقی سطح اور انفاقی درجے سے اعتداد۔

(۲) انسان کا دیگر مخلوقات کی انفاقی سطحوں اور ان کی انفاقی درجے سے اعتداد۔

'صعود' کی طرح اعتداد میں بھی انسان سمع، خطف، تعلم اور بحث کے ذرائع ہی استعمال کرتا ہے۔ اس طرح 'صعود' اور 'اعتداد' دونوں کا نتیجہ 'سرف' یعنی 'سحر' کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

(ب) سحر، اتحز اور کفر: اللہ رب العالمین نے قرآن میں صراحت کی ہے کہ جب ابلیس انسان کو سنت اللہ سے ہٹانے کیلئے اسے سرف اور سحر کیلئے مہمیز کرتا ہے تو وہ صرف اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ وہ انہیں اس راہ میں زیادہ سے زیادہ آگے لے جانے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ اس کے تین مدارج ہیں۔

'سحر' کے یہ تینوں مدارج درج ذیل ہیں:

(۱) پہلا مدرج: سحر یا ئحر

(۲) دوسرا مدرج: استخز اور

(۳) تیسرا مدرج: کفر

ان تینوں مدارج کی تشریح ان شاء اللہ اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔

(۷) (الف) روئے ارض پر 'سرف' کی تاریخ: اللہ تعالیٰ نے حضرات آدم وحوا علیہما السلام کو روئے ارض پر بس جانے کا حکم فرمایا اور اس کے بعد انہیں زیست کے لئے بنی آدم کی زندگی کا سارا خاکہ بتا دیا۔ چنانچہ حضرات آدم وحوا علیہما السلام اللہ تعالیٰ کے اس خاکے کے عین مطابق بس کر رہنے لگے۔ لہذا ان باتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ اس طرح فرماتے ہیں:

(۱) و قلنا اھبطوا (البقرہ:۳۶)

ترجمہ: اور ہم نے (آدم وحوا) سے کہا اترو۔

(۲) ولکم فی الارض مستقرو متاع الی حین (البقرہ:۳۶)

ترجمہ: اور تمہارے لئے ہے زمین میں مستقر اور متاع ایک مدت کیلئے

(۳) قلنا اھبطوا منھا جمیعا فا ما یا تینکم منی ھدی فمن تبع ھد ای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (البقرہ:۳۸)

ترجمہ: اور ہم نے کہا یہاں سے تم سب اکٹھے اترو اور جب ہماری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو تم میں جو اس کی پیروی کرے گا اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا نہ وہ ملول ہوگا۔

چنانچہ ان باتوں کے عین مطابق حضرات آدم وحوا علیہما السلام روئے ارض پر بس گئے۔ اس کے بعد ان سے کہا گیا:

(۱) ان ربکم اللہ الذی خلق السموات والارض فی ستہ ایام ثم استوی علی العرش یغشی الیل النھار یطلبہ حثیثا والشمس و القمر و النجوم مسخرات بامرہ الا لہ الخلق والا مر تبرک اللہ رب العالمین. ادعوا ربکم تضرعاً و خفیۃ انہ لا یحب المعتدین . ولا تفسدو ا فی الارض بعد اصلاحھا وادعوہ خوفاو طمعاً ان رحمت اللہ قریب من المحسنین . وھوالذی یرسل الریح بشرا بین یدی رحمتہ حتی اذا اقلت سحابا ثقالا سقنہ لبلد میت فانزلنا

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

بہ الماء فاخرجنا بہ من کل الثمرات کذلک نخرج الموتی لعلکم تذکرون ۔ والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ والذی خبث لا یخرج الا نکدا کذلک نصرف الایت لقوم یشکرون (الاعراف۵۸_۵۴)

ترجمہ: بے شک تمہارا رب اللہ ہے۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا چھ دن میں پھر قرار پکڑا عرش پر۔ اڑھاتا ہے رات پر دن کہ وہ اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا اور پیدا کئے سورج اور چاند اور تارے مسخر کردہ اپنے حکم سے۔ سن لو اسی کا ہے خلق اور امر بڑی برکت والا ہے اللہ رب العالمین۔ پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے بے شک وہ اعتداد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور زمین میں فساد نہ ڈالو اس کی اصلاح کے بعد اور پکارو اس کو ڈر اور توقع سے بے شک اللہ کی رحمت نزدیک ہے صرف اللہ کے لئے یکسو لوگوں سے اور وہی ہے کہ چھوڑتا ہے ہوائیں خوش خبری لانے والی رحمت سے پہلے یہاں تک کہ جب وہ اٹھا لاتی ہیں بھاری بادل تو سیراب کردیتے ہیں ہم مردہ زمین کو پھر ہم اتارتے ہیں اس بادل سے پانی پھر اس سے نکالتے ہیں سب طرح کے پھل اس طرح ہم نکالیں گے مردوں کو تاکہ تم غور کرو۔ اور جو زمین پاکیزہ ہے اس کا سبزہ نکلتا ہے اس کے رب کے حکم سے اور جو ناپاک ہے اس میں نہیں نکلتا مگر ناقص یوں پھیر پھیر کر بتلاتے ہیں ہم آیتیں شکرگزار لوگوں کو۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے روئے ارض پر زندگی اور حیات کے تعلق سے ساری منصوبہٗ ربانی کھول کر بتادی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) ان اللہ فالق الحب و النوی ' یخرج الحی من المیت و مخرج المیت من الحی ذلکم اللہ فانی یوفکون (الانعام:۹۵)

ترجمہ: بے شک اللہ پھوڑنے والا ہے دانہ اور گٹھلی نکالتا ہے مردہ سے زندہ اور نکالنے والا ہے زندہ سے مردہ یہ ہے اللہ پھر تم کدھر بہکے جاتے ہو؟

(۲) فالق الاصباح و جعل الیل سکنا و الشمس و القمر حساباً ذلک تقدیر العزیز العلیم (الانعام:۹۶)

ترجمہ: پھوڑ نکالنے والا صبح کی روشنی کا۔ اور اس نے رات بنائی آرام کو اور سورج اور چاند حساب کیلئے۔ یہ اندازہ رکھا ہوا ہے زور آور خبردار کا۔

(۳) وھو الذی جعل لکم النجوم لتھتدوا بھا فی ظلمت البر و البحر قد فصلنا الا یت لقوم یعلمون (الانعام۹۷)

ترجمہ: اور اسی نے بنا دیئے تمہارے واسطے ستارے کہ ان کے وسیلہ سے راستے معلوم کرو اندھیروں میں خشکی اور پانی کے۔ البتہ ہم نے کھول کر بیان کر دیئے پتے ان لوگوں کے جو جانتے ہیں۔

(۴) وھو الذی انشا کم من نفس واحدہ فمستقر و مستودع قد فصلنا الا یت لقوم یفقھون (الانعام:۹۸)

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا ایک شخص سے پھر ایک تو تمہارا ٹھکانا ہے اور ایک امانت رکھنے کی جگہ۔ البتہ ہم نے کھول کر سنا دیئے پتے اس قوم کو جو سوچتے ہیں۔

(۵) وھو الذی انزل من السماء ماء فاخرجنا بہ نبات کل شی فاخرجنا منہ خضرا نخرج منہ حباً متراکبا و من النخل من طلعھا قنوان دانیۃ وجنت من اعناب والزیتون والرمان مشتبھا وغیر متشابہ انظرو الی ثمرہ اذا اثمر و ینعہ ان فی ذلکم لایت لقوم یؤمنون (الانعام:۹۹)

ترجمہ: اور اسی نے اتارا آسمان سے پانی پھر نکالی ہم نے اس سے اگنے والی ہر چیز پھر نکالی اس میں سے سبزہ جس سے ہم نکالتے ہیں دانے ایک پر ایک چڑھا ہوا اور کھجور کے گابھے میں سے پھل کے گچھے جھکے ہوئے اور باغ انگور کے اور زیتون کے اور انار کے آپس میں ملتے جلتے اور جدا جدا بھی دیکھو ہر ایک درخت کے پھل کو جب وہ پھل لاتا ہے اور اس کے پکنے کو۔ ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ایمان والوں کے واسطے۔

(۶) فکلوا مماذ کراسم اللہ علیہ ان کنتم بایتہ مومنین (الانعام:۱۱۸)

ترجمہ: سو تم کھاؤ اس جانور میں سے جس پر نام لیا گیا ہے اللہ کا اگر تم کو اس کے حکموں پر ایمان ہے۔

(۷) وھو الذی انشا جنت معروشت وغیر معروشت و النخل والزرع مختلفا اکلہ والزیتون و الرمان متشابھا وغیر متشابہ کلوا من ثمرہ اذا اثمر و آتو احقہ یوم حصادہ ولا تسرفو انہ لا یحب المسرفین (الانعام:۱۴۱)

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asreralam.net

ترجمہ: اور اس نے پیدا کئے باغ جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے جاتے اور پھل کے درخت اور کھیتی الگ الگ قسم کے ہیں ان کے پھل اور پیدا کیا زیتون اور انار ایک دوسرے کے مشابہ اور جدا جدا بھی۔ کھاؤ ان کے پھل میں سے جس دن پھل لاویں۔ اور ادا کرو ان کا حق جس دن ان کو کاٹو اور سرف نہ کرو۔ بے شک اس (اللہ) کو وہ لوگ پسند نہیں جو سرف کرتے ہیں۔

(۸) ومن الانعام حمولة و فرشا كلوا مما رزقكم الله ولا تتبعوا خطوات الشيطن انه لكم عدو مبين (الانعام:۱۴۲)

ترجمہ: اور پیدا کئے مواشی بوجھ اٹھانے والے اور زمین سے لگے ہوئے کھاؤ اللہ کے رزق میں سے اور مت چلو شیطان کے قدموں پر بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اگر اس پورے ماڈل پر غور کیا جائے تو تین باتوں کا علم ہوتا ہے:

(۱) روئے ارض پر اللہ تعالی نے آدم وحوا اور بنی آدم کیلئے حیات یعنی مستقر، متاع اور مقصد کیلئے کیا نظم فرمایا تھا؟ اور اس کا کون سا درجہ رکھا تھا؟ یہ وہی درجہ ہے جس کا ذکر آیات:

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون ما اريد منهم من رزق وما اريد ان يطعمون ان الله هو الرزق ذوالقوة المتين (الذاریات:۵۶۔۵۸)

(ترجمہ: اور میں نے جو خلق کئے ہیں جن اور آدمی سو اپنی عبادت کو۔ میں نہیں چاہتا ان سے روزینہ اور نہیں چاہتا کہ مجھ کو کھلائیں۔ اللہ جو ہے وہی ہے رزاق زور آور مضبوط۔)

میں کیا گیا ہے۔

حضرات آدم وحوا اسی سطح پر تھے۔ اگر آج پوری بنی نوع آدم اسی سطح پر جما ہوتا تو روئے ارض کی کروڑوں مخلوقات کی طرح بنی آدم کی پوری آبادی کو اللہ بغیر 'کسب' کے روزانہ زندگی کی ہر ضرورت پوری کراتا۔

لیکن اللہ تعالی کی جانب سے سب کچھ سمجھانے' اپنی ساری منصوبہ بندی کو واضح کر کے بیان کرنے، تمام خطرات سے آگاہ کرنے اور مقصد تک پہنچنے کی آسان ترین راہ بتانے کے باوجود فساد برپا ہو ہی گیا۔ یہی وہ فساد ہے جو حضرات آدم وحوا کے زمین پر آنے اور حضرت نوح کے مبعوث کئے جانے کے مابین برپا ہوا۔ اسی لئے سورۃ الاعراف میں اس تنبیہ فساد کے فوراً بعد

حضرت نوح کے مبعوث کئے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پورا عہد کئی ہزار سالوں پر مشتمل ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ہزاروں سالوں میں روئے ارض پر آخر ہوا کیا تھا؟ لیکن اس حادثہ کو سمجھنے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ روئے ارض کی صورتحال حادثہ کے وقت کیا تھی؟

روئے ارض کی صورتحال: اس وقت روئے ارض پر جو صورتحال تھی اسے اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) روئے ارض پر غذا کی صورتحال:

اللہ تعالیٰ نے آدم وحوا اور بنی آدم کیلئے بنیادی طور پر تین غذائیں پیدا کیں:

(۱) پانی
(۲) جسم
(۳) جسم کا پھل

پانی: روئے ارض پر حیات کیلئے بنیادی چیز پانی ہے۔ فی الواقع جسم اور جسم کا پھل اسی پانی سے پیدا کئے گئے

جسم: جسم کے بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ نے کئی اقسام پیدا کئے جو درج ذیل ہیں:

(۱) نباتات کا جسم۔ تنا، جڑ، ڈنٹھل اور پتی
(۲) حیوانات کا جسم۔
　(۱) چرند کا جسم۔ بکری، اونٹ، گائے، ہرن وغیرہ کا گوشت
　(۲) پرند کا جسم: مرغ، تیتر وغیرہ کا گوشت
　(۳) مائی حیوانات کا جسم۔ مچھلی وغیرہ کا گوشت

جسم کا پھل یعنی پیداوار:

(۱) نباتات کا پھل۔ پھل، پھول، گٹھلی، پھول کی پتی، گوند وغیرہ
(۲) حیوانات کا پھل۔ دودھ، شہد وغیرہ
(۳) انسان کا پھل۔ ماں کا دودھ۔

(۲) روئے ارض پر لباس کی صورت حال:

(۱) نباتات سے حاصل ہونے والے لباس: پتیوں سے بنا لباس، ریشوں سے بنا لباس

وغیرہ

(۲) حیوانات سے حاصل ہونے والے لباس: چمڑے سے بنا لباس، ہڈیوں سے بنا لباس وغیرہ

(۳) روئے ارض پر رہائش کی صورتحال:

(۱) نباتات سے حاصل ہونے والی رہائش: لکڑی سے بنی رہائش، پتیوں سے بنی رہائش وغیرہ

(۲) جمادات سے حاصل ہونیوالی رہائش: غار، پتھروں سے بنی رہائش، مٹی سے بنی رہائش وغیرہ

(۳) حیوانات سے حاصل ہونے والی رہائش: چمڑے سے بنی رہائش وغیرہ

(ج) روئے ارض پر 'سرف' کا آغاز:

اگر دقت نظر سے غور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے روئے ارض پر انسانوں کیلئے زیست کا وہی ماڈل پسند فرمایا تھا جسے 'من وسلوی ماڈل' (Man&Salwa Model) کہا جاتا ہے یا یوں کہا جائے کہ من وسلوی ماڈل دراصل اسی اولین ماڈل کی بازیافت تھا جو روئے ارض پر اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کیلئے قائم فرمایا تھا جسے بنی اسرائیل نے رد کر دیا۔ اس 'من وسلوی ماڈل' کے بنیادی امور درج ذیل تھے:

(۱) غذا، لباس اور رہائش کی ضروریات قدرت کی بلا قیمت دی گئی نعمتوں سے پوری ہوں۔

(۲) غذا، لباس اور رہائش کی ضروریات کی تکمیل کیلئے معیار مطلوب صرف جارحہ متصل مثلاً ہاتھ، پاؤں، پیٹھ یا زیادہ سے زیادہ جارحہ منفصل مثلاً لاٹھی، پتھر، لکڑی وغیرہ کے بنے جارحہ سے ہو۔

(۳) غذا، لباس اور رہائش کی ضروریات کیلئے موسمی صورتحال مثلاً ٹھنڈک میں گرمی، گرمی میں ٹھنڈک کیلئے قدرتی صورتحال سے تکمیل ہو مثلاً جاڑے میں دودھ کا تھنوں سے گرم گرم نکلنا اور کنویں یا تالاب کے پانی کا گرم نکلنا، یا زیادہ سے زیادہ دن کی دھوپ میں یا پتھروں پر دودھ کا گرم کیا جانا یا چمڑے میں جسم کا گرم کیا جانا۔

ان تمام امور کیلئے قدرت نے روئے ارض پر پورا پورا نظم فرمایا تھا۔ اور ان میں سے کسی

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asarulalam.net

شئے کے لئے 'کسب' کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ غور کیا جائے کہ انسان کے علاوہ ساری مخلوقات روئے ارض پر اسی ماڈل پر اب بھی قائم ہیں۔ انسان بھی روئے ارض کی مخلوق ہوتے ہوئے اب ان سے بالکل مختلف ہو گیا ہے اور اس کی زندگی زیادہ سے زیادہ مصنوعی اور کم سے کم فطری رہ گئی ہے۔

روئے ارض پر 'سرف' کا آغاز فی الواقع ابلیس کی تحریک پر ہوا۔ یہ ابلیس ہی کی کوشش تھی کہ روئے ارض پر علم طبیعیات (Physical Science) اور علم ہنر (Technology) کا پھر اسی طرح آغاز ہوا جس طرح الجنتہ میں ہوا تھا۔ اس بار اس کا آلۂ کار حضرات آدم وحوا نہیں بلکہ ان کی پہلی اور عنداللہ ناجائز و نامقبول اولاد قابیل بنی۔

قابیل کا جرم: ابلیس نے جو سب سے بڑا فساد روئے ارض پر ڈالا وہ یہ تھا کہ اس نے قابیل کو اس بات کیلئے اکسایا کہ وہ مذکورہ 'من وسلوی ماڈل' کو درہم برہم کر دے۔ چنانچہ قابیل کو اس تعلق سے ابلیس نے مخصوص ہدایات دیں اور اسے اکتشافی علم' اکتشافی ہنر اور اکتشافی عمل کی طرف راغب کیا اور انفاقی علم' انفاقی ہنر اور انفاقی عمل کو خیر آباد کہنے کیلئے متحرک کیا۔ چنانچہ قابیل نے روئے ارض پر اسی گناہ کا ارتکاب کیا جو حضرات آدم وحوا سے الجنتہ میں ہوا تھا۔

قابیل نے انفاقی علم' انفاقی ہنر اور انفاقی عمل کو خیر آباد کہہ دیا جس پر حضرات آدم وحوا اور ان کی دیگر ذریات عمل پیرا تھیں۔ اور پھر قابیل نے روئے ارض پر علم طبیعیات (Physical Science) اور علم ہنر (Technology) کو توسیع دینے کا براہ راست اقدام کیا۔

(۱) سرف کا آغاز: چنانچہ قابیل نے سب سے پہلا فساد غذا اور اس کے حصول میں سرف کے آغاز سے کیا۔ اس نے 'من وسلوی ماڈل' کی طرح از خود حاصل ہونے والی غذا کو 'ترجیحی غذا' (Preferred Food) میں بدلنا چاہا۔ اسے اب وہ غذائیں مطلوب نہیں تھیں جو قدرت از خود روئے ارض پر پیدا کر رہی تھی بلکہ اس نے چاہا کہ روئے ارض پر اپنی خواہش اور پسند کے مطابق غذا اگائے۔ اور اس طرح قابیل نے 'کاشت' کا آغاز کیا۔ 'کاشت' ایک 'ترجیحی غذا' کا حصول تھی۔ جو 'من وسلوی ماڈل' کی ضد اور اسے فساد زدہ کر دینے والی تھی۔ اس کیلئے قابیل نے 'متصل جارحہ' مثلاً ہاتھ اور منفصل جارحہ مثلاً لاٹھی کے بجائے آلہ یا اوزار (Instrument) یعنی ہل اور جوئے بنائے۔ اور اس طرح علم ہنر (Technology) کو جارحہ (Tool) کی

prepared by M. Aamir Mehmood
www.aamiraalam.net

سطح سے آلہ و اوزار (Instrument) کی سطح پر توسیع دے دی۔

اس طرح روئے ارض پر بیک وقت دو بنیادی توسیع ہوئے جو دو بنیادی فسادات تھے۔ پہلا فساد تھا زراعت اور دوسرا صناعت۔ اس کی ایک دوسری ترتیب بھی ممکن ہے یعنی پہلا فساد تھا صناعت اور دوسرا فساد تھا زراعت۔ یعنی پہلے ہل بنائے گئے پھر کاشت ہوئی۔

روئے زمین کے تین بنیادی توسیع اور فساد: روئے ارض پر پوری انسانی تاریخ میں آدم و حوا کے بسائے جانے سے لیکر آج تک جب کہ انسان خلائی دور میں ہے خواہ اس کے کتنے ہی دائرے پورے ہوئے ہوں بنیادی طور پر صرف تین توسیعات ہوئیں اور یہی تین توسیعات تین بنیادی فساد ہیں: آج ترقی یافتہ معاشرے میں خواہ کروڑوں کام ہو رہے ہوں اور ان کی کتنی ہی خصوصیات (Specialisation) ہوں وہ سب بنیادی طور پر انہیں تین توسیعات کے ذیل میں ہیں۔ یہ تین توسیعات درج ذیل ہیں:

(۱) صناعت یعنی (Manufecturing)
(۲) زراعت یعنی (Agriculture) اور
(۳) تجارت یعنی (Exchange)

بعض صحائف کے مطابق قابیل ہی پہلا 'صناع' (Manufecturer) اور پہلا زراع (Agriculturist) تھا۔ ممکن ہے وہی پہلا تاجر (Exchanger) بھی ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ اس پہلے فساد کے بعد دوسرے فسادات کا آغاز ہوا اور اس بار یہ فساد بیک وقت زندگی کے تینوں شعبوں کو محیط ہو گیا۔ یہ تینوں فسادات تین شعبوں سے متعلق تھے جن کے جلو میں علم طبیعیات اور علم ہنر کے فسادات کا سلسلہ جلوہ گر ہوتا چلا گیا۔

(۱) طباخت (Cooking): یہ دوسرے مرحلے کا فساد ہے جس کا تعلق غذا کے حصول سے آگے جا کر 'فطری اور مفت اکل و شرب (Intake) کے بجائے مصنوعی اور ترجیحی اکل و شرب (Artificial & Preferred Intake) سے ہے۔ چنانچہ طباخت (Cooking) کا فساد شروع ہوا جس نے علم ہنر (Technology) میں 'آگ بنانے' (To get fire) کا آغاز کیا۔ آگ بہت بڑا آلہ یا اوزار (Instrument) تھا جس کا حصول کیا گیا۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.azranialam.net

(۲) حیاکت (Weaving): یہ بھی دوسرے مرحلے کا فساد ہے جس کا تعلق لباس کے حصول سے آگے جا کر 'فطری اور مفت ملبوس' (Natural & Free Garments) سے آگے جا کر 'مصنوعی اور ترجیحی ملبوس' (Artificial & Preferred Garments) سے ہے۔ چنانچہ حیاکت (Weaving) کا فساد شروع ہوا۔ جس نے علم ہنر (Technology) میں انسان کو جارحہ سے آگے آلہ تک پہنچا دیا۔

(۳) عمارت (Building): یہ بھی دوسرے مرحلے کا فساد ہے جس کا تعلق رہائش کے حصول سے آگے جا کر فطری اور مفت رہائش (Natural & Free Abode) سے آگے جا کر 'مصنوعی اور ترجیحی رہائش' (Artificial & Preferred Abode) سے ہے۔ چنانچہ عمارت (Building) کا فساد شروع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ قابیل ہی دراصل وہ پہلا شخص ہے جس نے اس فساد کا آغاز کیا۔ مشہور ہے کہ قابیل پہلا عمار (City-Builder) تھا۔

(۸) (الف) سنت کی حقیقت: سنت نبوی ﷺ 'سنت قائمہ' کی آخری، مکمل اور جامع ترین شکل یا بالفاظ دیگر 'سنت قائمہ' پر قائم کردہ نمونہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روئے ارض پر 'سنت قائمہ' کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رسولوں اور انبیاء کی روئے ارض پر وہ سنت جو 'سنت اللہ' کی عکس اور اس پر پورا پورا عمل کرنے کا نمونہ ہے دراصل وہی 'سنت قائمہ' ہے۔ اس سنت کی تین بنیادی خصوصیات ہیں:

(۱) حسنہ: یہی سنت 'سنت حسنہ' ہے۔ یعنی حقیقت، عمل اور مقصد برآری کے اعتبار سے یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔

(۲) سمحۃ: یہی سنت 'سنت سمحۃ' ہے۔ یعنی یہی طریقہ اپنی حقیقت، اپنے عمل درآمد میں آسانی اور مقصد برآری میں یقینی ہونے کے اعتبار سے سب سے بہتر ہے۔

(۳) حنیفیۃ: یہی سنت 'سنت حنیفیۃ'؛ یعنی یہی طریقہ اپنی حقیقت، اپنے عمل درآمد اور اپنی مقصد برآری کے اعتبار سے 'سنت اللہ' کا بالکل عکس اور مثل ہے۔

(ب) اقامت سنت: اللہ کے تمام رسولوں کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد 'اقامت سنت قائمہ' ہے۔ غور کیا جائے تو اقامت سنت قائمہ دراصل اس 'سنت اللہ' کی جس کو ابلیس کی تحریک اور اس کے نتیجے میں انسانوں کی گمراہی یا غفلت نے روئے ارض پر منہدم کر دیا

www.booksube.net
prepared by M. Aamir Mehmood

ہے، از سر نو بحالی اور اس کا از سر نو اجراء اور رواج ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام انبیاء اور بالخصوص رسول انبیاء کی بنیادی ذمہ داری روئے ارض پر اس 'ماڈل' پر انسانوں کو از سر نو قائم کر دینا ہی ہے جس پر بنی نوع آدم اس روئے ارض پر بسائے گئے تھے اور پھر اسی منہج پر ان کی قیادت کرنا تا کہ اس مقصد کے حصول کی صورت پیدا ہو جو اس نوع آدم کا فرض منصبی ہے۔ یہی منہدم شدہ وہ 'ماڈل' ہے جس کی از سر نو اقامت کی جدوجہد حضرت نوح علیہ السلام نے فرمائی، یہی وہ 'ماڈل' ہے جس کی بحالی کی کوشش حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہی وہ کوشش تھی جسے تاریخ 'من وسلویٰ ماڈل' کے نام سے جانتی ہے۔ اور یہی وہ اکمل واحسن بحالی تھی جو نبی آخر الزماں ﷺ کے ذریعہ سنت نبوی ﷺ کی صورت میں انجام پزیر ہوئی۔ سنت نبی ﷺ جو عہد نبوی تا قیامت 'سنت قائمہ' کی سب سے جامع شکل ہے دراصل روئے ارض پر برپا ہر طرح کے 'سرف'، 'بحر' اور اسکی ہر توسیع کا خاتمہ اور اس کی جگہ 'سنت اللہ' کی بحالی یعنی علم، ہنر اور عمل کی انسانی انفاقی سطح اور انفاقی درجہ پر بحالی کا دوسرا نام ہے۔

اس مقام پر دو سوالات قابل بحث ہیں:

(۱) پہلا سوال: 'مدون فقہ' اور 'مدون حدیث' سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلاں عمل سنت نبوی ہے اور فلاں عمل سنت نبوی نہیں ہے مثلاً مسواک کرنا، داہنے ہاتھ سے کھانا کھانا، اور اسی طرح دیگر سینکڑوں امور جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سنت نبوی ﷺ ہیں۔ چنانچہ محدثین کرام نے ایسی احادیث کو 'سنن' کے نام سے جمع فرمایا ہے۔ اہل فقہ اسلامی اس سے آگے جا کر 'حکم' کی تحقیق کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مثلاً فلاں عمل سنت نہیں ہے۔ محدثین کرام تو صرف اس پر حصر کرتے ہیں کہ فلاں عمل 'سنت نبوی ﷺ' ہے لیکن 'اہل فقہ اسلامی' تو اس سے آگے جا کر یہ بھی حکم لگاتے ہیں کہ فلاں عمل سنت نبوی ﷺ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے جا کر وہ یہ بھی 'حکم' فرماتے ہیں کہ فلاں عمل سنت نبوی کے کس درجہ میں ہے یعنی فلاں عمل 'سنت موکدہ' ہے اور فلاں 'سنت مستحبہ'۔ آخر ان کی کیا حقیقت ہے؟

ان کی حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ہی نقطہ ہائے نظر 'سنت قائمہ' اور اس کی جامع ترین شکل اور آخری نمونہ۔ آنحضور ﷺ کی سنت نبوی ﷺ کی اصلی صورت کو مسخ کرنے والے ہیں۔ محدثین کرام کا ذکر تو بہر حال بعد میں آنا چاہئے اس لئے کہ 'تدوین حدیث' 'تدوین فقہ' کے بہت

بعد کا عمل ہے۔ پھر ان محدثین کے ذریعہ سنت کے 'مسخ' کرنے کا عمل کمتر درجہ کا ہے۔ ان سے یہ کام اس طرح ہوگیا کہ انہیں جو روایتیں ملیں اس کی انہوں نے تبویب و تدوین کردی۔ آنحضور ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے زمانے کی دوری اور ان سے 'فہم دین' کے اخذ کی راہ میں پیدا ہوجانے والی معنوی فصل کے سبب بہت سے امور دین میں محدثین کرام ان روایتوں کی کنہہ تک نہ جا سکے اور اسی لاعلمی میں روایت کی موجودہ ترتیب قائم کردی۔ چنانچہ ایک جانب حقیقت سے لاعلمی اور دوسری جانب حقیقت کو مترشح کرنے والی اور ان پر مبنی روایتوں کو ترتیب دینے میں جو ادارتی عمل ان سے سرزد ہوا وہ بعض اوقات 'سنت نبوی' ﷺ کی شکل بدل دینے والا بن گیا۔ اس کو مزید مسخ کرنے کی ذمہ داری 'وضع حدیث' کی سازش پر بھی عاید ہوتی ہے۔ اس طوفان نے محدثین میں موجود صحیح روایتوں کو من و عن دانتوں سے پکڑنے اور ان پر حصر کرنے اور موضوع روایتوں کو رائج نہ ہونے دینے کی وہ صورتحال پیدا کردی جس سے وہ شکل بن گئی جو بالآخر چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں محدثین کے یہاں باضابطہ راسخ صورت میں پائی جاتی ہے۔

لیکن جہاں تک 'اہل فقہ اسلامی' کا معاملہ ہے تو ان کا عمل تو سرا سر 'سنت' کی شکل بدل دینے بلکہ اس کو تلپٹ کردینے والا تھا۔ خصوصاً اس حالت میں کہ اس کی تدوین اس حالت میں ہوئی کہ ابھی احادیث کا ایک بھی جامع ذخیرہ مدون نہیں ہوسکا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کہنا کہ تدوین فقہ کرتے وقت اہل فقہ کے پاس یہ پورا ذخیرۂ احادیث موجود تھا خلاف واقعہ بات ہوگی اگر ایسا ہی تھا تو لازماً اس صورت میں یہ بھی ماننا ہوگا کہ اس ذخیرۂ احادیث کے غث و سمین کی چھان پھٹک بھی ہوگئی ہوگی۔ یعنی پہلے (۱) ذخیرۂ احادیث کا جمع ہونا (۲) پھر ان کی چھان پھٹک ہونا اور تب کہیں جاکر (۳) تیسرے مرحلے میں ان کی بنیادوں پر تدوین فقہ کا عمل ہونا تسلیم کرنا ہوگا۔ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو سن 140 ہجری کے بعد امام بخاری متوفی 256 ہجری، امام مسلم متوفی 261 ہجری، امام ترمذی متوفی 279 ہجری اور ابن ماجہ متوفی 273 ہجری تک کس کام میں لگے تھے؟ اور اس سے زیادہ بڑی بات یہ کہ کیوں لگے تھے؟ لیکن سب سے اہم بات یہ کہ ایسا وہ ایک کمرے میں بیٹھ کر یعنی (Table-work) کے بطور کیوں نہیں کررہے تھے اور اس کے بجائے قریہ قریہ، شہر شہر ملک ملک جا کر جمع حدیث کا کام انجام دینے پر کیوں مجبور تھے؟ آخر ایسا کیوں تھا؟

واقعہ یہ ہے کہ محدثین کرام اپنے خلوص کے باوجود بوجوہ یہ جاننے سے قاصر تھے کہ وہ کیا 'سنت اللہ' تھی جس پر روئے ارض میں 'سنت قائمہ' قائم ہوئی اور جس پر ہر زمانے میں انبیاء کرام اور صلحاء عمل پیرا رہے اور جس کے انہدام کے بعد اسے ازسرنو قائم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے رسول اپنی سنت کے ساتھ آتے رہے اور جسے نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے ازسرنو اور احسن واکمل شکل میں اپنی 'سنت نبوی' صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ قیامت تک کے لئے قائم فرمادیا۔

اس کے برخلاف 'فقہا کرام' کا عمل تو ایک سوچا سمجھا عمل معلوم ہوتا ہے ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے دراصل اس بات کی کوشش شروع کی کہ وہ 'سنت قائمہ' جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی 'سنت نبوی' صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں قائم فرمادی ہے ازسرنو منہدم ہوجائے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

ان دونوں صورتحال کا ہی وہ نتیجہ تھا کہ امت میں 'سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم' یعنی مکمل سنت قائمہ کا فہم جاتا رہا۔ اگر لوگ اس 'سنت قائمہ' کو جانتے ہوتے جس کی ازسرنو اقامت اور تکمیل کے لئے نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر 'سنت نبوی' صلی اللہ علیہ وسلم قائم فرمائی تھی تو تدوین حدیث میں وہ صورتحال پائی نہ جاتی جواب ہے۔ اگر لوگ اس سنت قائمہ' کو جانتے جس کی اقامت کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عمل کیا جس سے وہ 'سنت نبوی' قائم ہوئی جسے آج سنت کہا جاتا ہے تو لوگ یہ بھی جانتے کہ:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسواک کیوں کرتے تھے؟ یعنی مسواک کرنا سنت نبوی ہے لیکن وہ کون سی 'سنت قائمہ' ہے جس کی ازسرنو اقامت، بحالی یا رواج کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کرنے کی سنت قائم فرمائی؟

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'ہل' دیکھ کر کیوں فرمایا کہ جس گھر میں یہ داخل ہو وہاں 'ذل' آجاتا ہے؟ یعنی وہ کیا 'سنت قائمہ' ہے جس کی بحالی کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا؟

(۳) رسول ﷺ نے کیوں فرمایا کہ جس گھر والوں میں کھجور ہو وہ گھر والے بھوکے نہیں؟

(۴) رسول ﷺ نے کیوں فرمایا کہ بہترین سالن سرکہ ہے؟

www.booksubes.net
prepared by M. Aamir Mehmood

(۵) رسول ﷺ کے عہد مین ریت گھڑی، دھوپ گھڑی، آبی گھڑی حتیٰ کہ میکانکی گھڑی اور کلینڈر بھی رائج تھے۔ پھر وہ کون سی سنت قائمہ تھی جس کی بحالی اور اقامت کے لئے آپ نے طلوع، زوال، فئے، خیط الابیض، خیط الاسود، اور غسق اور اھلۃ کی اور رویت کی سنت نبوی قائم فرمائی۔

(۶) آپ ﷺ کے عہد میں میزائل مثلاً منجنیق، آرمرڈ کار اور ٹینک مثلاً طرح طرح کے رتھ رائج تھے۔ وہ کون سی سنت قائمہ تھی جس کی اقامت کے لئے آپ نے غزوۂ احزاب میں صرف خندق کھودنے اور موجود ہتھیاروں کو استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور نہ آلات حرب کی جنگی پیمانے پر تیاری کی حالانکہ آپ کا کم از کم ایک بار یعنی غزوۂ تبوک میں عملاً مقابلہ ایک سوپر پاور (Super Power) سے ہوا تھا، نہ ان کی خرید کا سامان کیا۔ حتیٰ کہ جب 'ذات انواط' کو دیکھ کر بعض اصحاب نے اس کی خواہش کی تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم لوگ بھی اسی طرح کہنا چاہتے ہو جیسا موسیٰ کی قوم نے موسیٰ سے کہا تھا؟

(۷) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سر نو بحالی کے لئے آپ ﷺ نے گھوڑے کی پیشانی کے بال پکڑ کر فرمایا: اس میں برکت ہے۔ اور اس کے بول و براز میں تمہارے لئے اجر ہے؟

(۸) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سر نو اقامت کے لئے آپ نے فرمایا کہ سات جگہوں پر نماز نہ پڑھو اور ان میں دو مقامات تھے: بیت اللہ کی چھت کے اوپر اور ارض بابل؟

(۹) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سر نو اقامت کے لئے آپ نے فرمایا: کہ اگر تم لوگ نکل جانے پر ہی مجبور ہو تو زمین حبش کی طرف نکل جاؤ۔ اور اسکے اسباب میں ایک وجہ یہ تھی کہ وہ ارض صدق ہے؟

(۱۰) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سر نو بحالی اور اقامت کے لئے آپ نے فرمایا: الفطرہ پانچ ہیں، ختنہ کرنا، موئے زیر ناف صاف کرنا، مونچھیں پست کرنا، ناخن کاٹنا اور بغلوں کے بال اکھاڑنا؟

(۱۱) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سر نو بحالی اور اقامت کے لئے آپ نے قزع (ٹیک چھوڑنے) سے منع کیا۔ مخنثین مرد (المخنثین من الرجال) اور مترجلات عورت (المترجلین من النساء) پر اور اسی طرح مشتبھین من الرجال بالنساء اور المتشبھات من النساء بالرجال پر لعنت فرمائی؟

(۱۲) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سرنو بحالی اور اقامت کے لئے آپ ﷺ نے الواصلہ، المسترصلة، الواشمة، اور المستوشمه پر لعنت فرمائی؟

(۱۳) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سرنو اقامت اور بحالی کے لئے آپ ﷺ نے الواشمات، المستوشمات، المتنمصات، المتفلجات للحسن کو خلق اللہ میں تبدیلی (المغیرات خلق اللہ) قرار دیکران پر لعنت فرمائی؟

(۱۴) وہ کیا سنت قائمہ تھی جس کی از سرنو اقامت اور بحالی کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ گرگٹ الفویسق ہے؟

(۱۵) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سرنو اقامت اور بحالی کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمان کا بہترین مال چند بکریاں ہوں گی؟

(۱۶) وہ کیا سنت قائمہ تھی جس کی از سرنو اقامت اور بحالی کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا: پانچ فواسق ہیں۔ انہیں حرم شریف میں بھی قتل کر دیا جائے۔ الفارہ، العقرب، الحدیا، الغراب، الکلب العقور؟

(۱۷) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سرنو اقامت و بحالی کے لئے ایک طرف تو فتح مکہ کے دن آپ ﷺ نے فرمایا کہ آج کے دن پہلی بار اور آخری بار 'حرم' مجھ پر 'حلال' کر دیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف آپ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو 'الیوم یوم الملحمة' (آج خون بہانے کا دن ہے) کہنے پر ان کے ہاتھوں سے جھنڈا لے لیا اور فرمایا 'الیوم یوم المرحمة' (آج مرحمت کا دن ہے)؟

(۱۸) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سرنو اقامت و بحالی کے لئے آپ ؐ نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا: اللہ تعالیٰ تم کو ایک قمیص پہنائے گا۔ لوگ تم سے مطالبہ کریں گے کہ یہ قمیص اتار دو۔ اے عثمان یہ قمیص نہ اتارنا خواہ اس میں تمہاری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اور اے عثمان آدم کے بیٹے کی طرح عمل کرنا؟

(۱۹) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سرنو اقامت و بحالی کے لئے آپ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا: اے علی! لوگ تم کو قتل کر دیں گے۔ تم صبر کرنا؟

(۲۰) وہ کیا 'سنت قائمہ' تھی جس کی از سرنو اقامت و بحالی کے لئے آپ ؐ نے حضرت رافع

رضی اللہ عنہ کی اس وقت تنبیہ فرمائی جب حضرت رافع کے ذریعہ بکری کے دونوں دست ہانڈی سے نکال کر آنحضور ﷺ کو پیش کرنے اور آپ ﷺ کے ذریعہ دونوں دست نوش فرمالینے کے بعد مزید دست کا مطالبہ کرنے پر حضرت رافع نے فرمایا: اے اللہ کے رسول بکری میں دو ہی دست ہوتے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: اے رافع اگر تم نے یہ نہ کہا ہوتا اور میرے کہنے پر ہانڈی سے نکالتے جاتے تو جتنے دست چاہتے اتنے دست نکلتے؟

(۲۱) وہ کیا ’سنت قائمہ‘ تھی جس کی از سر نو اقامت و بحالی کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم مجھے دو چیزوں کی ضمانت دو جو تمہارے دونون جبڑوں کے درمیان اور دونوں جانگھوں کے درمیان ہے تو میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں؟

(۲۲) وہ کیا ’سنت قائمہ‘ تھی جس کی از سر نو اقامت و بحالی کے لئے آپ ﷺ نے ظہر یا عصر میں سے کوئی نماز دو رکعت پڑھائی اور جب ذوالیدین نامی شخص نے پوچھا اے اللہ کے رسول کیا آپ بھول گئے یا آپ نے قصر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہ میں بھولا نہ نماز میں کمی ہوئی؟ اور پھر آپ نے نماز پوری کی اور سجدہ کیا پھر سر اٹھا کر تکبیر کہی پھر تکبیر کہی اور سجدہ کیا۔ پھر سر اٹھا کر تکبیر کہی؟

(۲۳) وہ کیا ’سنت قائمہ‘ تھی جس کی از سر نو اقامت و بحالی کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا: دیکھو قیامت سے پہلے ایسے فتنے برپا ہونگے جیسے اندھیری رات کا ٹکڑا۔ آدمی مومن کی طرح صبح کرے گا تو کافر کی طرح شام اور مومن کی طرح شام کرے گا تو کافر کی طرح صبح۔ اس میں بیٹھا ہوا کھڑے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا دوڑنے والے سے۔ پس تم اپنی کمانیں توڑ ڈالنا اور تانت کاٹ ڈالنا؟

یہی وجہ ہے کہ جب ’خلافت علی منہاج النبوۃ‘ یعنی خلافت راشدہ کے بعد اللہ کے سب سے آخری رسول اور تمام رسولوں کے قائد، نبی آخر الزماں ﷺ کی سب سے بڑی سنت نبوی ﷺ یعنی سب سے بنیادی ’سنت قائمہ‘...... ’الحکم‘ یعنی ’خلافت ملک اللہ‘ ختم کرنے اور اسے منہدم کر کے تقویٰ کے بجائے موروثی بنانے کا آغاز ہوا تو چند افراد کو چھوڑ کر بقیہ لوگ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ روئے ارض پر کتنی بڑی سنت نبوی ﷺ کا خاتمہ کر کے کس عظیم الشان ’سنت قائمہ‘ کا خاتمہ کیا جا رہا ہے؟

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

اگر سنت نبوی ﷺ کا فہم اور اس کی روشنی میں 'سنت قائمہ' کا فہم امت میں باقی رہتا تو جس وقت عبدالملک بن مروان خلیفۂ اموی اور ہارون الرشید خلیفۂ عباسی مسلمانوں میں اپنی فیاضی اور آنحضور ﷺ سے اپنے دلی تعلق کا ثبوت دینے کے لئے مسجد نبوی کی عظیم الشان تعمیر کروا رہے تھے تو اس وقت علماء کرام اور بطور خاص فقہاء کرام نے ان سے پوچھا ہوتا کہ سنت نبوی ﷺ کی یہ خلاف ورزی کیوں کی جا رہی ہے جو دراصل اس چیز کو ڈھا رہی ہے جس کی اقامت کے لئے نبی آخرالزماں تشریف لائے تھے؟ یہاں ایک مخصوص سوال امت میں پائے جانے والے 'فہم سنت' کے تعلق سے کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ مخصوص سوال دراصل کئی سوالات کا مجموعہ ہے جو درج ذیل ہے:

(۱) کیا عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں فن تعمیر پایا ہی نہیں جاتا تھا؟

(۲) کیا آپ ﷺ قیصر و کسریٰ کے محلات اور اس کے ایک منزلہ، دو منزلہ، سہ منزلہ عالیشان تعمیراتی نمونوں سے واقف نہ تھے؟

(۳) کیا ایسے عالیشان خوبصورت تعمیرات بنانے والے عالم عرب میں پائے نہیں جاتے تھے؟

(۴) کیا وفات نبوی ﷺ تک اہل ایمان مسلسل اتنے مفلوک الحال رہے کہ وہ مسجد نبوی کو بہتر، عالیشان نہ سہی مگر ایک خوبصورت تعمیری عمارت میں تبدیل کرنے کے اہل نہ تھے؟

(۵) کیا اس وقت اہل ایمان کی مرکزیت، ہمہ وقت آمد و رفت اور ضرورت کی مسجد نبوی کے علاوہ کوئی اور جگہ تھی؟

(۶) کیا اس وقت ایسی مرکزی جگہ اور مقدس مرکز کی تعمیر اہل ایمان کی ترجیحات میں نہ تھیں؟

(۷) کیا مسجد کی تعمیر معیوب بات تھی؟

اگر یہ سب درست نہیں تو پھر اس حدیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ کیا ہے؟ وہ کیا سنت قائمہ تھی جس کی اقامت و بحالی کے لئے آپ ﷺ کوشاں تھے اور 'سنت نبوی' کی اقامت فرما رہے تھے:

عن ابی سلمہ قال سالت اباسعید الخدری فقال جاءت سحابة

فمطرت حتی سال السقف وکان من جریدالنخل فاقیمت الصلوۃ فرایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسجد فی الماء والطین حتی رایت اثرالطین فی جبھتہ (رواہ البخاری کتاب الآذان)

ترجمہ: حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے، انہوں نے کہا میں نے ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے پوچھا: انہوں نے کہا: ایک ابر کا ٹکڑا آیا۔ وہ برسا۔ یہاں تک کہ مسجد کی چھت بہنے لگی۔ وہ کھجور کی شاخوں کی تھی ہی۔ پھر نماز کی تکبیر ہوئی۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ کیچڑ پانی میں سجدہ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ کیچڑ کا نشان آپ کی مبارک پیشانی میں میں نے دیکھا۔

(۲) دوسرا سوال: دوسرا سوال محدثین کرام اور فقہاء کرام کے فہم سنت نبوی کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً امام مسلم علیہ الرحمہ نے مسلم شریف میں باضابطہ باب باندھا ہے: **بـــاب وجـوب امتثال ماقاله شرعا دون ماذكره من معائش الدنيا على سبيل الرای۔** (باب آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو شرعاً حکم دیں اس پر چلنا واجب ہے اور جو بات دنیا کی معاش کی نسبت اپنی رائے سے فرمادیں اس پر چلنا واجب نہیں)

اس ذیل میں امام صاحب نے تین حدیثیں درج کی ہیں چنانچہ:

(۱) پہلی حدیث میں کہا گیا: **فانی انما ظننت ظناً فلا تواخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئا فخذوا بہ فانی لن اکذب علی اللہ عزوجل** (ترجمہ: میں نے تو ایک خیال کیا تھا۔ تو مت اختیار کرو میرے خیال کو لیکن جب میں اللہ کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو اختیار کرو۔ اسلئے کہ میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنے والا نہیں)

(۲) دوسری حدیث میں کہا گیا: **فقال انما انا بشر واذا امرتکم بشیٔ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیٔ من رأی فانما انا بشر** (ترجمہ: آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک میں آدمی ہوں۔ جب میں کسی بات کا جس کا تعلق تمہارے دین سے ہے حکم کروں تو اسے اختیار کرو اور جب میں کسی بات کا جس کا تعلق میری رائے سے ہے حکم کروں تو (تم کو اختیار ہے کرو یا نہ کرو) پس میں آدمی ہوں)۔

(۳) تیسری حدیث میں کہا گیا: **قال انتم اعلم بامر دنیاکم** (ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ اپنی دنیا کے معاملات کو (مجھ سے) زیادہ جانتے ہو)۔

prepared by Mr. Aamir Mehmood

محدثین کرام کے یہاں اور ان کے حوالے سے پوری امت میں صحیح ترین حدیثیں وہ سمجھی جاتی ہیں جن کو شیخین نے بیان کیا ہو۔ بعض محدثین کے مطابق مسلم شریف میں مذکور احادیث کا درجہ بخاری سے بھی اونچا ہے۔ یہاں محدثین کرام اور ان کی جمع کردہ ان احادیث کے بارے میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) وہ احادیث کس قدر صحیح ہیں خواہ وہ شیخین کی روایت کردہ ہی کیوں نہ ہوں؟ دراصل یہ سوال اس شعبۂ اصول و موازین روایت و درایت سے متعلق ہے جس پر ان محدثین کرام نے عمل فرمایا۔ اس سوال سے یہ مراد نہیں کہ یہ ذخیرۂ احادیث مرجع اور قابل اعتنا نہیں۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ وہ اصول و موازین حدیث جو باضابطہ طور پر حاکم نیشاپوری اور خطیب بغدادی سے لیکر ابن حجر عسقلانی تک منضبط ہوتے رہے اور جن پر جرح و تعدیل کی ساری عمارت کھڑی ہے وہ کس قدر قابل اعتماد ہیں؟۔ یہیں سے ایک ایسا سوال بھی پیدا ہوتا ہے جو فی الواقع اس پورے نظام دین پر از سر نو غور کرنے پر مجبور کرتا ہے جسے 'علماء وقت' 'حکومت وقت' کے سائے میں پچھلے چودہ سو سالوں سے تعبیر کرتے آرہے ہیں اور وہ سوال یہ ہے کہ 'دین اللہ' کا وہ نقطۂ نظر، ہیئت اور توازن جواب پایا جاتا ہے وہ اصلاً 'سنت اللہ'، 'سنت قائمہ' اور 'سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم' کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ اور یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ احادیث جو مذکورہ اصول و موازین روایت و درایت کے مطابق صحیح اور مضبوط تھیں کمزور ثابت ہو جائیں اور وہ احادیث جنہیں کمزور اور ضعیف سمجھی جاتی ہیں مضبوط اور صحیح ثابت ہو جائیں تو اس 'نظام دین' کا کیا ہوگا جو ان بنیادوں پر استوار ہوا ہے جو اس صورت میں آج خود زیر بحث آ گئی ہیں؟

(۲) اس تعلق سے دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ محدثین کرام جو بالخصوص تیسری صدی ہجری میں یا اس کے بعد ہوئے ان کا 'فہم دین' خالص تھا یعنی وہی تھا جو حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تھا یا اس پر اس عہد کی عظیم سازش، حکومتوں کے رویوں اور سب سے زیادہ فقہاء کرام کی 'جسارتوں' اور بالخصوص 'علماء وقت' جو پوری خلافت کے طول و عرض میں لاکھوں کی تعداد میں عدالتوں، سرکاری عہدوں، مساجد، مدارس اور دیگر شعبہ ہای زندگی میں پائے جاتے تھے کا اثر آ گیا تھا اور وہ 'فہم دین' دراصل اس معاشرتی صورتحال کو منعکس کر رہا تھا جو ارد گرد میں پایا جاتا تھا اور فی الواقع ان میں اس 'فہم دین' کا فقدان تھا جو حضرات صحابۂ کرام کو ملا تھا؟

www.bookstube.net www.urdutube.net prepared by M. Aamir Mehmood www.urdumovies.net www.asiaralam.net

یہاں علی الترتیب دو باتیں قابل غور ہیں:

(۱) مسلم شریف کی ان تینوں احادیث کے 'متن' درست ہیں یا نہیں؟

(۲) امام مسلم نے جو عنوان قائم کیا ہے وہ جس 'فہم دین' پر مبنی ہے وہ درست ہے یا نہیں؟

فی الواقع یہاں ایک تیسرا سوال بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ حدیثیں جو امام مسلم کے نام سے مسلم شریف میں درج ہیں انہیں فی الواقع امام صاحب نے درج بھی کی تھیں یا نہیں یا اگر درج کی تھیں تو وہ من وعن ایسے ہی درج ہوئی تھیں یا نہیں؟ یہ دراصل اس 'تسلیم شدہ' بات پر سوال ہے کہ وہ روایت حدیث جس کا ہر محدث آج تک حدثنا، حدثنی، سمعنا، عن فلاں عن فلاں کہہ کر ذکر کرتا ہے خود وہ کس قدر صحیح اور درست ہے۔ لیکن ہم تیسرے سوال کو قلم انداز کرتے ہیں اور سر دست یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ فی الواقع امام صاحب نے یہ حدیثیں ایسے ہی درج کی تھیں صرف دو سوالوں پر بحث کرتے ہیں۔

اس تعلق سے سب سے ضروری سوالات ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت سے متعلق پیدا ہوتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) کیا ایمان بالرسالت مشروط ہے؟ یعنی کیا دین میں اس کی گنجائش ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہے کہ انسان انفرادی اور اجتماعی امور میں زندگی کے بعض حصوں پر رسول کی بات مانے اور بعض حصوں پر ماننے اور نہ ماننے کا اسے اختیار ہے؟

(۲) کیا ایمان بالرسالت جزوی ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا قرآن وسنت میں ایسی کوئی تفصیل یا اجمالی اصول بتایا گیا ہے کہ فلاں فلاں امور وہ ہیں جن میں رسول کی بات ماننا واجب ہے اور فلاں فلاں امور میں اختیار ہے؟ اگر صراحتاً ایسی بات موجود نہیں حتیٰ کہ مجمل طور پر کوئی تناسب بھی نہیں بتایا گیا ہے مثلاً یہ کہ ستر فی صد امور زندگی پر رسول کی بات واجب الاتباع ہے اور بقیہ تیس فیصد پر واجب الاتباع نہیں..... تو اس صورت میں اس آدمی کا کیا حکم ہے جو واجب الاتباع کو گھٹا کر ایک فیصد کر دے اور اختیاری کو ننانوے فیصد؟۔ پھر کیا قرآن کی کوئی صریح آیت ایسی موجود ہے جس نے یہ صراحت کی ہو کہ یہ 'امور دین' ہیں اور وہ 'امور دنیا'؟

(۳) اگر امور حیات فی الواقع 'امور دین' اور 'امور دنیا' میں منقسم ہیں تو کیا کوئی ایک قرآنی

آیت یہ بتاتی ہے کہ یہ 'امور دین' ہیں اور وہ 'امور دنیا'؟

فی الواقع 'قرآن' اور 'سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' اور 'سنت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین' اور عقل یہی بتاتے ہیں کہ ایمان بالرسالت مشروط ہے اور نہ جزوی۔ عقل تو یہاں تک کہتی ہے کہ وہ مشروط اور جزوی ہو ہی نہیں سکتا۔

ایمان بالرسالت کا 'مشروط اور جزوی ہونا اور 'امور حیات' کا 'امور دین' اور 'امور دنیا' میں منقسم ہونا' 'سنت اللہ' کا منہدم کر دیا جانا ہے۔

قرآن اور سنت رسول ﷺ ان امور میں صریح ہیں کہ یہ مشروط اور جزوی ہیں اور نہ منقسم۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاؤک فاستغفروا اللہ واستغفرلھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما. فلاوربک لایومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوافی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (النساء، ۶۵)

ترجمہ: اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا حکم مانیں اللہ کے فرمانے سے۔ اور اگر وہ لوگ جس وقت انہوں نے اپنا برا کیا تھا آتے تیرے پاس پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کو بخشواتا تو البتہ اللہ کو پاتے معاف کرنے والا مہربان۔ سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلے سے اور قبول کریں خوشی سے۔

(۲) قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفرلکم ذنوبکم واللہ غفوررحیم. قل اطیعوا اللہ والرسول فان تولوا فان اللہ لایحب الکفرین (آل عمران ۳۱)

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میرا اتباع کرو تا کہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان۔ آپ کہہ دیجئے اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی۔ پھر اگر اعراض کریں تو اللہ کو محبت نہیں ہے کافروں سے۔

یہ دونوں آیتیں درج ذیل امور میں صریح ہیں:

www.urdututube.net
prepared by M. Aamir Mehmood

(۱) رسول کا ہر اعتبار سے اتباع کیا جائے۔

(۲) رسول کا اتباع اللہ کا اتباع ہے۔

(۳) یہ اتباع مشروط ہے نہ جزوی۔

(۴) رسول کا فیصلہ آخری ہے۔ یعنی وہاں امکان سوال، امکان شک یا امکان نظر ثانی کی کوئی گنجائش نہیں۔

(۵) **قل اطیعوا الله والرسول** سے دیگر معانی کے ساتھ ساتھ یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ جو لوگ رسول کے اتباع کو مشروط جزوی اور امور دین اور امور دنیا میں منقسم مانتے ہیں ان پر لازم آئے گا کہ یہی بات انکے نزدیک خود اللہ کے لئے بھی متحقق ہو جائے۔ یعنی زندگی کے بعض حصوں میں اللہ کا حکم واجب الاتباع نہیں ہے جبکہ یہ بات ایمان بالرسالت کیا ایمان باللہ کے بھی خلاف ہو جائے گی۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) **قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : کل امتی یدخلون الجنة الا من ابی قیل ومن ابی قال من اطاعنی دخل الجنة ومن عصانی فقد ابی** (رواہ البخاری)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے تمام امتی داخل جنت ہوں گے مگر جس نے انکار کیا۔ سرکار سے دریافت کیا گیا کہ 'کس نے انکار کیا'؟ آپ نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔

(۲) **وعن جابر : .... والداعی محمد فمن اطاغ محمداً فقد اطاع الله ومن عصی محمداً فقد عصی الله ومحمد فرق بین الناس** (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں .... اور داعی محمد ہیں۔ پس جس نے محمد کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور محمد لوگوں کے مابین (حق و باطل کا) فرق ہیں۔

(۳) **وعن عبدالله ابن عمر وقال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : لایؤمن احدکم حتی یکون هوئه تبعا لماجئت به (رواه فی شرح السنة وقال النووی فی اربعینه هذا حدیث صحیح رویناه فی کتاب الحجة باسناد صحیح)**

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اس وقت تک ایمان والے ہو ہی نہیں سکتے جب تک تمہاری خواہش اس کے تابع نہ رہے جسے میں لیکر آیا ہوں۔

ان صریح نصوص کی موجودگی میں جو بات سامنے آتی ہے وہ درج ذیل ہے:

(۱) مسلم شریف کی یہ تینوں حدیثیں اور ان کی بنیادوں پر پھیلے نظام دین کے وہ سارے امور جن کا اس 'حکم' سے تعلق ہے جو ان حدیثوں سے نکلتا ہے محل غور ہیں۔

(۲) امام مسلم کے 'فہم دین' کا معاملہ بھی محل غور ہے۔

اس کے متعدد اسباب ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) ان احادیث کے تعلق سے ایسا سمجھنے کی گنجائش تو موجود ہے کہ فی الواقع آنحضور ﷺ نے کہا ہوگا کہ فلاں کام جس طرح مناسب سمجھو کرو۔ یہ اس طرح کی بات ہوئی کہ کسی مثلاً اجتماع کا نگراں اعلیٰ اپنے کسی ماتحت کے پوچھنے پر کہ کھانا کیا بنے گا؟ یہ کہدے کہ 'جیسا چاہو بنالو'۔ جب ایسا کہا جاتا ہے تو اس طرح کے فقرہ میں کئی باتیں موجود ہوتی ہیں:

(۱) یہ مجمل فقرہ دراصل ایک قسم کی ہدایت ہی ہے۔ اس ہدایت کی صورت مختار و مجاز ہدایت یعنی (Delegated Guidance) کی ہے۔ لیکن ایسی ہدایت میں کئی باتیں مفہوم (Understood) ہوتی ہیں:

(الف) جسے ایسی ہدایت دی جارہی ہے اس پر ہدایت دینے والے کو اعتماد ہوتا ہے کہ وہ کھانے والوں کی تعداد، ان کی نوعیت، حالات، موسم، عادت، بعض لوگوں کی مجبوریوں اور بنیادی اصولوں مثلاً حلال وحرام کی تمیز کی رعایت کرے گا۔

(ب) ایسی ہدایت دے کر وہ دراصل یہ اعتماد ظاہر کرتا ہے کہ ان امور کو سامنے رکھ کر کوئی شخص خود فیصلہ کرلے گا اس لئے بجائے اس کے کہ ہر چھوٹی چھوٹی بات کے لئے اپنے پاس بلائے اسے ہی مجاز قرار دے دیتا ہے کہ وہ خود فیصلہ کرلے۔

اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض امور کے تعلق سے لوگوں کو خود مجاز قرار دے دیا کہ وہ حسب صورت وحالت وضرورت فیصلہ کرلیں۔ لیکن یہ کہنا کہ آپ نے امور حیات کی تقسیم کی اور یہ کہ ان میں ایک حصے میں آپ واجب الاتباع

ہیں اور دوسرے حصے میں نہیں خلاف 'سنت اللہ' اور خلاف 'دین اللہ' ہے۔

جہاں تک متون حدیث میں (۱) **فانی انما ظننت ظنا فلا تواء خذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شینا فخذوا بہ فانی لن اکذب علی اللہ عزوجل** (۲) **انما انا بشر اذا امرتکم بشئ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشئ من رای فانما انا بشر** اور (۳) **انتم اعلم بامر دنیاکم** کی بات ہے، یہ نہ صرف وظیفۂ رسالت اور حقیقت رسالت کے خلاف ہے بلکہ مقام رسالت اور مقام رسول کی اس سے بڑی تذلیل اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہ پیرایۂ بیان نبوی ہو ہی نہیں سکتا۔

جو ذات گرامی 'سنت اللہ' کی جاننے والی روئے زمین پر واحد ذات ہو وہ لوگوں سے یہ کہے کہ یہ میرا ظن ہے، یا یہ کہ تم اپنی دنیا کے امور کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو ایسا کہنا ایسا ہی ہے بلکہ اس سے بھی فروتر کہ جیسے کسی دارالعلوم کا شیخ الادب کسی بچے سے جو شرح مأۃ عامل، میزان اور منشعب پڑھتا ہو یہ کہے کہ دیکھو کتاب میں اسم، فعل اور ضمیر کیا ہے میں کیا جانوں تم لوگ اس کا علم مجھ سے بہتر رکھتے ہو لہذا جس لفظ کو مناسب سمجھو اسم قرار دے دو اور جسے مناسب سمجھو فعل قرار دے دو۔ اور یہ کہ اس تعلق سے میری بات کو ظن سمجھو۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

بفرض محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آنحضور ﷺ نے ایسا ہی کیا ہوگا۔ تو احادیث کا پورا ذخیرہ اس کی گواہی دیتا ہے کہ نعوذ باللہ وہ خود اپنی بات پر پورے نہیں اترے۔ اس تعلق سے درج ذیل امور قابل غور ہیں:

(۱) آپ ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو کوئی شخص کیسے سمجھ سکتا ہے کہ فلاں امر آپ کے ظن سے ہے یا حکم من اللہ ہے تاوقتیکہ آپ ﷺ اپنی ہر ایسی بات، عمل اور تقریر کے تعلق سے یہ صراحت نہ فرما دیں کہ یہ فلاں ہے فلاں نہیں۔ کیا ایسی بات پورے ذخیرۂ حدیث میں کہیں ملتی ہے؟

(۲) کیا صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ تعامل ملتا ہے کہ وہ ہر بات کے تعلق سے یہ دریافت کریں کہ یہ بات کہاں سے کہی جا رہی ہے؟ یہ حکم من اللہ ہے یا ظن؟

(۳) مثلاً **صلوا کما رأیتمونی اصلی** (نماز قائم کرو جیسا کہ تم نے مجھے نماز قائم کرتے دیکھا ہے) کے بارے میں یہ کیسے سمجھا جائے کہ یہ بات آپ نے ظن سے کہی یا حکم من ۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.urdumoves.net
www.esrarafam.net

اللہ ہے؟

(۴) وہ کیا اصول دین ہے اور کہاں ہے جس کی بنیاد پر پیشاب کرنا، بیوی سے ہمبستری کرنا حتیٰ کہ چھینکنا تو امور دین ہے اور کھیتی کرنا اور لاکھوں روپے کی کاشت کرنا امور دنیا؟

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر غور کیا جائے کہ آنحضور ﷺ نے فی الواقع کیا کہا تھا اور کیوں کہا تھا؟ اور بعد میں اس بات کو جو کچھ بنا دیا گیا وہ کیوں ہوا؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ حدیث مبارکہ اور سنت نبوی کی یہ درگت کرنے والے لوگ کون تھے؟

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مر بقوم یلقحون فقال لو لم تفعلوا لصلح قال فخرج شیصاً فمر بھم فقال مالنخلکم قالوا قلت کذا و کذا قال انتم اعلم بامر دنیا کم (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ لوگوں پر گزرے جو گابھہ کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: اگر نہ کرو تو 'صلاح' ہو جائے۔ لوگوں نے گابھہ کرنا ترک کر دیا۔ تو نرم گٹھلی کی چھوٹی کھجوریں پیدا ہوئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (کچھ عرصے کے بعد پھر ادھر سے) گزرے تو آپ نے پوچھا: کیسی کھجوریں پیدا ہوئیں؟ لوگوں نے کہا: آپ نے ایسا (کرنے کو کہا ہم لوگوں نے ویسا ہی کیا اس کی وجہ سے یہ صورت حال ہے یعنی نرم گٹھلی کی چھوٹی کھجوریں پیدا ہوئی ہیں گویا لوگوں نے اس تبدیلی پر کہا کہ ایسی کھجوریں اس لئے پیدا ہوئیں کہ ہم نے گابھہ نہیں کیا۔ اس پر) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنی دنیا کے امر کو زیادہ جانتے ہو (یا میں)؟ یعنی یہ جو گابھہ نہ کرنے سے ایسی کھجوریں پیدا ہوئی ہیں جسے تم کم نفع بخش سمجھ رہے ہو یہ تمہارے لئے زیادہ 'صلاح' کی بات ہے یا وہ جب وہ گابھہ کرنے سے خوب بھری بھری پیدا ہو رہی تھیں۔ تم اس 'صلاح' کو کیا جانو جسے میں جانتا ہوں۔ تمہاری نظر تو صرف اس کے وزن اور گودا کی طرف ہے۔ اور تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس طرح پیداوار بھی کم ہوئی ہے لہذا بیچنے پر منافع بھی کم ہوگا۔ حالانکہ گابھہ کرنے سے تم نے اس 'صلاح' کو جو برباد کیا ہے اور اس کے جو نقصانات ہیں ان کا تم کو اندازہ نہیں۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دراصل 'سنت اللہ' کے جاننے والے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ لوگ 'غیر فطری کاشت' کر رہے ہیں جو 'سنت اللہ' کی خلاف ورزی ہے

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

اور جس کے سبب 'صلاح' فساد میں بدل رہی ہے تو آپ نے اسے منع فرما دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے لفظ 'لصلح' استعمال فرمایا۔ جب لوگوں نے کم پیداوار کی شکایت کی تو آپؐ نے حقیقت بتا دی۔

ممکن ہے کہ یہاں اس مفہوم کی بھی گنجائش ہو کہ آپؐ نے باوجود اس کے کہ گابھہ کرنا 'سنت اللہ' کی حقیقی خلاف ورزی تھی اس کی اجازت مرحمت فرما دی جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرے میں 'سنت اللہ' کی خلاف ورزی میں رونما ہونے والے نقص فسادات کو تشریعی طور پر محض اس لئے 'جائز' قرار دے دیا کہ لوگوں کو انہیں یکسر منع کر دینے سے ضرر ہوتا۔ تاہم 'معیار مطلوب' یعنی پہلا انفاقی درجہ حسب سابق برقرار رکھا گیا۔ مثلاً روئی اور اون سے باضابطہ بنے اور سلے ہوئے کپڑے، گھاس اور لکڑی سے باضابطہ بنائے ہوئے کاغذ اور اس پر لکھی ہوئی کتاب وغیرہ۔ اگرچہ 'سنت اللہ' پر اضافہ اور توسیع تھے اور ان کی وجہ سے کچھ نہ کچھ 'صلاح' ضرور متاثر ہوئی تھی تاہم انہیں تشریعی طور پر گوارہ کر کے 'جائز' قرار دے دیا گیا۔ اس صورت میں 'انتم اعلم بامر دنیاکم' کا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ ہر چند کہ یہ امور 'صلاح' کے خلاف اور 'سنت اللہ' کو متاثر کرنے والے ہیں تاہم چلو اس حد تک اجازت دی جاتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مفہوم لینا کہ آپ نے باضابطہ 'امور حیات' کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، جس میں ایک حصے پر آپ ﷺ کا اتباع واجب ہے اور دوسرے حصے پر نہیں بالکل الٹی بات ہے۔

غور کیا جائے تو امور حیات کی یہ تقسیم دراصل وہ پہلا سیکولرائزیشن (Secularization) ہے جس کا تعارف اور رواج اسلامی معاشرے میں 661 عیسوی کے بعد ہوا۔ سیکولرائزیشن امور حیات کو دو حصوں میں بانٹنے اور اس کے ایک حصے سے اللہ اور اس کے رسول کا قبضہ و اختیار ختم کرنے کا دوسرا نام ہے۔ جب اس نقطے پر غور کیا جائے گا تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آ جائے گی اور بطور خاص اس صورت میں کہ تدوین حدیث تدوین فقہ کے بعد کا عمل ہے کہ وہ اقدامات جو 'نظام وقت' (جس میں سازش کرنے والے اور حکومت دونوں شامل تھے) کے لطف خاص سے پورے بلاد اسلامی میں کئے جا رہے تھے اور جن کے تحت دیگر امور کے ساتھ سنت کی جگہ اس فقہ کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کیا جا رہا تھا جو سنت کی نقیض تھی۔۔ فقہ کا یہ نفاذ دراصل معاشرے سے قرآن اور سنت نبوی کا اخراج و انہدام تھا۔ یہی وہ فضا تھی جس میں سنت کا علم تیزی

prepared by M. Aamir Mehmood
www.esratalam.net

سے مٹتا جا رہا تھا یا مٹایا جا رہا تھا۔ چنانچہ دو تین نسلوں کے گزرنے کے بعد ایسے لوگوں کی تعداد مٹھی بھر رہ گئی جو اصل سنت نبوی ﷺ کے جاننے والے تھے۔ جب کہ معاشرے میں اس سنت نبوی کا چلن عام ہو چکا تھا جسے فقہ اسلامی سنت کہہ کر اس سے متعلق پورے احکام مدون کر چکی تھی۔ عصر حاضر میں دنیائے آدمیت میں سیکولرائزیشن (Secularization) کے اصلی علم برداروں کو دیکھ کر بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ کون لوگ تھے جو خلافت راشدہ کے بعد یہی سیکولرائزیشن (Secularization) اسلامی معاشرے میں رائج کر رہے تھے اور جس کے زیر سایہ فقہ اسلامی کی تشکیل کی جا رہی تھی۔ جامع محدثین اور مدون محدثین کا اس معاشرے سے متاثر ہونا خلاف معمول نہ تھا جس میں سب سے زیادہ اس بات کو دخل تھا کہ اس فہم دین کو رکھنے والے لوگ معاشرے میں خال خال پائے جانے لگے ہوں جن کو یہ فہم صحابہؓ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے براہ راست ملا تھا۔ چنانچہ 'فہم دین' کے فقدان کے پیدا کردہ اس اضطراب کا ثبوت ہے کہ محدثین کرام نے بعض ایسی باتیں بھی لکھ دیں ہیں جو سنت کے اس گہرے علم پر مبنی ہیں جو صحابہؓ کرام کو حاصل تھا لیکن ان باتوں کو لکھنے کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ محدثین یہ نہیں جانتے تھے کہ ان باتوں کی کنہہ کیا ہے؟ مثلاً:

(۱) امام بخاری نے کتاب الوضو میں باب باندھا ہے: **باب من لم يتوضاء من لحم الشاة و السويق و اكل ابو بكر و عمر و عثمان رضي الله عنهم لحما فلم يتوضووا** (باب جس نے بکری کے گوشت اور ستو (اور آگ سے پکی ہوئی چیزیں) کھانے کے بعد وضو نہ کیا اور ابو بکر عمر اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے گوشت کھایا (اور پھر نماز پڑھی) اور وضو نہ کیا)۔

اسی طرح امام صاحب نے دوسرا باب باندھا: **باب من مضمض من السويق ولم يتوضاء** (باب جس نے ستو کھانے کے بعد کلی کی (اور نماز پڑھ لی) اور وضو نہ کیا۔

اسی طرح امام صاحب نے تیسرا باب باندھا ہے: **باب هل يمضمض من اللبن** (باب کیا دودھ سے (یعنی دودھ پی کر) کلی کی جائے؟

امام بخاری نے ان ابواب کے تحت حدیثیں جمع فرما دی ہیں۔ لیکن پورا اسلامی علوم کا ذخیرہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ یہ ابواب اس طرح کیوں باندھے گئے ہیں؟ اسلامی علوم کے

ذخیرے میں جو بات ملتی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بھنا ہوا گوشت کھانے سے وضو لازم آتا ہے یا نہیں؟ ستو کھانے سے وضو لازم آتا ہے یا نہیں؟ دودھ پینے سے وضو لازم آتا ہے یا نہیں؟ ستو کھانے کے بعد کی گئی کلی کا سبب کیا تھا؟ دودھ پینے کے بعد کی گئی کلی کا سبب کیا تھا؟ یہی وہ باتیں ہیں جو پورے شرح وبسط سے کہی جاتی ہیں۔ لیکن جوام السوالات ہے اس کا کہیں ذکر نہیں۔ اور وہ ہے:

جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم لایعنی گفتگو نہیں فرماتے تھے اور جب بھی کہتے فصیح وبلیغ بات کہتے تھے اسی طرح صحابۂ کرام بھی لایعنی باتیں کہنے کے عادی تھے نہ سننے کے، پوچھنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سوال پوچھنے کے تعلق سے وہ سب سے کم گو اور محتاط تھے۔ جس کا گواہ خود احادیث کا ذخیرہ ہے بلکہ جو مرتبۂ صحابیت میں جتنا بڑھا ہوا تھا وہ اتنا ہی کم سوال کرنے والا تھا۔ پھر جب سب سے پہلے مثلاً باب مذکورہ اولیٰ میں حضرت عطا بن یسار نے حضرت عبداللہ بن عباس سے پوچھا ہوگا یا حضرت عبداللہ بن عباس نے انہیں بتایا ہوگا تو اس وقت آخر وہ کیا سوال پیدا ہوا تھا جس کے جواب میں یہ حدیث بتائی گئی؟ اور اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ وہ سوال کیوں پیدا ہوا تھا؟

اس سوال کا پیدا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ خلافت راشدہ میں اصحاب رسول ﷺ 'سنت اللہ' 'سنت قائمہ' اور 'سنت نبوی' کی حقیقت اور ان پر مبنی 'فہم دین' ضرور رکھتے تھے اسی فہم کے رکھنے کی وجہ سے جب کوئی اشکال پیدا ہوتا تو بزرگوں سے دریافت فرماتے۔ چنانچہ 'سنت اللہ' اور 'سنت قائمہ' کا علم انہیں بتاتا تھا کہ فطری طور پر موجود چیزوں مثلاً گوشت پر آگ کے ذریعہ طباخت اضافہ ہے اسی طرح پیسا ہوا گیہوں یعنی ستو اضافہ ہے پھر یقیناً اس کی صلاح متاثر ہوئی ہوگی۔ جب اسکی صلاح متاثر ہوئی تو پھر کیا وہ مانع وضو ہے؟ یا یہ کہ وہ مانع وضو کیوں نہیں؟ اور یہ کہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں کہ بھنا ہوا گوشت کھا کر وضو نہیں کرتے اور نماز پڑھ لیتے ہیں؟ اس پر حضرت ابن عباس نے انہیں بتایا کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور فلاں فلاں کو بھی ایسا کرتے دیکھا تھا۔ چنانچہ ایسا کرنا 'سنت اللہ' اور 'سنت قائمہ' کے خلاف نہیں بلکہ 'جائز' ہے اسی لئے آپ ﷺ نے اس پر 'سنت نبوی' قائم فرمائی۔

اسی طرح یہ سوال پیدا ہوا کہ دودھ تو فطری اخذ (Natural Intake) ہے پھر یہ

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarkalam.net

بات کیوں مشہور ہے کہ آنحضور ﷺ نے دودھ پی کر کلی کی ہر چند کہ وضو نہیں فرمایا؟ اس کے جواب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ پی کر کلی کی اور پھر اسکی وجہ بھی بیان فرمادی کہ دراصل کلی کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اس میں چکنائی ہوتی ہے اور آپ ﷺ کو نماز پڑھانی تھی چنانچہ آپ کو مناسب نہیں لگی، ہر چند کہ اس چکنائی سے وضو لازم نہیں آتا۔

چونکہ اصحاب رسول ﷺ کے یہاں پایا جانے والا 'فہم دین' اس معاشرے میں مفقود ہو چکا تھا لہذا اسی کا نتیجہ ہے کہ اب ان سوالات کے تحت بیان کردہ احادیث کا رخ، زاویہ اور توازن بدل گئے لہذا ان کی معنویت بھی بدل گئی۔

صحابۂ کرام کا تعامل: صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تعامل بتاتا ہے کہ وہ 'سنت اللہ' 'سنت قائمہ'، اور 'سنت نبوی' ﷺ پر مبنی 'فہم دین' کے پورے پورے حامل تھے لہذا ان کا ردعمل اور جو جتنا زیادہ 'فہم دین' کا حامل تھا اس کا مخصوص ردعمل دیگر لوگوں سے اتنا ہی مختلف ہوتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صرف اس لئے ساری امت پر ممتاز نہیں کہ ان کی معیت آنحضور ﷺ کے ساتھ سب سے زیادہ رہی بلکہ فی الواقع اس لئے ممتاز ہیں کہ آنحضور ﷺ کے بعد امت 'محمدیہ' میں سنت اللہ، 'سنت قائمہ'، اور 'سنت نبوی' کا جاننے والا ان سے زیادہ کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ یہی سبب ہے کہ درج ذیل امور میں ان کا فیصلہ سب سے مختلف تھا:

(۱) جب بعض لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا اور حضرت ابوبکر نے ان پر لشکر کشی کا ارادہ کیا تو ہر صحابی حتی کہ حضرت عمر کو بھی ان پر لشکر کشی میں تردد تھا حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اگر اس کے لئے کوئی نہیں اٹھے گا تو ابوبکر ان سے تنہا جہاد کرے گا اور یا تو وہ ایک رسی جو وہ زکوٰۃ کے بطور دیتے تھے لیکر رہے گا یا اسی جہاد میں اپنی جان دے دے گا۔ چونکہ حضرت ابوبکرؓ جانتے تھے کہ یہ زکوٰۃ دینے سے انکار نہیں بلکہ اس سنت نبوی اور سنت قائمہ اور سنت اللہ کو ڈھا دینا ہے جس کی اقامت کے لئے آنحضور ﷺ کی بعثت ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ عمل دراصل آنحضور ﷺ کے پورے عمل کو تلپٹ کر دینے کے مترادف ہے۔ لہذا یا تو اس سنت کی بحالی کی جائے یا اسی بحالی کی جدوجہد میں جان دے دی جائے یہی حاصل حیات ہے۔

لیکن جب معاشرے سے یہ علم عام طور پر جاتا رہا اور اس 'خلافت رسول اللہ' کو لوگوں

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarialam.net

نے تقویٰ کے بجائے موروثی اور خلافت کے بجائے ملوکیت میں بدل دینا چاہا اور وہ چند لوگ جو اس 'سنت نبوی' کا فہم رکھتے تھے اس رجحان اور تبدیلی پر بے چین ہوا ٹھے اور اسے بچانے کے لئے سردھڑ کی بازی لگانے لگے تو وہ لوگ جنہیں وہ علم نہ تھا انہیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ روئے ارض پر کیا توڑا جا رہا ہے اور اسکا ٹوٹنا 'نظام رسالت' میں کیا معنی رکھتا ہے؟ لہذا ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی بلکہ اس سنت کو بچانے والے ہی متشدد اور باغی قرار دئے گئے۔ سو سالوں کے بعد تو نوبت یہ ہوگئی کہ 'فقہ اسلامی' نے باضابطہ فتویٰ دے دیا کہ وہ 'سنت اللہ' اور 'سنت قائمہ' جس کو قائم کرنے کے لئے اللہ کے رسول مبعوث ہوئے اور انہوں نے 'خلافت اللہ' قائم کر کے جس سنت نبوی کو قائم فرمایا تھا اس کے غیر عادل لوگوں کے ہاتھوں میں جانے سے روئے ارض پر کوئی قیامت نہیں ٹوٹتی بلکہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہتا ہے۔ نبی آخر الزماں کی قائم کردہ سب سے بڑی سنت نبوی رہے یا جائے اس سے دین اللہ پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور تاریخ اسلامی میں اس فتویٰ کو 'فہم دین' کا سب سے بڑا فیصلہ اور فقاہت کا سب سے بڑا ثبوت سمجھا گیا۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

(۹) مقابلۂ سحر و سحر: (الف) روئے ارض پر معرکۂ خیر و شر معرکۂ حق و باطل ہے۔ دقت نظر سے دیکھا جائے تو اس معرکہ کے دو وجوہ ہیں:

(۱) وجہ معاملہ: وجہ معاملہ سے مراد ہے وہ نکتہ جس پر معرکۂ خیر و شر مرکوز رہتا ہے۔ اور حضرات آدم و حوا علیہما السلام سے ظہور دجال، نزول عیسیٰ ابن مریم اور قیام قیامت تک سارا معرکہ اصلاً اس نکتہ پر لڑا جاتا رہا ہے اور لڑا جائے گا۔ اس اعتبار سے حضرات آدم و حوا علیہما السلام سے لیکر قیام قیامت تک وہ مرکزی نکتہ ہے:

'ملک اللہ'

چنانچہ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پوری جدوجہد کا مرکز 'اقامت ملک اللہ' رہی ہے۔

(۲) وجہ تدبیر: وجہ تدبیر سے مراد ہے وہ تدبیر جو معرکۂ خیر و شر میں حق اور باطل ــــ انبیاء و رسل اور اہل باطل ابلیس اور اس کے حلیف اختیار کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ قرآن و سنت نبوی

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asraradam.net

ﷺ سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ معرکۂ خیر وشر جو حضرات آدم وحوا علیہما السلام کے وقت سے لڑا جا رہا ہے اور تا قیامِ قیامت لڑا جائے گا بنیادی اعتبار سے انہیں تدبیروں سے لڑا جائے گا جو ابتک قائم چلا آرہا ہے۔ اس اعتبار سے وہ تدابیر درج ذیل ہیں:

(۱) تدبیر سحر: ابلیس، باطل اور اس کے حلیف ہمیشہ سے اس معرکہ میں جس تدبیر کا استعمال کرتے آئے ہیں وہ تدبیر 'سحر' ہے۔ یعنی 'مسخر لہ' امور یعنی انفاقی علم، ہنر اور عمل اور اس کے انفاقی درجہ سے ہٹ کر اکتشافی کوششوں یعنی 'سرف'، 'سحر' کے ذریعہ اکتشافی علم، اکتشافی ہنر اور اکتشافی عمل اور اس کے اکتشافی آخری درجوں تک جا کر اس سے حاصل کردہ قوتوں کا حق کے خلاف استعمال کرنا۔ بالفاظ دیگر:

(۱)	طبیعیاتی علم یا علم طبیعیات	Physical Knowledge or Science
(۲)	علم ہنر و ہنر مبنی بر طبیعیات	Technology (Physical)
(۳)	عمل بذریعہ آلہ جات طبیعیاتی علم و ٹکنالوجی	Action through Equipments made of Physical Knowledge & Technology
(۴)	ماوراء طبیعیات علم	Metaphysical knowledge or science
(۵)	علم ہنر و ہنر مبنی بر علم ماوراء طبیعیات	& Technology (Metaphysical)
(۶)	عمل بذریعہ آلہ جات ماوراء طبیعیاتی علم و ٹکنالوجی	Action through Equipments made of Metaphysical knowledge & Technology

کا استعمال کر کے اہل حق کو 'ملک اللہ' کی اقامت سے روکنا۔

(۲) تدبیر تحر: اللہ کے رُسل اور انبیاءِ کرام اور اہل ایمان اس کے برخلاف اس معرکہ میں ہمیشہ جس تدبیر کا استعمال کرتے رہے ہیں وہ تدبیر 'تحر' ہے۔ یعنی 'مسخر لہ' امور یعنی انفاقی علم، انفاقی ہنر اور انفاقی عمل اور اس کے انفاقی درجہ پر ثابت قدم رہتے ہوئے اس سے حاصل کردہ

www.booksubeb.net
prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarulalam.net

قوت کے استعمال سے روئے ارض پر 'ملک اللہ' کی اقامت کرنا۔

چنانچہ حق و باطل کے مابین یہ تدبیری صورتحال بلا استثناء ہمیشہ قائم رہی ہے:

(۱)	مابین قابیل	وحضرت ھابیل علیہ السلام
(۲)	مابین قوم نوح	وحضرت نوح علیہ السلام
(۳)	مابین قوم عاد	وحضرت ھود علیہ السلام
(۴)	مابین قوم ثمود	وحضرت صالح علیہ السلام
(۵)	مابین قوم ابراہیم	وحضرت ابراہیم علیہ السلام
(۶)	مابین فرعون وقوم فرعون	وحضرت موسیٰ علیہ السلام
(۷)	مابین جالوت وقوم جالوت	وحضرت داؤد علیہ السلام
(۸)	مابین قوم محمد	وحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اور یہی صورتحال قرآن وسنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی صراحت کے مطابق اس وقت ان شاء اللہ ہوگی یعنی:

مابین یہود، دجاجلہ ودجال اکبر	واہل ایمان، حضرت مہدی وحضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام

(ب) صورت استعمال تدبیر:

(۱) حقیقی صورتحال اور حقیقی کشش: حقیقی کشش (Actual Tension) سے مراد ہے ملتہٴ تصادم سے دونوں طرف پائی جانے والی صورتحال اور وہاں پائی جانے والی کشیدگی۔

مثلاً صورت درج ذیل:

حق				باطل
مع	کشش	اقامت ملک اللہ	کشش	مع
انفاقی علم، انفاقی ہنر اور انفاقی عمل				اکتشافی علم، اکتشافی ہنر و اکتشافی عمل

ظاہر ہے یہ صورتحال وہی ہوگی جو درج ذیل تعبیر سے ظاہر کی جا سکتی ہے:

حق لاٹھی، تلوار، تیر اور گھوڑے کے ساتھ ہوگا اور باطل ICBM اور جوہری

prepared by M. Aamir Mehmood
www.urdunovies.net

(Nuclear)، کیمیاوی (Chemical)، جراثیمی (Bactereological)، لیزر اور کائنٹک (Kinetic) ہتھیاروں کے ساتھ۔ تاریخ معرکۂ خیر وشر کی مثالی صورتحال (Ideal Situation) یہی ہے۔ اس کے برخلاف ان دونوں نقطوں کے مابین جتنی کم دوری ہوگی اتنی صورتحال غیر مثالی (Unideal) ہوگی۔

معرکۂ خیر وشر میں باطل کی یہ تاریخ کبھی نہیں رہی کہ وہ اس اعتبار سے حق سے نزدیکی پیدا کرے۔ یعنی اکتشافی علم، اکتشافی ہنر اور اکتشافی عمل کی تخفیف کی باطل کے نزدیک کبھی روایت نہیں رہی ہے۔ اس کے برخلاف اہل ایمان کے یہاں ایسی غلطی ضرور ہوئی ہے کہ وہ باطل سے قریب تر ہو چکے ہوں۔ لیکن ایسا ہونا حق کی مثالیت کو ہمیشہ مجروح کرتا رہا اور اس کی پاداش میں حق ہمیشہ ہزیمت اٹھاتا رہا ہے۔ تاوقتیکہ اہل حق نے فیصلہ نہ کرلیا ہو کہ وہ اب ہر چیز سے صرف نظر کرکے اور ہر اضطراب سے فارغ ہوکر اور صرف اللہ کی طرف یکسو ہوکر وہ مثالی حالت قائم کریں گے جو معیار مطلوب ہے۔ یعنی جب بھی اہل حق کے یہاں باطل اور اس کے اکتشافی علم، اکتشافی ہنر اور اکتشافی عمل کو دیکھ کر حق کے تقاضوں کو مثالی سطح پر پورا کرنے کے بجائے اکتشافی علم، اکتشافی ہنر اور اکتشافی عمل میں مسابقت کرنے کا عمل شروع ہوا ہے انہیں ہزیمت اور مغلوبیت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا ہے تاوقتیکہ وہ اس فریب وسراب سے نکل کر حق کی مثالی صورتحال قائم نہ کرلیں۔ اس کی خاص وجوہات درج ذیل ہیں:

(۱) باطل ابلیس کی بات مان کر انفاقی علم، ہنر اور عمل کو کلیتا چھوڑ دیتا ہے اور اکتشافی علم، ہنر اور عمل کو اس کے آخری افقی درجوں میں اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے برخلاف حق ایسا نہیں کرتا اور نہ کرسکتا ہے۔ اگر کلی طور پر کرلے تو وہ حق باقی نہیں رہے گا اور بات ختم ہوجائے گی۔ اور نہ کرنے کی صورت میں وہ نتائج برآمد نہیں ہوسکتے جو باطل کے یہاں ہوتے ہیں۔

(۲) اس صورت میں حق انفاقی علم، انفاقی ہنر اور انفاقی عمل کے ساتھ اس کے معیار مطلوب پر چونکہ عمل نہیں کرتا اور اپنی صلاحیتیں واہی تباہی نکات پر صرف کرتا ہے اس لئے وہ امر اسے نصیب نہیں ہوتا جو روئے ارض پر حق کے لئے خاص ہے یعنی 'نصر اللہ' جسے 'نصرۃ' بھی کہا جاتا ہے۔

'نصر اللہ' کیا ہے؟ عالم تکوین وتخلیق میں انسانی انفاقی سطح اور اس کے انفاقی درجہ کے علاوہ وہ ساری عمودی اور افقی سطحیں اور درجے جن کا احاطہ ابلیس بھی نہیں کرسکتا ان کے علم، ہنر اور عمل کا کسی

www.booksbe.net www.urdutube.net prepared by M. Aamir Mehmood www.urdumovies.net www.asraralam.net

وقت خاص میں اللہ تعالیٰ کے ذریعہ حق کے لئے 'مسخر لہٗ' بنا دیا جاتا۔ اس 'نصر اللہ' کے نازل ہونے کے چند مضبوط شرائط ہیں۔ جب وہ شرائط پورے ہوں تو یہ 'نصر اللہ' حاصل رہتا ہے یا ہوتا ہے ورنہ نہیں۔ وہ خصوصیات و شرائط درج ذیل ہیں:

(۱) 'نصر اللہ' ہمیشہ فی زمانہ باطل کی طاقت قوت کے بالمقابل کافی اور حاوی ہوتا ہے۔

(۲) 'نصر اللہ' کی یقینی آخری منزل یہ ہے کہ 'الفتح' نصیب ہو جائے۔

(۳) 'نصر اللہ' انفاقی سطح اور انفاقی درجۂ مثالی کے Proportional ہوتا ہے۔ یعنی فرد حق یا جماعت حق جس قدر انفاقی سطح اور اس کے انفاقی درجۂ مثالی پر ہونگے 'نصر اللہ' اتنا ہی بھر پور ہوگا اور زیادہ ہوگا۔ اس کے برخلاف فرد حق یا جماعت حق کی حقیقی صورتحال انفاقی سطح اور انفاقی درجۂ مثالی سے جتنی ہٹی ہوئی ہوگی یعنی جتنی باطل سے قریب تر ہوگی نصر اللہ اسی قدر کم ہوگا بلکہ ممکن ہے کہ سرے سے ہی نہ ہو۔

(۴) اگر اہل حق معیار مطلوب پر ہیں اور اہل باطل اپنی اکتشافی طاقت و جبروت کی انتہاء پر اور صورتحال یہ ہو کہ بظاہر دونوں کے مابین کسی مقابلہ و محاذ آرائی کا تصور بھی محال ہو تو اس وقت 'نصر اللہ' کا نزول اس طرح ہوتا ہے کہ اہل حق کے سامنے باطل نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ یوں 'نصر اللہ' کی شکلیں ہزاروں سے متجاوز ہیں لیکن اجمالی طور پر انہیں درج ذیل خانوں یا قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے:

(۱) عنایت
(۲) معیت
(۳) ربط قلب
(۴) شد عضد
(۵) شد ملک
(۶) تثبیت
(۷) برہان
(۸) سلطان
(۹) رعب

(۱۰) سکینہ

(۱۱) تائید

(۱۲) المائدہ

(۱۳) آیۃ

(۱۴) کلمۃ

(۱۵) روح

(۱۶) کفل

(۱۷) حیات

(۱۸) قرن

(۱۹) سحر

(۲۰) جنّ

(۲۱) ملائکہ

ان میں سے ہر ایک کے تحت بیسیوں وجوہ واطراف ہیں جن کا ذکر سر دست مقصود نہیں۔ روئے ارض پر خیر و شر کا آخری معرکہ معرکۂ دجال ہوگا۔ یہ معرکہ بنیادی طور پر 'معرکۂ سحر و سحر' ہوگا بلکہ روئے ارض پر معرکۂ سحر و سحر کی سب سے ہیبتناک اور انتہائی شکل۔

جدید سائنس اور جدید ٹکنالوجی

سائنس (علم) کیا ہے؟ ٹکنالوجی (ہنر) کیا ہے؟ جدید سائنس کیا ہے؟ جدید ٹکنالوجی کیا ہے؟ یہ سوالات نہایت اہم ہیں۔ اس تعلق سے جو بات کہی جا سکتی ہے وہ درج ذیل ہیں:

(۱) انفاقی علم ہی اصلی سائنس ہے۔

(۲) انفاقی علم کا انفاقی درجہ میں استعمال اور اس سے استفادہ ہی اصلی اور جائز استعمال اور استفادہ ہے۔

(۳) انفاقی ہنر ہی اصلی ٹکنالوجی ہے۔

(۴) انفاقی ہنر کا انفاقی درجہ میں استعمال اور اس سے استفادہ ہی اصلی اور جائز

استعمال اور استفادہ ہے۔

(۵) اتفاقی علم اور اتفاقی ہنر سے استفادہ کرتے ہوئے مقصد حیات یعنی منصوبۂ ربانی کی تکمیل کرنا ہی اتفاقی عمل صالح ہے۔

(۶) عمل صالح ہی نبوی طریقہ ہے۔

(۷) اکتشافی علم (مشہور سائنس) سحر ہے۔

(۸) اکتشافی علم کا اکتشافی درجہ میں استعمال اور اس سے استفادہ کرنا سحر کرنا، ساحری اور نا جائز ہے۔

(۹) اکتشافی ہنر (مشہور ٹکنالوجی) سحر ہے۔

(۱۰) اکتشافی ہنر کا اکتشافی درجہ یعنی غیر اتفاقی درجے میں استعمال اور اس سے استفادہ کرنا سحر کرنا، ساحری اور نا جائز ہے۔

(۱۱) اکتشافی علم (مشہور سائنس) اور اکتشافی ہنر (مشہور ٹکنالوجی) سے استفادہ کرتے ہوئے روئے ارض کو مسخر کرنا مقصد حیات اور اس پر جاری منصوبۂ ربانی کو منہدم کرنا اور اس سے بغاوت ہے اور یہی عمل غیر صالح ہے۔

(۱۲) روئے ارض پر اللہ کے ہر باغی اور دشمن مثل ابلیس کا یہی طریقہ رہا ہے۔

(۱۳) سائنس و ٹکنالوجی (یعنی مشہور سائنس اور مشہور ٹکنالوجی) سحر ہیں۔

(۱۴) جدید سائنس اور جدید ٹکنالوجی (یعنی موجودہ مغربی سائنس اور موجودہ مغربی ٹکنالوجی) سحر ہیں۔

(۱۵) یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی حق ہیں۔ یعنی یہ حقیقت ہیں۔ یہ کوئی واہمہ نہیں ہیں۔

(۱۶) یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی حق ہیں۔ یعنی ان کا اثر ہوتا ہے۔ یہ اثر واہمہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

(۱۷) یہ جدید سائنس اور جدید ٹکنالوجی حق ہیں۔ یعنی ان کو اور ان کے اثرات کو قوائے محسوسہ سے پایا (مثلاً دیکھا، سنا، چھویا، چکھا اور سونگھا جا سکتا ہے) اور قوت مدرکہ (عقل) سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ 'سحر مبین' ہیں۔

www.booksube.net
prepared by M. Aamir Mehmood

(١٨) یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی حق ہیں۔ یعنی باطل کے ذریعہ ان کے استعمال سے اہل حق اس کا حقیقی اثر محسوس کر کے یا اس کے استفادہ سے محروم کر دیئے جانے پر اس کا حقیقی اثر محسوس کر کے اس سے خوفزدہ ہو جاتے یا ہو سکتے ہیں۔ ایسا خوفزدہ ہونا واہمہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

(١٩) یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی حق ہیں۔ یعنی ان سے اہل ایمان میں دہشت کی کیفیت پیدا ہوتی یا پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ دہشت ایک حقیقت ہے اور کسی واہمہ یا کمزوری ایمان کا نتیجہ نہیں۔ روئے ارض کا سب سے مضبوط ایمان رکھنے والا انسان بھی اس کے مظاہرے سے حقیقی طور پر خوفزدہ ہو سکتا ہے۔

(٢٠) یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی باطل ہیں۔ یعنی یہ سحر یعنی 'مسخر لہ' نہیں۔ اس طرح حاصل کردہ علم اور ہنر اور اس کا استعمال 'ناجائز' اور غیر مجاز ہیں۔ اس لئے کہ یہ اس علم اور ہنر پر مبنی ہیں جو ناجائز طور پر حاصل کردہ ہیں اور استعمال و استفادہ کردہ ہیں۔

(٢١) یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی باطل ہیں۔ یعنی یہ فی الواقع ابلیسی طریقہ ہیں۔ اس لئے باطل ہیں۔ اس طریقہ کو انبیاء اور رسل سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ سحر ان کے خلاف ہمیشہ استعمال ہوئے ہیں۔

(٢٢) یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی باطل ہیں۔ اس لئے کہ یہ 'سنت اللہ'، 'سنت قائمہ' اور سنت نبوی کے خلاف ہیں۔

(٢٣) یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی باطل ہیں۔ اس لئے کہ یہ 'سنت اللہ'، 'سنت قائمہ' اور 'سنت نبوی' کو منہدم کرنے والے ہیں یعنی اہل حق جس تناسب میں اس کا استعمال اور اس سے استفادہ اور اس پر توکل کریں گے اسی تناسب میں وہ سنت اللہ، سنت قائمہ اور سنت نبوی کو منہدم کریں گے۔

(٢٤) یہ جدید سائنس اور یہ جدید ٹکنالوجی مومن کے لئے مضرت رساں اور نقصان دہ اور باطل کے لئے مفید اور نفع بخش ہیں۔ یہ باطل کے لئے مفید اور نفع بخش اس لئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بغاوت کی مدت میں ابلیس اور اس کے متبعین کو مہلت کار دی ہے لہٰذا اس مدت میں اگر وہ ان چیزوں سے استفادہ کرتے ہیں جو ناجائز ہی کیوں نہ ہوں تو انہیں ان کے

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

اندر موجود سنت اللہ سے فائدہ اور نفع مل سکتا ہے۔ لیکن مومن ان سے استفادہ صرف حدود اللہ کو پھلانگ کر ہی کر سکتا ہے اور اس صورت میں اسے وہ نصرتیں نہیں مل سکتیں جن کا ملنا اس صورت میں یقینی ہوتا ہے جب وہ پوری طرح حدود اللہ کی پاسداری کرے اور معیار مطلوب پر قائم رہے۔ لہذا اگر اہل حق اور اہل باطل ایک دوسرے کے خلاف معرکہ حق و باطل میں بیک وقت یکساں سائنس اور ٹکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے کارروائی کریں تو چاہے پہلے اہل حق کو کامیابی مل جائے لیکن بالآخر وہ ناکام ہونگے اور باطل غالب آجائے گا۔ تاہم دین اللہ ہر موجود سطح پر خود ترک اسلحہ (Self Disarmament) کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی عنوۃ حاصل شدہ کسی بھی سطح کے اسلحے کے استعمال سے روکتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر اہل باطل سائنس اور ٹکنالوجی کا استعمال کریں اور اہل حق اتفاقی علم و ہنر کا اتفاقی درجے میں تو خواہ پہلے اہل حق کو بہت نقصان ہو لیکن بالآخر حق غالب آجائے گا اور باطل مغلوب ہو کر رہے گا۔ اس لئے کہ اتنا حصہ جس میں اکتشافی علم و ہنر کے استعمال سے باطل حق پر غالب و قاہر رہتا ہے اللہ کی نصرتوں سے نہ صرف برابر کر دیا جائے گا بلکہ اسے ایک ایسی نصرت بھی ملے گی جس کے سامنے باطل کی ساری اکتشافی علم و ہنر کی قوت بے بس ہو کر رہ جائے گی۔ یہی تاریخ و روداد معرکہ خیر و شر ہے۔

فساد قبل نوح

دجال جلد اول کے صفحات ۲۹۳ تا ۳۴۰ میں ان فسادات کو صرف معروضی طور پر بیان کیا گیا تھا لیکن مزید تفہیم کے لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ انہیں موضوعی اور متعین طور پر بھی بیان کر دیا جائے تا کہ فساد کی سنگینی اور اس کی ہمہ گیری کا درست اندازہ لگایا جا سکے۔ ''کتاب ادریس'' ۱۳ میں مذکور ہے کہ ابلیس جن ملائکہ سے تحالف کرنے میں کامیاب ہوا وہ تعداد میں کل دوسو (۲۰۰) تھے جن میں بیس بڑے اور ان کے ماتحت فی کس دس دس چھوٹے ملائکہ تھے۔ یہ ملائکہ تدبیر عالم کے مختلف امور پر متعین تھے۔ ابلیس نے ان میں رسوخ حاصل کیا، انہیں ورغلایا، اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے اور اپنے علم وقوت کا رضاء الٰہی کے دائرے سے باہر جا کر حتی کہ اس کے خلاف استعمال کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اور اس طرح ان کے ذریعہ اس نے متعلقہ امور میں جن پر یہ ملائکہ متعین تھے فساد انگیزی کی تا کہ حیات انسانی تباہ و برباد ہو جائے۔ بنیادی طور پر ان ملائکہ نے جن امور کے تعلق سے اپنے علوم وقوت کا ناجائز استعمال کیا یا جن کے میکانزم (Mechanism) کی معلومات ابلیس یا اس سے متعلق انسانوں اور دیگر مخلوقات کو دیں جس سے بعد میں فساد برپا ہوا وہ پانچ تھے:

(۱) رمز حیات (Code of Life): رمز حیات سے مراد انسان، جمادات، نباتات، حیوانات اور دیگر مخلوقات کی حیات کا راز ہے جسے تقریب فہم کے لئے Code کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً عالم نفس یا عالم اشیاء میں ان کی حیات کا رمز کیا ہے؟

(۲) رمز افزائش (Code of Pro-Creation): رمز افزائش سے مراد مذکورہ مخلوقات کی حیات نفسانی یا حیات عالم اشیاء میں ان کی افزائش کا راز ہے۔ مثلاً یہ کہ یہ چیزیں عالم اشیاء میں کس طرح بڑھتی ہیں؟

(۳) رمز تربیب (Code of Providence and Sustenance): رمز تربیب سے مراد مذکورہ مخلوقات کی مثلاً حیات نفس یا حیات عالم اشیاء میں ارتباء وارتقاء کا راز ہے۔ یعنی یہ راز کہ عالم میں کوئی نفس کس طرح ارتباء پزیر ہوتا ہے؟

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

(۴) رمز تبدیلی (Code of Transformation : Interchange, Intrachange (vice versa): رمز تبدیلی سے مراد ان مخلوقات کی حیات عالم اشیاء میں تبدیلیٔ باہم کا راز کیا ہے؟

(۵) رمز موت (Code of Death): رمز موت سے مراد ہے ان مخلوقات کی حیات عالم اشیاء میں موت واقع ہونے کا راز کیا ہے؟ اور اس موت کی کیا حقیقت و ہیئت ہے؟

چنانچہ ابلیس سے تحالف کے بعد ان ملائکہ نے ارض و ماوراء ارض میں ابلیس کی رضاء کے مطابق مذکورہ امور میں تصرف بیجا کرنا شروع کیا۔ لہذا بہت جلد پورے کرہ ہای ارض اور ماوراء ارض کے ملکوت میں فساد برپا ہونا شروع ہوگیا۔ چونکہ ان کا تعلق عالم خلق کی دونوں سمتوں یعنی فردی و کلی (Microcosmic & Macrocosmic) سے تھا لہذا دیکھتے دیکھتے ان دونوں ہی جہتوں کے اعتبار سے ان فسادات نے فساد عظیم کا رخ اختیار کرلیا۔ ہر چند کہ یہ کام ابلیس نے معرکۂ خلافت کے تعلق سے کیا تھا اور اس کا اصلی نشانہ بنی آدم تھا لیکن اس کی لپیٹ میں گویا زمین اور زمین کی قریبی ساری کائنات آگئی۔ چونکہ اس فساد انگیزی کے ذریعہ اللہ کی جاری سنتوں کا اس کی رضاء کے خلاف استعمال کیا گیا تھا لہذا جلد ہی کائنات کے اس حصے میں ربانی نظام میں تبدیلی، بگاڑ، تعطل یا کجی پیدا ہوگئی۔ گویا ابلیس نے اس بات کی کوشش کی کہ حیات انسانی اور ماحول حیات انسانی میں ربانی نظام معطل و مفلوج اور ابلیسی نظام جاری و ساری ہو جائے تاکہ نتائج اس کی مرضی کے عین مطابق برآمد ہوں۔ قرآن، تاریخ انسانی اور آفاق و انفس میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ امور جن میں ابلیس کو کامیابی ملی درج ذیل تھیں:

(۱) بین نجومی انتظام (Intrastellar Management)

(۲) شمسی انتظام (Solar System Management)

(۳) بین سیاراتی انتظام (Inter-Planetary Management)

(۴) ارضی انتظام (Planet or Gaia Management)

(۵) ارضی ماحولیاتی انتظام (Environmental & Ecological Management)

(۶) نباتاتی انتظام (Botanical Management)

(۷) حیواناتی انتظام(Zoological Management)

(۸) جماداتی انتظام(Geological Management)

(۹) انسانی انتظام(Human Management)

چنانچہ ان امور میں ربانی انتظام کا جزوی یا کلی تعطل اور اس کی جگہ ابلیسی انتظام کا اجراء یا تسلط طرح طرح کے فسادات برپا کرنے کا موجب بن گئے۔ اسی طرح چند ہی سو سالوں میں ایک ہمہ گیر فساد برپا ہو گیا۔ اس فساد کی درجہ بندی درج ذیل طریقہ سے کی جا سکتی ہے:

(۱) فساد ماوراء نظام شمسی(Intra-Stellar Disorder)

(۲) فساد نظام شمسی(Solar System Disorder)

(۳) فساد نظام تحتی خلاء(Lower Space Disorder)

(۴) فساد کرۂ برق(Ionospheric Disorder)

(۵) فساد کرۂ عنان وحزن(Synnophic Disorder)

(۶) فساد کرۂ ہوا(Biospheric Disorder)

(۷) فساد کرۂ آب ارضی(Terrestrial Water Disorder)

(۸) فساد کرۂ بحر(Hydrospheric Disorder)

(۹) فساد کرۂ زمین(Lithospheric Disorder)

(۱۰) فساد عالم نباتات ارض(Botanical World Disorder)

(۱۱) فساد عالم حیوانات ارض(Zoological World Disorder)

(۱۲) فساد عالم حشرات الارض (Terresterian & Sub-Terrestrian Animate Disorder)

(۱۳) فساد عالم انسان(Human World Disorder)

چونکہ یہ فسادات ہمہ گیر تھے لہذا ان کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ بھی ہمہ گیر تھے جن کو ہزاروں شعبوں میں شمار کیا جا سکتا ہے لیکن ان میں سے ایک ایسا فساد بھی برپا ہوا جس کے نتیجے میں روئے ارض اور ماوراء ارض میں کئی نئی مخلوقات اور ذی روح پیدا ہو گئیں جو بے حد خطرناک تھیں اور یہ نئی مخلوقات پیدا ہونے کے بعد خود نظام کائنات کو درہم برہم کرنے لگیں۔ فساد علی

الفساد کی یہ صورت نا قابل بیان تباہیوں کا باعث ہوئی۔ ان نئی اور خطرناک مخلوقات کو تین خانوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے:

(۱) ماوراء ارضی نئی مخلوقات (Trans-terresterial New Creatures)

(۲) ارضی وفضائی نئی مخلوقات (Terresterial & Aerial New Creatures)

(۳) تحت وطبقات ارضی نئی مخلوقات (Sub-terresterial New Creatures)

ماوراء ارضی نئی مخلوقات: ماوراء ارضی نئی مخلوقات میں ظاہر ہے انسانی جز نہیں کے برابر تھا اس لئے کہ ان کا دائرۂ حیات اور دائرۂ عمل ماوراء ارضی تھا۔ ماوراء ارضی کے دائرے میں چونکہ یہ زمین بھی آتی ہے اس لئے یہ نئی اور خطرناک مخلوقات ستاروں، نظام شمسی اور سیاروں کی طرح اس زمین پر بھی آمدورفت، چلت پھرت اور عمل دخل رکھتی تھیں۔ یہ کتنی طاقت ور اور انسانی قوت کے تصور سے ماوراء تھیں کہ انسانوں کو ان پر مافوق الفطرت ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

قرآن نے ان کی اقسام چھ شمار کی ہیں: قرآن کا ارشاد ہے:

وقالوا لاتذرن الھتکم ولاتذرن ودا ولا سواعا ولا یغوث ویعوق ونسرا
(نوح ۲۳)

ترجمہ: اور وہ سب بولے ہرگز نہ چھوڑیو اپنے آٹھوں کو اور نہ چھوڑیو ود کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق اور نسر کو

یہ چھ مخلوقات تھیں:

(۱) **آلہ**
(۲) **ود**
(۳) **سواع**
(۴) **یغوث**
(۵) **نسر اور**
(۶) **یعوق**

prepared by M. Aamir Memon

ارضی وفضائی نئی مخلوقات: ارضی وفضائی نئی مخلوقات ماوراء ارض نئی مخلوقات کے مقابلے میں کم طاقت ور اور کم خطرناک تھیں مگر انسانوں کے لئے اتنی ہی خطرناک تھیں۔ یہ نئی مخلوقات پوری روئے زمین اور اس کی فضا میں اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ عمل دخل رکھتی تھیں۔ ان میں سے بعض زمین پر چلنے والی اور بعض زمین پر چلنے اور فضا میں اڑنے والی دونوں ہی تھیں۔ قرآن نے ان ارضی وفضائی نئی مخلوقات کی پانچ قسمیں شمار کی ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) جبار
(۲) نفل
(۳) نفر
(۴) عفریت
(۵) انسان غیر صالح

غیر صالح انسان انسان ہوتے ہوئے انسان نہیں تھے۔ ''غیر صالح'' قرآن کی ایک مخصوص اصطلاح ہے بطور خاص اس وقت جب کہ اس کا استعمال طوفان نوح سے قبل کی فضا میں کیا جا رہا ہو۔ ایسی حالت میں ''غیر صالح'' کا مفہوم اس مفہوم سے قطعاً الگ ہوتا ہے جو عام طور پر احادیث، فقہ اور اخلاقیات کے تناظر میں پایا جاتا ہے۔ عہد طوفان نوح سے ماقبل کے تناظر میں اس کا مفہوم ہے رموز حیات، افزائش، ترتیب، تبدیلی اور موت سے عبارت ربانی نظام کو معطل، مفلوج یا تبدیل کر کے ابلیسی خواہشات اور طریقہ کے مطابق پیدا شدہ، پروردہ یا تبدیل شدہ انسان نما پیکر وجود۔ چنانچہ فساد ملکوت کے زمانے میں ایسے بہت سے انسان نما پیکر وجود پیدا ہوئے جن کی متعدد قسمیں بھی تھیں۔

تحت وطبقات ارضی نئی مخلوقات: تحت وطبقات ارضی نئی مخلوقات جو اس فساد انگیزی کے نتیجے میں پیدا ہوئیں وہ بھی ماقبل کی دونوں قسموں سے کم خطرناک نہیں تھیں۔ یہ مخلوقات عموماً زمین پر رینگنے والی، دوڑنے والی، پھدکنے والی یا اڑنے والی مگر زیر زمین رہنے والی تھیں۔ یہ عام طور پر دیو ہیکل ہوا کرتی تھیں۔ قرآن نے ان میں تین مخلوقات کا ذکر صراحتاً کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) دابہ
(۲) نملہ

(۳) یاجوج ماجوج

اس تعلق سے جہاں یہ بات ممکن ہے کہ یہ ماوراء ارضی، ارضی وفضائی اور تحت وطبقات ارضی نئی مخلوقات اس دور فساد ملکوت میں بالکل پہلی بار پیدا ہوئی ہوں وہیں یہ بات بھی ممکن ہے کہ یہ کروڑوں اور اربوں سال قبل کائنات میں پیدا کی گئیں ہوں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ارتباء کی ناکامی کے سبب ختم کر دیا ہو لیکن ملائکہ سے تحالف کر کے ابلیس نے ان فنا کردہ مخلوقات کو از سر نو پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہو جیسا کہ آج یوراسک پارک (Jurassic park) کی تشکیل کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

بہر حال اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان فسادات کے سبب جو ملکوت میں برپا کیے گئے تھے زمین اور ماوراء زمین کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چند ہی سو سالوں کے اندر اندر ہر طرف ربانی نظام مفلوج اور ابلیسی نظام کا تسلط ہو گیا ہوگا اور چند نفوس قدسیہ اور چند جاندار اور پیڑ پودوں کو چھوڑ کر بقیہ روئے ارض و ماوراء ارض کائنات پوری طرح فساد آلودہ ہو گئی ہونگیں۔ حاصل بحث یہ ہے کہ حضرت ادریس کے ذوالکفل بنا دیئے جانے کے بعد ابلیس نے منہج سفک دم یعنی منہج خوں ریزی کو ترک کر دیا۔ اب اس کی ساری توجہ ارض وسماء میں فساد ملکوت کے ذریعہ بنی آدم کو تباہ کرنے کی طرف ہو گئی۔ چنانچہ روئے ارض پر جہاں دیگر مخلوقات کے مابین بنی آدم افزائش کے مرحلے سے گزر رہے تھے اور بہت ممکن ہے کہ ان کی تعداد لاکھوں بلکہ کروڑوں سے متجاوز ہو چکی ہو ابلیس نے ایک ایسی فکر اور تہذیب کی بنیاد ڈالی جس کے پیچھے بنیادی محرک ملکوت کو مسخر کرنے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق ربانی طریقے کے بجائے اپنے طریقے سے چلانے کا عزم تھا۔ لہذا تھوڑے ہی عرصے میں بنی نوع انسان میں سے ایک تعداد نے ابلیس کے ساتھ تحالف کر لیا اور بقیہ آبادی ان کے ہاتھوں میں مجبور محض ہو گئی۔ تدبیر عالم پر متعین بعض ملائکہ کے حلیف ہونے کے سبب ملکوت پر ابلیس کا جو تسلط قائم ہوا اور اس سے جو طاقت ہاتھ آئی وہ سبب بنی بقیہ انسانی آبادی کے ان کے ہاتھوں مجبور محض بن جانے کا۔ ایسی حالت میں عالم انسانیت کے وہ چند نفوس قدسیہ جو ثابت قدم رہ گئے تھے اور جنہوں نے ابلیس کی بالادستی قبول نہیں کی وہ پورے معاشرے سے کاٹ کر رکھ دیئے گئے تھے اور ابلیس کے ذریعہ حاصل کردہ اس قوت قاہرہ کے سامنے وہ تقریباً بے بس ہو چکے تھے۔ یہی وہ حالت ہے جس کا

www.booksube.net
prepared by M. Aamir Mehmood
www.urdumoviez.net
www.astraralam.net

اندازہ درج ذیل آیات سے ہوتا ہے:

(۱) قال الملاء من قومه انا لنراک فی ضلال مبین (الاعراف ۶۰)

ترجمہ: بولے ملاء اس کی قوم کے ہم دیکھتے ہیں تجھ کو صریح گمراہی میں۔

(۲) قال الملاء الذین کفروا من قومه انا لنرک فی سفاهة وانا لنظنک من الکذبین (الاعراف ۶۶)

ترجمہ: بولے سردار جو کافر تھے اس کی قوم میں ہم تو دیکھتے ہیں تجھ کو عقل نہیں اور ہم تو تجھ کو جھوٹا گمان کرتے ہیں۔

(۳) فاجمعوا امر کم وشر کاء کم ثم لایکن امر کم علیکم غمة ثم اقضوا الیّ ولاتنظرون (یونس ۷۱)

ترجمہ: اب تم سب مل کر مقرر کرو اپنا کام اور جمع کرو اپنے شریکوں کو پھر نہ رہے تم کو اپنے کام میں شبہ پھر کر گزرو میرے ساتھ اور مجھ کو مہلت نہ دو۔

(۴) ولا اقول لکم عندی خزائن الله ولا اعلم الغیب ولا اقول انی ملک ولااقول للذین تزدری اعینکم لن یوتیهم الله خیرا (ہود ۳۱)

ترجمہ: اور میں نہیں کہتا تم کو کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے اور نہ میں خبر رکھوں غیب کی اور نہ کہوں کہ میں ملک ہوں اور نہ کہوں کہ جو لوگ تمہاری نظر میں حقیر ہیں نہ دے گا ان کو اللہ بھلائی۔

(۵) قالوا انؤمن لک واتبعک الارذلون (الشعراء ۱۱۱)

ترجمہ: بولے کیا ہم تجھ کو مان لیں اور تیرے ساتھ ہو رہے ہیں کمینے

(۶) قالوا لئن لم تنته ینوح لتکونن من المرجومین (الشعراء ۱۱۶)

ترجمہ: بولے اگر تو نہ چھوڑے گا اے نوح تو ضرور سنگسار کر دیا جائے گا

(۷) ونجینه واهله من الکرب العظیم (الصافات ۷۶)

ترجمہ: اور بچادیا اس کو اور اس کے گھر والوں کو اس بڑی گھبراہٹ سے

(۸) وقوم نوح من قبل انهم کانوا هم اظلم واطغی (النجم ۵۲)

ترجمہ: اور نوح کی قوم کو ان سے پہلے وہ تو تھے اور بھی ظالم اور سرکش

(۹) فدعاربه انی مغلوب فانتصر (القمر ۱۰)

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asroralam.net

ترجمہ: پھر پکارا اپنے رب کو کہ میں مغلوب ہوگیا اب تو ہی مدد کر

(۱۰) ومکروا مکرا کبارا (نوح ۲۲)

ترجمہ: اور مکر کیا بہت بڑا مکر۔

یہ وہ حالات تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا: حضرت نوح روئے ارض پر سب سے پہلے اولی العزم رسول بن کر تشریف لائے۔ ان کی پیدائش خود ایک آیت باھرہ تھی۔

''کتاب نوح'' میں مذکور واقعہ اس کی اچھی تفہیم کراتا ہے:

''حضرت ادریس نے کہا: اس کے چند دنوں کے بعد میرے بیٹے متو صالح نے اپنے بیٹے لامخ کی شادی کر دی اور وہ خاتون حاملہ ہوگئی اور اس نے ایک بیٹا جنا۔ اس (بچے) کا جسم برف سے زیادہ سفید اور گلاب سے زیادہ سرخ کھلتا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال اور دراز زلفیں رکاکل اون سے زیادہ سفید تھیں اور اس کی آنکھیں حسین تھیں۔ جب اس (بچے) نے آنکھیں کھولیں تو سارا گھر سورج کی طرح جگمگا اٹھا اور سارا گھر بقعۂ نور ہوگیا۔ دائی کے ہاتھوں میں جاتے ہی وہ کھڑا ہوگیا اور اس نے اپنے دہن کھولے اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح کی۔ (یہ دیکھ کر) اس کے والد لامخ اس سے خوفزدہ ہوگئے اور بھاگ کر اپنے والد متو صالح کے پاس آئے اور ان سے فرمایا: میرے ہاں ایک عجیب وغریب بیٹا تولد ہوا ہے جو انسانوں سے مختلف ہے اور آلھوں (ابناءِ نور) سے ملتا جلتا ہے۔ اس کی فطرت بھی مختلف ہے وہ ہماری طرح بھی نہیں ہے۔ اسکی آنکھیں ایسی ہیں گویا ان سے سورج کی کرنیں نکل رہی ہوں اور اس کا چہرہ پر وقار ہے۔ (اسے دیکھ کر) مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ میری اولاد نہیں بلکہ ملک کی اولاد ہے۔ مجھے خوف ہے کہ اس کے عہد حیات میں روئے ارض پر کوئی عجیب وغریب واقعہ رونما ہوگا۔ اور اب اے میرے والد محترم! میں درخواست لیکر آیا ہوں اور التجا کرتا ہوں کہ آپ (ہمارے جد) حضرت انس (ادریس) کے پاس جائیں اور ان سے دریافت کریں کہ اس (ولادت) کی حقیقت کیا ہے؟ اس لئے کہ ان (حضرت انس ادریس) کا مسکن ملائکہ کے مابین ہے۔ جب متو صالح نے اپنے بیٹے کی باتیں سنیں تو وہ میرے پاس افق کے قریب آیا اس لئے کہ اس نے سنا تھا کہ میں وہاں ہوں اور اس نے زور سے پکارا یہاں تک کہ میں نے اس کی آواز سنی اور اس کے پاس آیا۔ میں نے اس سے کہا: دیکھو! میں یہاں ہوں،

prepared by Mr. Aamir Mehmood
www.aisaalam.net

میرے بیٹے! تم میرے پاس کس غرض سے آئے ہو؟ چنانچہ اس نے جواب دیا اور کہا: میں ایک بڑی فکر اور پریشانی کی وجہ سے آپ کے پاس آیا ہوں اور ایک بڑی پریشان کن رویت میرے آنے کا سبب ہوئی ہے۔ اور اب ابا جان میری بات سنئے۔ میرے بیٹے لامخ کے ہاں ایک بیٹا تولد ہوا ہے جو اوروں سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی فطرت انسانوں کی طرح نہیں۔ اس کے جسم کی رنگت برف سے زیادہ سفید اور گلاب سے زیادہ سرخ کھلتا ہوا ہے۔ اس کے سر کے بال اون سے زیادہ سفید ہیں، اسکی آنکھیں سورج کی کرنوں کے مثل ہیں (پیدا ہوتے ہی) جیسے اس نے آنکھیں کھولیں سارا گھر منور ہوگیا، اور وہ دائی کے ہاتھوں میں کھڑا ہوگیا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کی، (یہ دیکھ کر) اس کے والد لامخ خوفزدہ ہوگئے اور بھاگ کر میرے پاس آئے۔ اسے یقین ہی نہیں ہے کہ وہ اس کی اولاد ہے۔ اس لئے کہ وہ ملک السمٰوٰت سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ اور دیکھئے میں آپ کے پاس اسی لئے آیا ہوں تا کہ آپ اس کی حقیقت سے ہم سب کو آگاہ کریں۔ تب میں انس (ادریس) نے جواب دیا اور کہا: اللہ رب العالمین روئے ارض پر ایک عجیب چیز کرنے والا ہے۔ اور اسے میں نے رؤیت میں دیکھا ہے۔ اور اب اسکی تمہیں خبر دیتا ہوں کہ میرے والد حضرت یرد کے عہد میں بعض ملائکہ نے کلمۃ اللہ کے تقدس کو پامال کیا۔ اور جان لو کہ ان لوگوں نے گناہ کیا اور حق کی خلاف ورزی کی اور خود کو عورتوں سے مزوج کیا اور ان کے ساتھ گناہ کئے، بعض نے ان میں سے بعض سے شادی کرلی اور ان سے اولادیں ہوئیں۔ انہوں نے روئے زمین پر جبار پیدا کئے یہ جبار روح کے مطابق نہیں بلکہ لحم کے مطابق پیدا کئے گئے، اور (اسی وجہ سے) روئے ارض پر بڑی بھاری سزا کا نفاذ ہونے والا ہے۔ اور روئے ارض تمام نجاستوں سے پاک کردی جائے گی۔ پوری روئے زمین پر ایک بڑی تباہی مقدر ہو چکی ہے اور ایک بڑی تباہی اور ایک بڑا اسیلاب آئیگا جو ایک سال تک رہے گا۔ اور یہ بیٹا جو تمہارے یہاں تولد ہوا ہے زمین پر زندہ بچ جائے گا اور اس کے تین بیٹے اس کے ساتھ بچیں گے۔ جبکہ روئے ارض پر ساری خلقت آدم ماری جائے گی۔ اور اب اپنے بیٹے لامخ کو بتادو کہ تولد ہونے والا وہ بیٹا اسی کا ہے اس کا نام نوح رکھو اس لئے کہ صرف وہی بچالیا جانے والا ہے۔۔۔۔ جب متو صالح نے اپنے والد حضرت انس (ادریس) کی باتیں سنیں اور انہوں نے اسے سارے راز سربستہ کھول کر دکھادیے تھے۔ تو وہ واپس آئے اور لوگوں کو وہ باتیں بتائیں اور اس بچے کا نام نوح رکھدیا اس

لئے کہ وہی زمین کی تباہی کے بعد اسے پھر استوار کرے گا۔“

اسی سنگین صورتحال میں جس کا ذکر ابھی کیا گیا حضرت نوح علیہ السلام مبعوث فرمائے گئے۔ ارض و ماوراء ارض میں ہر جگہ پھیلا فساد ملکوت اللہ تعالیٰ سے اصلاح احوال کے لئے کلی تباہی کا تقاضا کر رہا تھا تا کہ از سر نو تعمیر بلکہ تخلیق کی جائے۔ لیکن روئے ارض پر نوع آدم کی موجودگی خواہ وہ چند نفوس قدسیہ تک ہی محدود کیوں نہ رہ گئی ہو۔ ان میثاقوں کے تحت جو حضرت آدم اور حضرت ہابیل کی بحائی حیثیت آدم کے تعلق سے کئے گئے خدمات و اعمال کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے رحمت و فضل کئے تھے۔ لہذا ان رحمتوں کے بعد ایسا کرنا خود عنداللہ درست نہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس فساد کے خاتمے کے لئے سہ رویہ اقدامات (Three-Dimensional Operation) کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے کہ وہ سزا دینے سے قبل بھی مخلوق کو پلٹ آنے کا موقع عنایت فرماتے ہیں۔ لہذا اس سنگین صورتحال کے باوجود بھی اللہ نے پلٹ آنے کے مواقع عنایت فرمائے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

وما اهلكنا من قرية الا لها منذرون ذكرا وما كنا ظلمين (الشعراء ۹۔ ۲۰۸)

ترجمہ: اور کوئی آبادی نہیں غارت کی ہم نے جس کے لئے نہیں تھے ڈر سنانے والے یاد دلانے کو اور ہمارا کام نہیں ہے ظلم کرنا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تا کہ وہ اس کلی عذاب سے قبل بنی آدم کو بچانے کی سعی فرمائیں۔

اس فساد ملکوت کے خاتمے کے لئے سہ رویہ اقدامات درج ذیل تھیں:

(۱) مقرب ملائکہ بالخصوص حضرت میکائل اور حضرت جبریل کے ذریعہ اقدامات

(۲) حضرت ادریس ذوالکفل کے ذریعہ اقدامات اور

(۳) طوفان یعنی فار تنور اور پھر بلع ماء، قلع سماء، فیض ماء، قضی امر اور استوی علی الجودی کے ذریعہ اقدامات

حضرت نوح علیہ السلام نے تمام روئے ارض کے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا اور انہیں اس فساد عظیم سے آگاہ کیا۔ جو عالم انسانیت کو چاروں طرف سے گھیر چکا تھا۔ انہوں نے لوگوں کو صاف صاف متنبہ کیا اور پکارا کہ لوگ اس فساد عظیم کا جسے ابلیس نے بھڑکایا ہے حصہ نہ بنیں اور

اس کی حقیقت کو سمجھ کر اللہ کی طرف اور اپنے منصب کی حفاظت کی طرف متوجہ ہوں۔ اور حضرت نوح نے انذار کا آغاز فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ان تینوں اقدامات کو وقفے وقفے سے روئے ارض پر روبہ عمل لانے کا فیصلہ فرمالیا۔ چنانچہ یہ تینوں اقدامات اسی ترتیب سے نافذ العمل ہوئے۔ ممکن ہے کہ ان تینوں کی تعمیل میں کئی کئی سو سالوں کا وقفہ رہا ہو مگر یہ واضح ہے کہ ان تینوں اقدامات کا زمانہ حضرت نوح علیہ السلام کا عہد ہی ہے۔ یہ طوفان روئے ارض پر اس وقت آیا جب آپ کی عمر شریف تقریباً چھ سو سال ہو چکی تھی۔ یعنی نوح علیہ السلام کے ذریعہ لوگوں کے مابین بلاغ مبین، نصح مبین اور انذار مبین کا زمانہ قبلِ طوفان تقریباً ساڑھے پانچ سو سال سے زیادہ کا رہا ہے۔

دجال جلد اول میں حضرت ذوالقرنین سے متعلق اس عاجز نے لکھا تھا: ''کہ یہ زمانہ حضرت نوح سے قبل یا فوراً قبل کا زمانہ تھا یا خود حضرت نوح کے ساتھ ساتھ ہی یہ زمانہ آیا''۔ (دجال جلد اول صفحہ ۳۱۵) اب بعض باوثوق شہادتوں کے ملنے کے بعد میں کسی قدر جزم کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تینوں واقعات علی الترتیب حضرت نوح علیہ السلام کے ہی عہد اول یعنی پیدائش اور طوفان کے درمیان وقوع پزیر ہوئے۔ اس فساد عظیم اور مکر کبار کے خاتمے کے لئے ربانی اقدامات کی ہی وہ روداد ہے جس کا ذکر قرآن نے متعدد مقامات پر اور بالخصوص سورہ نوح، سورہ الکھف اور سورہ ہود میں کیا ہے جس کی تطبیق کرنے میں بیشتر مفسرین متقدمین ومتاخرین ناکام رہے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ حضرت نوح کے ذریعہ دعوت دیئے جانے کو جب ایک عرصہ گزر گیا تو سب سے پہلے اقدام کے بطور اللہ تعالیٰ نے باغی ملائکہ اور ماوراء ارضی ذی مخلوقات کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا۔ ان اقدامات سے قبل اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو آگاہ کر دیا کہ وہ کیا اقدامات کرنے جا رہا ہے ظاہر ہے کہ امر کی ایسی اطلاع کسی نبی کو اپنی امت کے تعلق سے کس قدر پریشان اور مضطرب کرنے والی ہوگی۔ حضرت نوح کا یہی اضطراب ان کے قول وعمل کے ہر مقام پر جھلکتا ہے۔

باغی ملائکہ اور ماوراء ارضی ذی مخلوقات کے خلاف اقدام کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت میکال، حضرت جبرئیل اور چند دوسرے ملائکہ کو حکم جاری فرمایا۔ چنانچہ ان ملائکہ نے ان باغی ملائکہ کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا۔ باغی ملائکہ اس کارروائی کو دیکھ کر بھاگے۔ تو ان ملائکہ نے

www.urdudunia.net
prepared by M. Aamir Mehmood

ان کا پیچھا کیا اور انہیں گرفتار کر لیا۔ ان باغی ملائکہ کے متعلق انہیں حکم دیا گیا کہ انہیں عذاب نار میں ڈال دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس کے بعد حضرت میکال وحضرت جبریل نے ان تمام ماوراء ارضی نئی مخلوقات کو قابو میں کرنے کے اقدامات کئے چنانچہ یہ مخلوقات تین قسموں کے انجام سے دو چار ہوئیں:

(۱) ان مخلوقات میں سے بیشتر حضرت میکال وجبریل کے ہاتھوں ماردی گئیں۔

(۲) ان میں سے بعض گرفتار ہو کر کائنات میں مختلف مقامات پر قیامت کے قریب ایک مدت خاص تک کے لئے مقید کر دی گئیں۔

(۳) بعض کائنات کے دور دراز علاقوں میں جا کر پوشیدہ ہونے میں کامیاب ہو گئیں چنانچہ ان کے دائرۂ ارضی میں داخل ہونے پر ایک مدت خاص تک کے لئے پابندی لگا دی گئی۔ یہی وہ اقدامات ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس طرح فرمایا ہے:

وقالو الاتذرن الھتکم ولاتذرن ودا ولاسواعا ولایغوث ویعوق ونسرا وقد اضلوا کثیر اولا تزدالظلمین الا ضلالا. مما خطیئتھم اغرقوا فادخلوا نارا. فلم یجد والھم من دون اللہ انصارا (نوح ۲۵۔۲۳)

ترجمہ: اور بولے ہرگز نہ چھوڑیو اپنے ٹھاکروں کو اور نہ چھوڑیو ودکو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق اور نسر کو اور بہکا دیا بہتوں کو اور تو نہ زیادہ کرنا ظالموں کو مگر بھٹکنا۔ جو کچھ خطا کی تھی اس کے سبب وہ پیچھا کر کے گرفتار کر لئے گئے اور ڈال دیئے گئے نار میں پھر نہ پائے اپنے واسطے انہوں نے اللہ کے سوا کوئی مددگار۔

مفسرین کرام عام طور پر دو امور کے سمجھنے سے قاصر رہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بعد جس طرح نفد علم ہوا ہے اس صورتحال میں ایسا ہونا بعید از قیاس نہیں۔ چنانچہ ان دو امور کے نہ سمجھنے کی حالت نے بیشتر مفسرین کو بالآخر ”**مما خطیتھم اغرقوا فادخلوا نارا**“ کی لاطائل اور لایعنی تاویلات کرنے پر مجبور کیا۔ لہٰذا ان لایعنی تاویلات نے آگے چل کر قرآن کے نظم سے متعلق مزید پیچیدگیاں پیدا کر دیں جن کا حل کرنا مزید توڑ مروڑ کرنے کا باعث ہوا۔ نظم کی یہ پیچیدگی اس لئے پیدا ہوئی کہ قرآن اس کے بعد ذکر کرتا ہے:

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

وقال نوح رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا (نوح۲۶)

ترجمہ: اور پکارا نوح نے اے رب! مت چھوڑ زمین پر کافروں میں سے ایک بستی

وہ دو امور جن کا نہ سمجھ پانا ان ساری لایعنی تاویلات کے وضع کرنے کا باعث ہوا درج ذیل ہیں:

(۱) آلھہ، ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کا اور انہیں نہ چھوڑنے کا مفہوم۔

(۲) اغرقوا کا مفہوم۔

آلھہ، ود، سواع وغیرھم سے متعلق عام طور پر اس خیال کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ پہلے زمانے کے کچھ بزرگ لوگ تھے۔ ان بزرگوں کی وفات کے بعد شیطان کے اغوا سے لوگوں نے ان کی تصویریں بطور یادگار بنا کر کھڑی کر لیں پھر ان کی تعظیم میں غلو ہوا بالآخر ان کی پرستش ہونے لگی اور وہ دیوتا اور معبود بنا لئے گئے یہاں تک کہ بعض روایات کے مطابق عہد جاہلیت میں عرب بھی انہیں معبودوں کی طرح پرستش کرنے لگے ۱۵

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ان باتوں کا حضرت نوح علیہ السلام کے عہد سے متعلق مذکوران آیات سے دور دور کا کوئی تعلق نہیں۔ مفسرین نے جن تفصیلات کو درج کیا ہے وہ یقیناً واقع ہوئیں ہونگیں لیکن اس وقت نہیں جن کا ذکر ان آیات میں ہے بلکہ بعد میں۔ یہاں جن امور کا تذکرہ قرآن کر رہا ہے وہ اس سے الگ ہیں۔ جس وقت حضرت نوح اللہ تعالیٰ کو پکار رہے تھے اور جن پر قرآن کی یہ آیات شاہد ہیں اس وقت تھوڑے ہی عرصہ قبل تک یہ ود اور سواع ان کے درمیان زندہ تھے اور ابلیس اور اہل باطل کے دست و بازو تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی زندہ موجودگی اور بعدہٗ ان کی معبودوں کی طرح پرستش کے درمیان کئی ہزار سالوں کا وقفہ ہے اور اس دوران کئی مرحلے گزرے ہیں جن کا تعلق ان آیات سے نہیں۔ یہ مرحلے درج ذیل ہیں:

(۱) عہد وثنیت یا بت پرستی کا عہد

(۲) عہد صنمیت یا تصور، تصویر و علامات پرستی کا عہد

(۳) عہد نسبت یا عقیدت، تعلق، اور نسبت کا عہد

(۴) عہد حیات یا حقیقی وجود کا عہد

طوفان نوح کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال کے بعد آلہ، ود وغیرھم عہد صنمیت میں داخل ہوئے یعنی ان کی تعظیم کی جانے لگی اور بعض لوگوں نے ان کی یاد کو مستحکم بنانے کے لئے انہیں تصویروں کا روپ دیا جو مرجع تعظیم بنیں۔ جہاں تک ان کی بت تراشی اور بت پرستی کا سوال ہے تو وہ مزید کئی ہزار سالوں بعد کا واقعہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نام دراصل ان ماوراء ارضی مخلوقات کے اسم جنس ہیں جنہیں حضرت یرد کے عہد سے ابلیس نے تدبیر عالم پر متعین بعض ملائکہ کے ساتھ تحالف کر کے اور نور، ظلمت (قرآن نور کے فقدان کو ظلمت قرار نہیں دیتا بلکہ ایک مستقل تخلیق قرار دیتا ہے)، نار اور ارض اور اسی طرح دیگر امور کے رموز حیات، افزائش، ترتیب، تبدیلی اور موت کو اپنی مرضی کے مطابق اور ان میں جاری ربانی سنتوں کا رضاء ربانی کے خلاف استعمال کر کے عالم وجود میں لا دیا تھا اور جو اب ان انسانوں اور دیگر مذکورہ مخلوقات کے ساتھ مل کر جو اسی طرح ابلیس کی ایماء پر خلق کی گئی تھیں ابلیسی منصوبے کے تحت ارض و ماوراء ارض میں فساد برپا کر رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ماوراء ارضی مخلوقات مثلاً الھہ، ود، وغیرھم اسی طرح کی دیگر فسادی ارضی و تحت ارضی مخلوقات کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور اور محیر العقول قوت کی مالک، غیر معمولی اور فوق البشری کاموں کو سرانجام دینے کی اہل اور سب سے اہم بات یہ کہ عام انسانی قوت اور اس کی دسترس سے کلیتاً باہر اور آزاد اور ارض و ماوراء ارض کے علاقوں میں بے روک ٹوک آنے جانے پر قادر تھیں۔

چنانچہ ابلیس ان پر نازاں تھا اور ابلیسی افراد و طبقات بالخصوص ابلیسی انسان ان کی مدد کے سہارے بے پناہ قوت کے مالک ہو چکے تھے۔ جس اقتدار کے سامنے حضرت نوح علیہ السلام نے ابتداء اعلاء کلمۂ حق کیا وہ اقتدار انہیں مخلوقات کے سہارے اس قوت قاہرہ کا حامل ہو چکا تھا جس کو چیلنج کرنا کسی انسان کے بس سے باہر تھا۔ چنانچہ انکے بل بوتے پر برے افراد کے سامنے اچھے افراد بالکل بے بس اور مجبور محض بنا کر رکھ دیئے گئے تھے جنہیں وہ کبھی سفیہ اور کبھی ارذل کہہ کر پکارتے تھے۔

بالآخر پہلے مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو ان باغی ملائکہ کو زیر کروایا اور دوسری طرف ان ماوراء ارضی مخلوقات کی بیخ کنی کی۔ اور یہ دونوں ہی کام ان ملائکہ کے ذریعہ سرانجام دیئے گئے جن کی سربراہی حضرات میکال و جبریل علیہما السلام کر رہے تھے۔ اس طرح ابلیس اور

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

ابلیسی لوگوں کا ایک بڑا اور طاقت ور بازو ٹوٹ کر رہ گیا۔ ان میں باغی ملائکہ تو عذاب نار کے حوالے کر دیئے گئے اس لئے کہ وہ اس درجہ تکلیف اور اختیار کے مالک نہیں تھے جس درجہ میں جن وانس ہوتے ہیں۔ لہذا غالباً ان کے لئے یوم الحساب کا وہ نظم نہیں ہے جو جن وانس کے لئے ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ راست عذاب نار کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہی وہ بات ہے جس کا ذکر فادخلوا نارا میں کیا گیا ہے۔

دوسرا مشکل لفظ ''اغرقوا'' ہے جس کے معنی نہ سمجھنے کے سبب مزید پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ 'عربی مبین' میں 'غرق' کے معانی صرف ڈوبنا اور ڈبونا نہیں۔ بلکہ پیچھا کرنا، گرفتار کرنا، اور مقید کر دینا بھی ہیں۔ اور یہ تینوں ہی معانی یہاں مراد ہیں۔ یعنی جب حضرات میکال و جبریل نے ان باغی ملائکہ اور ان ماوراء ارضی مخلوقات کے خلاف کارروائی شروع کیں تو وہ بھاگ کھڑی ہوئیں چنانچہ مقرب ملائکہ نے کائنات کی پہنائیوں میں ان کا پیچھا کی اور انہیں پکڑ کر باندھ لائے اور قید کر دیا اور جب ابلیسی انسانوں کو اپنے ان حلیفوں اور رفیقوں اور زبردست قوت رکھنے والے مددگاروں کے انجام کا علم ہوا تو وہ لرز اٹھے۔ اس وقت ابلیس نے انہیں دلاسا دیا کہ وہ دل گیر نہ ہوں ان کے یہ حلیف مارے نہیں گئے ہیں بلکہ زندہ ہیں اور مصلحتاً کہیں چھپ گئے ہیں یا چلے گئے ہیں اور یہ کہ ان سے نا امید نہ ہوا جائے اور یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اب وہ مدد نہیں کر سکتے۔ لہذا ایسا لگتا ہے کہ یہ کارروائی Damage Management کے طور کی گئی جس کا ذکر قرآن نے یوں کیا ہے:

لا تذرن الھتکم ولا تذرن ودا '' ______ یعنی ان کے تعلق سے مایوس اور دل برداشتہ ہو کر انہیں چھوڑ دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ اب بھی موجود اور صاحب قوت ہیں اور اپنے حلیفوں کی مدد پر قادر۔ اور یہ کہ ملائکہ کا یہ کہنا درست نہیں کہ اب ان کا قلع قمع کر دیا گیا ہے یا انہیں قید کر لیا گیا ہے اور یہ کہ جو ان میں زندہ ہیں وہ بے بس محض ہیں اور اب ملکوت کے انتظام و انصرام میں ان کا کوئی زور نہیں چلتا۔

واضح رہے کہ ''اغرقوا'' میں ایک اور معنی کا انطباق ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ بات کہ ارض (وسیع تناظر میں) کے کسی حصے میں نہایت گہرائی میں ان باغی ملائکہ کو قید کر کے عذاب دیا جا رہا ہے۔ اس طرح الھہ سے مراد باغی ملائکہ اور ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر سے مراد ان

باغی ملائکہ کے علاوہ دیگر ماوراء ارضی مخلوقات ہیں۔ ایک ہی آیت میں تذرن کا دوبار استعمال غالبا اسی جانب اشارہ کر رہا ہے۔

چنانچہ یہ بات حقیقت ہے کہ عہد نوح کے ابتدائی حصے میں یعنی مقرب ملائکہ کے ذریعہ ان کے قلع قمع سے قبل ان باغی ملائکہ اور ماوراء ارضی مخلوقات کا اس روئے ارضی پر فی الواقع وجود تھا اور وہ ابلیسی انسانوں کے ساتھ رہتے یا ان سے ملتے جلتے اور ان کے معین و انصار تھے۔ چنانچہ یہی ان کا حقیقی عہد تھا۔ جب پہلے اقدامات کے بطور مقرب ملائکہ نے ان کا خاتمہ کر دیا اور ان کے حوالے سے ابلیس نے اپنے لوگوں کو طرح طرح کی طفل تسلیاں دیں اور ان سے نسبت وعقیدت اسی طرح استوار رکھنے کی تلقین کی جیسی ان کی موجودگی میں تھی تو یہ عہد دوسرا عہد قرار پایا یعنی طوفان سے قبل کا عہد۔ یہی وہ عہد ہے جسکا ذکر اس آیت میں کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ صنمیت و وثنیت کے امور سے ان کا کوئی تعلق نہیں جیسا کہ مفسرین نے ذکر کیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نذیر مبین بنا کر بھیجا تھا۔ چنانچہ قرآن نے ذکر فرمایا: انا ارسلنا نوحا الی قومہ ان انذر قومک من قبل ان یاتیھم عذاب الیم. قال یقوم انی لکم نذیر مبین (نوح ۲۔۱)

ترجمہ: ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف کہ ڈرائے اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ پہنچے ان پر عذاب دردناک بولا اے قوم میری بے شک میں تم سبھوں کی طرف نذیر مبین ہوں۔

آیات قرآنی کے استقصاء سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابلیس نے حضرت یرد کے بعد سے ہی ملکوت السموٰت والارض میں غیر معمولی فساد برپا کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ فساد اتنا ہمہ گیر ہو گیا کہ بالآخر اللہ تعالیٰ نے حضرت انس کو ذوالکفل بنا کر ان کے دست برد سے بچا لیا اور حضرت لامع کے عہد کے آتے آتے پوری روئے ارض اور ماوراء ارض اس فساد ملکوت سے کراہنے لگی۔ چنانچہ حضرت نوح کی بعثت ہی نذیر مبین کی حیثیت سے ہوئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان اقدامات کا فیصلہ حضرت نوح کے مبعوث ہونے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ چونکہ اللہ اپنی سنت کے مطابق اس وقت تک عذاب نہیں لاتا جب تک کہ حجت پوری نہ ہو جائے اور لوگ اچھی طرح خبردار نہ کر دیے جائیں۔ چنانچہ حضرت نوح کے ذریعہ ڈرائے جانے کے بعد سب سے پہلے باغی ملائکہ اور ماوراء ارضی مخلوقات کے خلاف کارروائی کی گئی۔ ظاہر ہے یہ ملکوت کا فساد تھا لہذا اللہ تعالیٰ اس

کے لئے تکوینی راستہ اور تدابیر اختیار کرتا یہی سبب ہے کہ اس تعلق سے حضرات میکال و جبریل نے کارروائیاں کیں۔

ایسا لگتا ہے کہ ان باغی ملائکہ کے گرفتار ہونے اور عذاب میں ڈال دیئے جانے کا فوری اثر یہ برآمد ہوا کہ تدبیر عالم کے اندر حیات، افزائش، ترہیب، تبدیلی اور موت کے رموز کے تعلق سے جو فساد برپا کیا جا رہا تھا وہ یکسر نہیں تو بہت حد تک تھم گیا۔ لہذا ان فساد انگیزیوں کے نتیجے میں جو نئی نئی مخلوقات آئے دن پیدا ہو رہی تھیں یا پیدا شدہ مخلوقات میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان کا سلسلہ اپنے منبع سے ہی یک قلم موقوف ہو گیا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے نتیجے میں ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر جیسی مخلوقات کی افزائش میں زبردست کمی آ گئی ہو۔ ان ملائکہ کے مقید ہونے کے بعد یا تو ان کی افزائش یکسر رک گئی ہو یا انحطاط کی طرف مائل ہو گئی ہو۔

ممکن ہے کہ اس عمل کے بعد پھر حضرت نوح کے ڈرانے کا سلسلہ مزید سو سالوں تک جاری رہا ہو تب کہیں جا کر دوسرے اقدامات کی تعمیل ہوئی ہو۔

کارروائی کا دوسرا مرحلہ تھا روئے ارض پر موجود ان مفسدوں کا خاتمہ جو اس فساد ملکوت کے سبب زمین پر موجود اور باعث فساد تھے۔ یہ مفسدان ابلیسی انسانوں کے علاوہ تھے اور ان میں ارضی و فضائی اور تحت ارضی و طبقات ارضی مخلوقات شامل تھیں جن میں جبار، نفل، نفر، عفریت، داب، نسلہ اور یاجوج ماجوج اہم ہیں۔ چونکہ یہ مخلوقات بھی فساد ملکوت کا ہی نتیجہ تھیں لہذا ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کے بھیجنے کا فیصلہ فرمایا۔ (ذوالقرنین کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں دجال جلد اول صفحات ۳۴۰_۲۹۳) چنانچہ روئے ارض پر حضرت انس بن یرد جو اب ادریس تھے ذوالقرنین بن کر تشریف لائے۔ اور انہوں نے روئے ارض کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ان مفسدوں کا خاتمہ کر دیا۔ یہ وہی امور ہیں جن کا ذکر سورۃ الکہف میں بالتفصیل کیا گیا ہے۔

قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ارضی و فضائی اور تحت ارضی مخلوقات میں یاجوج ماجوج اپنی قوت اور خطرناکی میں مخصوص نوعیت کے تھے اس لئے ان کا ذکر ان مخصوص اقدامات کے حوالے سے منفرد طور پر کیا گیا ہے۔ احادیث اور خود قرآن کے داخلی شواہد اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ روئے ارضی پر حضرت ذوالقرنین کی کارروائیاں اور بطور خاص یاجوج ماجوج

prepared by M. Aamir Memon
www.asrararalam.net

کے خلاف کارروائیاں اور طوفان میں دنوں، ہفتوں، مہینوں یا صرف ایک یا دو سال کا فرق ہو۔

چنانچہ اس طرح اللہ تعالیٰ نے فساد ملکوت کے دو بڑے حصوں کا قلع قمع فرما دیا اب جو طبقہ بچ رہا تھا وہ ان انسانوں کا تھا جو ابلیس کے ہم رکاب تھا اور یہی طبقہ پوری انسانی آبادی پر مقتدر اعلیٰ کی حیثیت سے چلا آ رہا تھا۔ حضرت نوح پر یہ بات ان دور بانی اقدامات کے بعد پوری طرح منکشف ہو چکی تھی کہ اب انسانوں پر عذاب کے اتر آنے کی باری ہے۔ اس احساس نے حضرت نوح کو بے حد مضطرب کر دیا اور انہوں نے اس فساد کو روکنے اور نوع آدم کو بچانے اور اسے منصب خلافت کی حقیقی راہ پر آگے بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ابلیس کے پھیلائے ہوئے مکر کبار کے سامنے بظاہر ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ فساد اس قدر ہمہ گیر اور متسلسل تھا کہ سوائے چند نفوس قدسیہ کے تقریباً تمام نسل آدم حتیٰ کہ ان سے قریب رہنے والی حیواناتی اور نباتاتی دنیا تک پوری طرح فساد آلود ہو چکی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اصلاح حال کی ساری امیدیں جاتی رہی ہیں۔ کسی ایسے ابلیسی فساد میں نسل آدم کا اس قدر خود بڑھ چڑھ کر ملوث ہو جانا جس کا اصلی کام منصب خلافت کی حفاظت کرنا تھا کیا نتائج پیدا کر سکتا تھا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے کیسی ہولناک سزا دیجانے والی تھی ان باتوں سے حضرت نوح نے لوگوں کو کھول کھول کر آگاہ کیا۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

ابلغکم رسلت ربی وانصح لکم واعلم من الله مالا تعلمون (الاعراف ۶۲)

ترجمہ: میں پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور نصیحت کرتا ہوں تم کو اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے وہ بات جو تم نہیں جانتے واعلم من الله مالا تعلمون (اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے وہ بات جو تم نہیں جانتے) کی سنگینی اور اس پر حضرت نوح کا نوع آدم کو زیادہ سے زیادہ بچانے کی کوشش کرنا وہ باتیں تھیں جنہیں بلاغ مبین، نصح مبین اور انذار مبین کہا گیا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

ثم انی دعوتهم جهارا. ثم انی اعلنت لهم واسررت لهم اسرارا (نوح ۸۔۹)

ترجمہ: پھر میں نے ان کو پکارا با آواز بلند، پھر میں نے ان کو کھول کھول کر کہا اور چپکے چپکے بھی۔

www.bookstube.net www.urdutube.net prepared by M. Aamir Mehmood www.urdumovies.net www.asrarealam.net

بیشتر انسانوں کی بدبختی یہ تھی کہ لوگ جس قدر فساد سے روکے جاتے وہ اسی قدر بھاگ کر اور لپک لپک کر اس میں مزید ملوث ہوتے جاتے۔ جب آپ علیہ السلام نے حق کی دعوت دینے، خیر خواہی اور نصیحت کرنے اور لوگوں کو بدترین انجام سے ڈرانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ارشاد فرمایا:

واوحی الی نوح انہ لن یومن من قومک الامن قدامن فلاتبتئس بما کانوا یفعلون. اصنع الفلک باعیننا ووحینا ولاتخاطبنی فی الذین ظلموا انھم مغرقون (ہود ۳۷ـ۳۶)

ترجمہ: اور حکم ہوا نوح کو کہ اب ایمان نہ لائے گا تیری قوم میں مگر جو ایمان لا چکا سو غمگین نہ رہ ان کاموں پر جو وہ کر رہے ہیں اور بنا کشتی روبرو ہمارے اور ہمارے حکم سے اور نہ بات کر مجھ سے ظالموں کے حق میں۔ یہ بے شک غرق ہو جانے والے ہیں۔

چونکہ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خود آگاہ کر دیا کہ ''اب ایمان نہ لائے گا تیری قوم میں مگر جو ایمان لا چکا سو غمگین نہ رہ ان کاموں پر جو وہ کر رہے ہیں''...... اور یہ کہ ''یہ بیشک غرق ہونے والے ہیں''۔ چنانچہ حضرت نوح نے اللہ رب العزت کا منشا و فیصلہ سمجھ لیا کہ اب مفسدین کے غرق کئے جانے اور تباہ کئے جانے کا عذاب آنے ہی والا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا کو جو سورۂ نوح میں آئی ہے بعض احادیث کے پیش نظر ایسا سمجھنا کہ حضرت نوح نے گویا عذاب سیلاب کی دعا کی تھی درست نہیں۔ بات بالکل برعکس ہے۔ اصل صورت واقعہ یہ ہے کہ جو غم انہیں کھائے جا رہا تھا اس کی دو جہتیں تھیں۔ پہلی جہت یہ تھی کہ وہ لوگوں کی روش اور ہٹ دھرمی کو دیکھ کر سمجھ رہے تھے کہ عذاب اب کسی لمحے بھی آیا چاہتا ہے۔ ان کا اضطراب لوگوں کی روش کو دیکھ کر اور سوا ہو رہا تھا کہ آخر لوگ اس تباہی سے بچنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ یہ وہی اضطراب و کرب شدید ہے جو ہر نبی کو بنی نوع انسان کے تعلق سے ہوتا ہے۔ دوسری جہت یہ تھی کہ وہ اس اندیشے میں مبتلا تھے کہ عذاب جو بس آیا ہی چاہتا ہے کہیں کلی عذاب کی صورت میں نہ آ جائے کہ سارے کے سارے لوگ جن میں مومنین بھی شامل ہیں سب غرق کر دیے جائیں۔

پہلی جہت کے تعلق سے انہیں آگاہ کیا گیا کہ عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اب وہ ٹل نہیں سکتا۔ اب عذاب آ کر رہے گا اور یہ سارے لوگ غرق کر دیے جائیں گے۔ یہی وہ بات ہے

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

جو سورۂ ہود آیات ۳۶ اور ۳۷ میں ''فلا تبتئس'' کہہ کر بیان کی گئی ہے۔ سورۂ نوح آیات ۲۶ تا ۲۸ دراصل دوسری جہت سے متعلق ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی یہ دعا فی الواقع اس تناظر میں تھی کہ یا رب العلمین! اگر عذاب مقدر ہی ہے تو ایسا عذاب نہ لا جو روئے ارض پر سارے نفوس جن میں مومنین بھی شامل ہیں سب کا خاتمہ کر دے۔ اگر عذاب کا آنا مقدر ہی ہو چکا ہے تو وہ صرف کافرین پر آئے اور اہل ایمان محفوظ رکھے جائیں۔ یہاں فطری طور پر نبی کی وہ خواہش کہ زیادہ سے زیادہ لوگ محفوظ رہیں اپنے جوش پر آئی ہوئی صاف معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے محفوظ رکھے جانے والے لوگوں کے دائرے کو وسیع تر کرنا چاہا۔ آپ نے فرمایا:

رب اغفرلی ولوالدی ولمن دخل بیتی مومنا وللمومنین والمومنت (نوح ۲۸)

ترجمہ: اے رب معاف کر مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو آئے میرے گھر میں ایمان دار اور سب ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے اندر بنی آدم کے تعلق سے کسی نبی کے اندر پائے جانے والے جذبۂ خیر خواہی کا کیسا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اس کا اندازہ ان الفاظ پر غور کرنے سے ہی ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ حضرت کی یہ دعا اتنی وسیع و ہمہ گیر ہے کہ صرف اس عہد کا ہی احاطہ نہیں کرتی بلکہ قیامت تک نوع آدم کی خیر خواہی کی طلب گار ہے چنانچہ آپ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اس وسیع تناظر میں بچانے کا وعدہ لیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی کی دعا قبول فرمائی جس نے اس کے خلیفہ کو کلیتاً تباہ ہونے سے بچانے اور ابلیس کو کامیاب ہونے نہ دینے کے لئے چھ سو سال کی ایسی ان تھک محنت کی جس کی نظیر نہیں مل سکتی بطور خاص اس صورت میں کہ اس کے لئے اس طویل مدت میں لوگوں کی طرف سے سوائے رسوائی اور خواری کے کچھ بھی نہ ملا ہو لیکن وہ اپنے کام میں مسلسل لگا رہا تاکہ اس کے رب کا فیصلہ کہ آدم ہی لائق خلافت ہے۔ جھوٹا ثابت نہ ہو.... چنانچہ آنے والا عذاب صرف کفار تک محدود رہا اور نہ صرف یہ کہ نسل آدم بچالی گئی بلکہ اہل کشتی کی نسل کو ایسی برکت ملی جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ یہی وہ بات ہے جو 'وعدہ' کی شکل میں حضرت نوح کی زبان مبارک پر جاری ہوا۔ آپ نے فرمایا:

فقال رب ان ابنی من اھلی وان وعدک الحق (ہود ۴۵)

ترجمہ: کہا اے رب میرا بیٹا ہے میرے گھر والوں میں اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.esrarain.net

حضرت نوح علیہ السلام کے اس چھ سو سال کے ان تھک بلاغ مبین، نصح مبین اور انذار مبین کا وہ لاثانی عمل ہے جس نے آدم کو تیسری عظیم جست (The Third Quantum Jump) سے نوازا۔ چنانچہ اللہ تعالی نے تیسری بار آدم کی حیثیت کو بحالی کی ترقی سے نوازا۔ انہیں بشارت عظمی اور ضمانت وقتی کی خبر دی گئی۔

قیل ینوح اھبط بسلم منا وبرکت علیک وعلی امم ممن معک (ہود ۴۸)

ترجمہ: حکم ہوا: اے نوح اتر جا، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہیں تجھ پر اور ان گروہوں پر جو تیرے ساتھ ہیں۔

بہت دقت نظر سے غور کیا جائے تو وہ راز پنہاں آشکارا ہو جائے گا کہ یہ حکم حیثیت آدم کی بحالی کا کون سا مقام ہے۔ وہ آدم جو الجنہ سے اپنی حیثیت کے مجروح ہونے کے سبب گناہ کے معاف کئے جانے کے باوجود منتقل کیا گیا تھا کس مقام پر فائز تھا اور اس سے آگے کیا توقعات تھیں اور اس کے برعکس خلاف ورزی کی صورت میں وہ کس مقام پر چلا آیا تھا۔ اسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان حیثیات کی تعین کر لی جائے۔

(ملاحظہ فرمائیں نقشہ اول بر صفحہ ۱۵۰)

چنانچہ طوفان کے بعد حکم الہی ''اھبط'' (اتر جا) (سورہ ہود ۴۸) دراصل روحانی طور پر ماقبل کے ''اھبطوا'' (تم لوگ اتر جاؤ) (البقرہ ۳۶ اور ۳۸) کی معکوس صورت تھا۔ گویا حضرت نوح علیہ السلام کی چھ سو سال کی انتھک محنت اور غیر متزلزل عزیمت نے آدم کی حیثیت کو جسے ان سے قبل حضرت ہابیل اور ان سے قبل خود حضرات آدم وحوا نے بحال کیا تھا مزید بحال کر کے اس مقام پر پہنچا دیا جسے مقام الجنہ کی حیثیت کہتے ہیں۔ لیکن سورۂ ہود آیت ۴۸ کے آخری کلمات اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ پوری بحالی نہیں تھی۔ قرآن نے ارشاد فرمایا:

وامم سنمتعھم ثم یمسھم منا عذاب الیم (ہود ۴۸)

ترجمہ: اور دوسرے گروہ ہیں کہ ہم فائدہ دیں گے ان کو پھر پہنچے گا ان کو ہماری طرف سے عذاب دردناک۔

یعنی اب بھی الجنہ کے مقام تک بحالی میں ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ چنانچہ یہ بحالی دراصل اس روحانی حالت کی بحالی تھی جو حضرات آدم وحوا کی توبہ اور ھبوط کے مابین حیثیت آدم

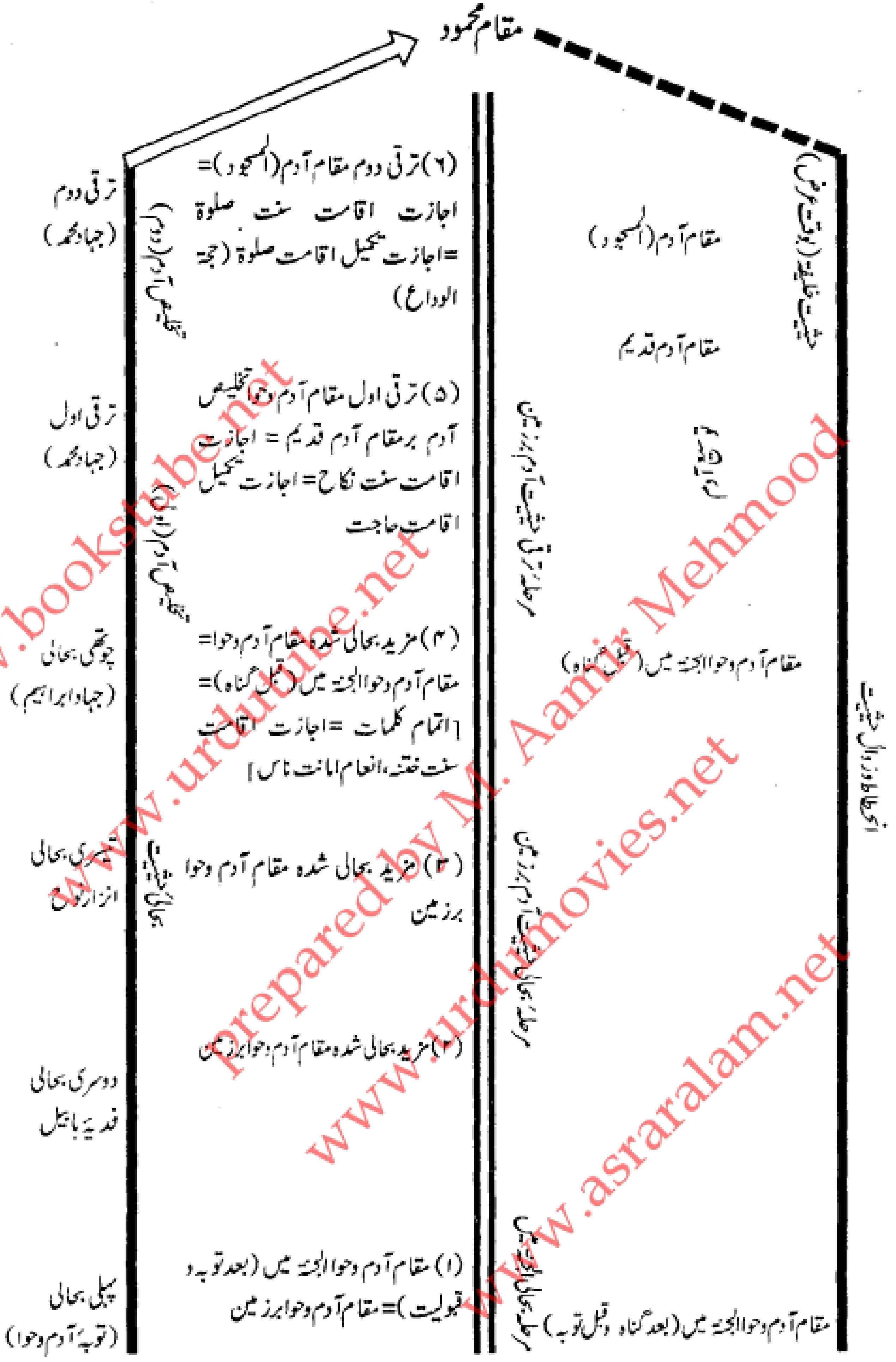
مقام محمود
حیثیت خلیفہ (بوقت عرض)
مقام آدم (المسجود)
مقام آدم قدیم
توبہ آدم
مقام آدم وحوا الجنۃ میں (قبل گناہ)
انحطاط و زوال حیثیت
مقام آدم وحوا الجنۃ میں (بعد گناہ وقبل توبہ)
مرحلۂ ترقی حیثیت آدم بر زمین
مرحلۂ بحالی حیثیت آدم بر زمین
مرحلۂ بحالی الجنۃ میں
تخلیص آدم (دوم)
تخلیص آدم (اول)
بحالی حیثیت
ترقی دوم
(جہاد محمد)
ترقی اول
(جہاد محمد)
چوتھی بحالی
(جہاد ابراہیم)
تیسری بحالی
از ازنوح
دوسری بحالی
فدیۂ ہابیل
پہلی بحالی
(توبہ آدم وحوا)

(۶) ترقی دوم مقام آدم (المسجود) = اجازت اقامت سنت صلوٰۃ = اجازت تکمیل اقامت صلوٰۃ (حجۃ الوداع)

(۵) ترقی اول مقام آدم وحوا تخلیص آدم برمقام آدم قدیم = اجازت اقامت سنت نکاح = اجازت تکمیل اقامت حاجت

(۴) مزید بحالی شدہ مقام آدم وحوا = مقام آدم وحوا الجنۃ میں (قبل گناہ) = [اتمام کلمات = اجازت اقامت سنت ختنہ، انعام امانت ناس]

(۳) مزید بحالی شدہ مقام آدم وحوا برزمین

(۲) مزید بحالی شدہ مقام آدم وحوا برزمین

(۱) مقام آدم وحوا الجنۃ میں (بعد توبہ و قبولیت) = مقام آدم وحوا برزمین

وحوا تھی۔ یہاں ایک خفیف اشارہ اس امکان کی طرف بھی ملتا ہے کہ حضرات آدم وحوا نے توبہ تو الجنہ میں کی لیکن انہیں باضابطہ توبہ کے قبول ہونے کی اطلاع روئے زمین پر دی گئی تھی۔ ممکن ہے باضابطہ اطلاع اس وقت دی گئی ہو جب حضرت حوا کا وضع حمل ہو گیا ہو اور حضرت حوا کا جسم قابیل کے جسم سے الگ ہو کر پاک ہو گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی حاملہ مطلقہ ہو اور اس کی عدت تین ماہ یا چار ماہ کچھ دن نہ ہو کر سات ماہ تک یعنی وضع حمل تک برقرار رہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مطلقہ وضع حمل کے بعد ہی نکاح ثانی کر سکتی ہے یا کوئی خاتون ہو جس سے غلطی سے بیوی سمجھ کو کسی نے صحبت کر لی ہو اور اس کو حمل رہ گیا ہو تو وہ وضع حمل کے بعد ہی اپنے شوہر کی طرف لوٹ سکتی ہے۔

منہج سوم: فساد ملکوت حکمی

فساد ملکوت اپنے منہج کے اعتبار سے بنیادی طور پر ابلیس کی کوشش کا وہ حصہ تھا جہاں اس کے غالب شریک کار باغی ملائکہ تھے۔ جن اور انسان بہر حال اس میں طبقۂ ثانی و ثالث تھے اور محض آلۂ کار یا معمول کی طرح کام کرنے والے تھے۔ طوفان اور اس سے قبل حضرت ذوالقرنین اور حضرات میکال و جبریل کی کارروائیوں نے ان طبقات کا کلیتاً خاتمہ کر دیا۔ باغی ملائکہ گرفتار کر لئے گئے، بعض جن اور مخلوط طور پر بنائی گئی مخلوقات یا تو ماری گئیں یا مقید کر دی گئیں یا زمین بدر کر دی گئیں۔

ابلیس نے پوری طرح اندازہ لگا لیا کہ اس کا یہ منہج جس پر اس نے حضرت نوح علیہ السلام کے عہد میں معرکۂ خلافت کی بنیاد ڈالی تھی وہ کلی طور پر منہدم ہو گیا ہے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ بری طرح ناکام ہوا بلکہ اس منہج کے غالب شریک کار سارے کے سارے مارے گئے یا اب وہ ان کی مستقبل قریب میں مدد نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس نے ایک نئے منہج کے آغاز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابلیس کے نئے منہج کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ چند اہم امور کی توضیح کر دی جائے:

(۱) منہج: یہاں منہج سے مراد ابلیس کا منہج ہے۔ منہج اس طریقے کو کہتے ہیں جسے ابلیس معرکۂ خلافت میں حق کو شکست دینے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اختیار کرتا ہے۔ اس میں نصب العین، طریقۂ جنگ، طریقہ و صورت تحالف وغیرہ کا ایک پورا نظام شامل ہوتا ہے۔

(۲) تبدیلی منہج: تبدیلی منہج سے مراد یہ ہے کہ جب ابلیس اپنے سابقہ منہج پر چلتے ہوئے حق اور اہل حق کو شکست دینے میں ناکام ہو جاتا ہے یا اسے حصول مقصد کی راہ مسدود نظر آتی ہے تو وہ اس منہج کو چھوڑ کر دوسرا منہج اختیار کرتا ہے۔ اس کا یہ فیصلہ انتہائی خفیہ اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ انسانوں کے لئے یہ بات تقریباً محال ہوتی ہے کہ وہ ابلیس کے منہج کی تبدیلی کو ابتداً محسوس کر سکے یا اس کا اندازہ کر سکے۔ یہی وہ صورتحال ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے وعدۂ ہدیٰ (البقرہ ۳۸)

کے تحت بنی آدم کی ایک خاص صورت سے مدد کرتا ہے۔ اور وہ صورت ہے روئے ارض پر رسول کی بعثت۔ چنانچہ جب بھی ابلیس کے منہج میں تبدیلی ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے روئے ارض پر رسول مبعوث فرمائے ہیں۔ یہ رسول ابلیس کے منہج سے بفضلہٖ تعالیٰ واقف ہوتے ہیں چنانچہ وہ روئے ارض پر اظہار کی ذمہ داریاں پوری فرماتے ہیں۔

(۳) میثاق: میثاق دو فریق کے مابین عہد کو کہتے ہیں۔ یہاں میثاق سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ اور بنی آدم کے مابین ہوتا ہے۔ لیکن قرآن میں یہ عہد اللہ تعالیٰ اور کسی عام فرد یا گروہ کے مابین ہونا مراد نہیں ہے۔ بلکہ اس میں اجتماعیت کا پہلو بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کسی فرد یا قوم کو اس کے فوری یا ماقبل کے عمل خیر کے نتیجے میں اپنے کام کے لئے منتخب کرتا ہے۔ یہ ایک عہد ہوتا ہے کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی فرد یا قوم کو اس زمانے میں یا ماضی بعید میں غیر معمولی عمل خیر کے صلے میں اپنے کسی اگلی مہم یا کام کے لئے منتخب کرنا۔ گویا یہ ایک عہد بھی ہوتا ہے اور انعام بھی۔

اگر یہ انتخاب کسی ماقبل کے عمل خیر کے بجائے محض استحقاق اور اہلیت کی بنیاد پر ہو تو اسے قرآن نے 'امانۃ' قرار دیا ہے۔

چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

واذاخذنا من النبیین میثاقھم ومنک ومن نوح وابراھیم وموسی وعیسی ابن مریم واخذنا منھم میثاقا غلیظا (الاحزاب ۷)

ترجمہ: اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) یاد رکھو اس عہد و پیماں کو جو ہم نے نبیوں سے لیا ہے اور تم سے بھی اور نوح سے اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔ ان سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں۔

یہ آیت نہایت بلیغ ہے اور نہ صرف یہ کہ تاریخ بنی آدم کا پورا نقشہ پیش کرتی ہے بلکہ اس کے اندر جاری معرکۂ خیر و شر کی بھی۔ اگرچہ بیشتر مترجمین و مفسرین نے ''من النبیین'' اور ''اخذنا منھم'' سے صراحتاً یا بغیر صراحت کے تمام انبیاء مراد لیا ہے یہ ایک لحاظ سے درست بھی ہے لیکن اس عاجز کے نزدیک یہاں جس میثاق کا ذکر ہو رہا ہے اس میں تبعاً تو سارے ہی انبیاء بلکہ سارے مومنین آجاتے ہیں لیکن فی الواقع وہ دراصل رسولوں سے لئے گئے عہد ہیں جو اظہار کے

لئے ہدیٰ لیکر آتے ہیں اور سنت قائم فرماتے ہیں۔ اس طرح اس آیت میں اس کا بھی اشارہ موجود ہے کہ روئے ارض پر سب سے پہلا میثاق حضرت نوح علیہ السلام سے لیا گیا۔ اور سب سے آخری خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ علماء یہود و نصاریٰ اگر چہ حضرت نوح سے قبل بھی دو میثاق تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن فی الواقع وہ میثاق سے زیادہ امانۃ تھے۔

(۴) تفویض: تفویض سے مراد ذمہ داری کا دینا ہے۔ ہر چند کہ اس لفظ کا مفہوم میثاق میں داخل ہے لیکن مزید وضاحت کے لئے اسے الگ بیان کیا جانا ضروری ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو مجتبیٰ قرار دیکر اس سے میثاق لیتا ہے اور وہ اسے قبول کر لیتا ہے تو اس پر اس کی اگلی ذمہ داریوں کے تعلق سے نہ صرف یہ کہ ذمہ داریوں اور نصب العین کی تعیین واضح کی جاتی ہے بلکہ انہیں امور سے متعلق انعام کا بھی اعلان کیا جاتا ہے۔ اس اعلان و اظہار انعام کو تفویض کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح کے ساتھ جو میثاق ہوا اسکی تفویض میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کا ذکر فرمایا:

پہلی : سلامتی
دوسری : برکت

یعنی اب نسل نوح قیامت تک کلی طور پر ختم نہیں کی جائے گی اور یہ کہ انہیں چند افراد کی نسل میں اتنی برکت ہوگی کہ پوری روئے زمین ان سے بھر جائے گی۔ اور یہ برکت صرف تعداد میں نہیں بلکہ صلاحیت، اہلیت اور سعادت میں بھی ظاہر ہوگی۔

اسی طرح حضرت ابراہیم سے فرمایا گیا: اے ابراہیم! میں نے تم کو انسانوں کا امام بنا دیا ہے۔

(۵) ابتلاءِ کلمہ: ابتلاء کلمہ یا ابتلاء آخر سے مراد ہے اس شخص یا گروہ کا یا اس کے منتسبین، متوسلین اور متبعین کا جس سے اللہ تعالیٰ نے میثاق کیا ہے جہد تام کرنا تاکہ وہ میثاق پورا ہو جائے۔

چنانچہ قرآن نے ارشاد فرمایا ہے:

واذا بتلی ابراھیم ربہ بکلمات (البقرہ ۱۲۴)

ترجمہ: اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کئی کلموں میں

(۶) اتمام: اتمام سے مراد ہے میثاق کے تحت ابتلاء کلمہ ہونے اور اس میں جہد

prepared by M. Aamir Memon
www.asrarealam.net

تام کے ذریعہ بالآخر اس کلمہ کو یعنی میثاق کو پورا کر دینا۔ میثاق کے پورا کرنے سے مراد ہے ابلیس کے قائم کردہ نصب العین کو منہدم کر دینا یا ابلیس کے بالمقابل حق کا نصب العین نہ صرف قائم کر دینا بلکہ اس کا اظہار و غلبہ کر دینا یا ابلیس کو شکست دیکر اسے اپنے نصب العین اور منہج کو ترک کرنے پر مجبور کر دینا۔

اتمام کے چار درجے ہیں۔

(۱) پہلا درجہ۔ یہ وہ اتمام ہے جس کے بعد ابلیس بالکل شکست کھا جاتا ہے اور تبدیلیٔ منہج بھی نہیں کر سکتا اسے اتمام اعظم کہا جاتا ہے۔

(۲) دوسرا درجہ: یہ وہ اتمام ہے جس کے بعد ابلیس تبدیلیٔ منہج کر کے معرکہ جاری رکھتا ہے اسے اتمام عظیم کہتے ہیں۔

(۳) تیسرا درجہ: یہ وہ اتمام ہے جو اس درجہ قوی نہیں ہوتا کہ ابلیس کو تبدیلیٔ منہج کرنے پر مجبور کر دے ہاں اس اتمام سے حق کو تقویت ملتی ہے جسے تقویت بالحق کہتے ہیں۔

(۴) چوتھا درجہ: یہ اتمام کا وہ درجہ ہے جو تیسرے درجے سے بھی کم قوی ہوتا ہے اور اس میں صرف تجدید میثاق ہوتی ہے۔ اس کا فائدہ بس اس قدر ہوتا ہے کہ ذمہ دار قوم معزول ہونے سے بچ جاتی ہے۔

منہج فساد ملکوت حکمی یا فساد فی توحید اللہ یعنی فساد شرک سے مراد ہے وہ ایمانی و عملی فساد جس کی بنیاد اس پر قائم ہوتی ہے کہ:

"ملک کا مالک ملکوت کا بھی مالک ہے۔"

یہاں ملک سے مراد روئے ارض پر زمینی اقتدار اور حکومت کا مالک ہونا ہے۔ چنانچہ اس فساد کی بنیاد اس پر قائم کی گئی اور ابلیس نے یہی بات روئے ارض پر پھیلائی کہ جو ملک کا مالک ہوتا ہے وہ ملکوت السموات الارض کا بھی مالک ہو جاتا ہے یا اسے اس طرح بھی اصول کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ملک کا مالک ملکوت کا مالک ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ ابلیس کے ذریعہ اپنے منہج کی یہ تبدیلی نہایت معنی خیز تھی۔ ہم نے دیکھا کہ تین ربانی اقدامات کے ذریعہ کس طرح روئے زمین ہر فسادی سے خالی کر دی گئی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ ابلیس کا پورا نظام اس کے شریک و سہیم، اس کے آلۂ کار اور اس کی فوج درہم

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarulaan.net

برہم ہی نہیں بلکہ بیشتر ختم کردی گئی۔ اور اس طرح طبعی اور روحانی طور پر پوری روئے زمین کی صفائی اور دھلائی ہوگئی۔ اور اب روئے زمین پر صرف اہل کشتی دوبارا آباد کئے گئے اور ان میں اللہ نے برکت اتاری چنانچہ وہ زمین پر پھیل گئے۔ ابلیس ان حالات میں مجبور ہوگیا کہ اپنا اگلا منہج ان حالات وکوائف کو سامنے رکھ کر تشکیل دے جو مستقبل میں حقیقی صورتحال (Ground Realities) ہوسکتی تھی۔

عرض کیا جاچکا ہے کہ آدم کی ہر جست نے اس کو قوی تر اور ابلیس کو کمزور تر بنایا ہے۔ یعنی ہر جست کے بعد آدم اپنی حیثیت کے اعتبار سے مضبوط وارفع تر ہوتا گیا اور ابلیس اپنے دعوے اور اس کی وسعت کے اعتبار سے کمزور اور تنگ تر۔ لیکن اس جگہ اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ ابلیس کی تباہ کاریاں اور معرکہ' خیر وشر کی ہولناکی اس کے مایوس تر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کی پے در پے شکست اور اس کی فوجوں کی تباہی اسے زیادہ خوفناک بناتی جارہی ہے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ الجنہ میں سرزد ہونے والے گناہ اور ہبوط آدم سے قبل معرکہ' خیر وشر میں ابلیس کا موقف مجرد طور پر منصب خلافت کا 'استحقاق' رہا۔ ہبوط آدم اور زمین پر بسائے جانے کے بعد اور بالخصوص حضرت ہابیل کی شہادت کے بعد اس کے موقف میں محاذ، دائرہ جنگ اور حقیقی زمینی صورتحال (Actual Ground Realities) کے اعتبار سے کمزوری واقع ہوگئی۔ ابلیس کے موقف میں واقع ہونے والی کمزوری دراصل حیثیت آدم کی بحالی کی رفتار و سطح کے تناسب (Proportional) میں تھی۔ حیثیت آدم جس قدر بحال ہوئی ابلیس کا موقف اور اس کی زمینی صورتحال اسی قدر کمزور تر ہوتی گئی۔ چنانچہ حضرت ہابیل کے بعد اپنی حقیقت کے اعتبار سے ہر چند کہ ابلیس کا دعویٰ بظاہر منصب خلافت ہی رہا لیکن اس کی حقیقی اور اصلی صورتحال محض 'خلافت ارضی کے استحقاق' کی باقی رہ گئی۔ بظاہر اس کا دعویٰ حسب سابق رہا لیکن وہ اس سے تقریباً مایوس ہوتا گیا کہ اب کبھی وہ کلی 'منصب خلافت' کا اہل ہوسکے گا۔ حضرت ہابیل کی شہادت کے بعد کی ناکامی نے اسے منہج بدلنے پر مجبور کیا اور اس نے کوشش کی کہ ملکوت میں فساد برپا کرکے اور روئے ارض پر ہر طرف عام خونریزی کا بازار گرم کرکے نسل آدم کو ہی ختم کروادیا جائے۔ اب حضرت نوح کی بعثت اور حجت پوری ہونے کے بعد کئے گئے ربانی اقدامات نے ابلیس کو پھر شکست فاش سے دوچار کردیا تھا۔ لہذا اسکے دعوے اور معرکے کی سطح

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asfarurdu.net

مزید نیچے آئی۔ اب اس کے منہج کی بنیاد تھی "جو ملک کا مالک ہے وہ ملکوت کا مالک ہے"۔

طوفان ابلیسی قوتوں کی آخری ٹکڑی کا خاتمہ تھا۔ وہ اس سے قبل کئی سو سالوں سے اپنے احزاب کا خاتمہ دیکھتا آ رہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ ابلیس نے اپنے نئے منہج کی تیاریاں طوفان سے قبل ہی شروع کر دی ہوں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے طوفان کے ختم ہوتے ہی حضرت نوح علیہ السلام سے میثاق لیا اور انہیں اگلے معرکے کی ذمہ داریوں کی تفویض فرمائی۔ صحیح مسلم باب شفاعت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو روایت ہے اس سے اسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ روایت میں کہا گیا: **یا نوح انت اول الرسل الی الارض** (اے نوح تم زمین پر پہلے رسول بنا کر بھیجے گئے ہو)

اسی میثاق کا ذکر سورۃ الاحزاب آیت ۷ میں بھی آیا ہے۔

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی سے اترنے کے بعد جس عظیم الشان مہم کا آغاز فرمایا وہ ابلیس کے منہج فسادِ ملکوت حکمی یا فسادِ فی توحید اللہ یا فسادِ شرک کے خلاف کارروائی تھی۔ ہم اس سے قبل ملاحظہ کر چکے ہیں کہ اس کے بعد ابلیس نے روئے زمین پر اسی فسادِ ملکوت حکمی کی بنیاد پر بڑی بڑی تہذیبوں کو لا کھڑا کیا۔ ۱۶ قوم عاد، قوم ثمود، قوم شعیب اور قوم لوط و قوم ابراہیم ایسی ہی بڑی عظیم الشان نظام ہائے عالم (World Orders) تھیں جن کی بنیاد ہی اس پر قائم کی گئی تھی کہ چونکہ وہ روئے ارض پر ملک کے مالک ہیں اس لئے کائنات میں ملکوت کے بھی مالک ہیں۔

اس فسادِ شرک کے خلاف حضرت نوح نے 'اظہار' کی بنیاد ڈالی اور بڑے بڑے جلیل القدر انبیاء ــــــ حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام نے اس اظہار کو جاری رکھا۔ فسادِ شرک کے خلاف یہ وہی 'اتمام' اور 'اظہار' ہیں جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نقطہ 'کمال تک پہنچا دیا۔

prepared by Mr. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

حصہ اول

دور اول: حضرت ابراہیم علیہ السلام

توراۃ کی صراحت کے مطابق حضرت ابراہیم کا نام ''ابرام'' (Abram) تھا جس کے معنی ہیں ''معظم باپ''۔ توراۃ ہی کی صراحت ہے کہ وہ بعد میں ''ابراہام'' (Abraham) کے لقب سے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا تھا پکارے جانے لگے جس کے معنی ہیں ''گروہ کثیر کے باپ''۔ قرآن نے اس کی صراحت تو نہیں کی ہے کہ ان کا نام کیا تھا ہاں اس کے طرز بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'ابراہیم' ان کا لقب تھا جو مشہور ہو گیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہ لقب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت فرمایا گیا ہو۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

قالوا سمعنا فتی یذکرھم یقال لہ ابراھیم (الانبیاء ۶۰)

ترجمہ: وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان بتوں کو کچھ کہتا ہے، اس کو کہتے ہیں ابراہیم۔

یہ عاجز مفسرین توراۃ کی ان دونوں رایوں سے بوجوہ اتفاق نہیں رکھتا یعنی یہ کہ 'ابرام' کے معنی ''معظم باپ'' اور 'ابراہام' کے معنی ''گروہ کثیر کے باپ'' ہیں۔ اس عاجز کے مطابق ابرام 'اب' = باپ اور ''رام'' = معظم سے اور ابراہام ''اب'' = باپ اور ''ہامون'' = گروہ کثیر سے نہیں بنے بلکہ ابرام 'اب ر' بمعنی مضبوط، بہادر، صاحب استقلال، ثابت قدم سے اور ابراہیم دراصل 'اپ رو' 'ح پ رو' یا 'خ پ رو' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں: برادری باہر، غیر قانونی، قانون شکن، مہاجر، قومی مذہب سے پھرا ہوا، مجاہد، مجاہد فی سبیل اللہ۔ واضح رہے کہ یہی وہ ارامی لفظ ہے جس سے 'عبری' یعنی (Hebrew) بھی مشتق ہے۔

توراۃ کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش جنوبی عراق کے شہر 'ار' (Ur) میں ہوئی تھی۔ انکے والد کا نام 'ترح' (ت ر ح)، دادا کا نام نحر (ن ح ر) اور ایک جد کا نام پلج (پ ل ج) تھا۔ حضرت ابراہیم کے دیگر دو بھائیوں کے نام نحر اور حرن تھے۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.aaraalam.net

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ابلیس نے حضرت نوح علیہ السلام کی وفات اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے مابین یعنی 5200 قبل مسیح سے لیکر 1800 قبل مسیح تک روئے ارض پر سینکڑوں سرکش مملکتیں اور کم از کم تین مہیب و غیر معمولی قوت قاہرہ کے حامل نظام عالم (World Orders) برپا کیے۔ ان تین نظام عالم میں سب سے پہلا قوم عاد کا دوسرا قوم ثمود کا اور تیسرا قوم شعیب کا نظام عالم تھا۔

ابلیس نے ان تمام مملکتوں اور نظام عالم کے زمام کار رکھنے والوں، جن کی مسند اعلیٰ پر ان کے بادشاہ بیٹھے تھے، یہ باور کرایا تھا کہ وہ اس روئے زمین کے مالک ہیں۔ یہاں ان کی بادشاہت چلتی ہے اس لئے یہ ان کا ملک ہے۔ اور چونکہ وہ ملک کے مالک ہیں اس لئے وہ ملکوت کے بھی مالک ہیں یعنی خدا ہیں یا خدا کے بیٹے یا خدا کے گھرانے والے ہیں۔ وہ دیوتا ہیں اور ان کی پرستش کی جانی چاہئے۔ انہیں وہی عزت اور وقار ملنا چاہئے جو خدا کی عزت اور خدا کا وقار ہے ان سے وہی صفات منسوب کی جانی چاہئیں جو خدا کی صفات ہیں۔ پھر اسی اصول پر ابلیس کی ہدایت کے مطابق پورے کے پورے نظام مملکت، نظام معاشرت، نظام معیشت، نظام عبادت اور نظام اخلاق وضع اور نافذ کئے گئے۔

کتنے ہی انبیاء ان قوموں کی طرف اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمائے جنہوں نے ان قوموں کے مابین انہیں خطوط پر جن پر نئے میثاق کے تحت حضرت نوح 'اظہار' کر چکے تھے لوگوں کو حق کی طرف دعوت دی اور ابلیس سے معرکہ آرائی کی۔ ابلیس یقیناً اپنی اس حکمت عملی میں بے حد کامیاب تھا۔ اقتدار کا نشہ انسان کو پاگل بنا دیتا ہے۔ اس میں عقل رخصت یا کم از کم معطل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ابلیس کے متبعین پھر کامیاب ہونے لگے۔ ان سینکڑوں مملکتوں میں کم از کم تین نے فساد شرک کا وہ بازار گرم کیا کہ الامان و الحفیظ۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی انسانی حیثیت کو قطعاً بھلا دیا اور واقعی خدا بن بیٹھنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں نظام عالم کو تلپٹ کر دیا۔

ان تینوں نظام عالم کے خاتمے کے بعد چوتھا نظام عالم (World Order) برپا ہوا وہ ان سب کا نقطہ کمال تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نظام عالم گویا اب تک برپا تمام نظام عالم کا مجموعہ تھا۔ اس میں بابلی (Babylonian)، اسیریائی (Assyrian)، متانی (Mittanic)،

حتی (Hittite) اور مصری (Egyptian) تمام ہی مملکتوں کا انسجام تھا گویا یہ ایک واحد قومی نظام عالم (One Nation-Dominated World Order) نہ ہو کر کثیر الاقوامی عالمی نظام (Multinational Global Order) کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ جن میں نمرود بھی تھے اور فرعون بھی۔ گویا یہ اس دور کا آغاز ہے جب ابلیس سابق کے تین مہیب نظام عالم کی تباہی کے بعد ایک ایسے عالمی نظام کے وضع کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو وسیع الاطراف اور ہمہ جہت اور شمولیت کے اعتبار سے پہلا عالمی نظام (Global Order) تھا۔ اس طرح یہ وہ کامیابی تھی جس کے بعد ابلیس نے محسوس کیا کہ اس کا منہج شرک اب کامیاب ہو جائے گا۔ روئے ارض پر کوئی فرد شاید ہی ایسا بچ گیا تھا جو اس بات کا قائل نہ ہو گیا ہو کہ یہ بادشاہ ہی خدا ہیں۔ ملکوت ان کے ہی ہاتھوں میں ہے اور انکی نسبت خداؤں سے ہے۔ یہ خدا کے کاموں میں شریک اور ان کے یہاں قابل عزت واحترام ہیں۔

ٹھیک اسی وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ انہوں نے ایک سو پچھتر سال کی عمر پائی۔ ان کی یہ زندگی معرکہ ٔ خیر وشر میں جہاد عظیم کی وہ داستان ہے جس کی نظیر روئے ارض پر پائی نہیں جاتی۔ قرآن کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لڑکپن میں ہی رشد کی عظیم نعمتوں سے نوازنا شروع کر دیا تھا اور ایسا لگتا ہے کہ وہ بالکل ابتداء شباب یعنی گویا پندرہ سولہ سالوں کی عمر میں ہی نبوت سے سرفراز فرما دیئے گئے تھے۔ ان کا قلب عرش معلیٰ کی طرح تھا اور ان کا جسم ایمان کا آتش فشاں۔ ایک سو پچھتر سالہ زندگی ان تھک جدوجہد کی ایک ایسی داستان ہے جہاں تزلزل، ٹھہراؤ، غفلت، اور جلی یا خفی تعطل کا نام ونشان تک نہیں۔

اقامت ایمان

ابلیس کے منہج فساد ملکوت حکمی یا فساد شرک کو نہایت گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے عہد تک آتے آتے ابلیس نے اس منہج پر ایک عظیم عالمی نظام برپا کر لیا تھا۔ جب ہم نظریہ کا نام لیتے ہیں تو عام طور پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ گویا وہ کوئی فلسفیانہ خیال ہوگا جسے چند دانش ور اور اہل علم علمی طور پر سمجھتے اور زیر بحث لاتے ہوں گے۔

حالانکہ اگر غور کیا جائے تو بالکل دوسری حقیقت سامنے آتی ہے۔ جب کوئی نظریہ انسانوں کے مابین رسوخ حاصل کر لیتا ہے یہاں تک کہ اس پر ایک عالمی نظام برپا ہو جائے تو جان لیجئے کہ گویا وہ نظریہ اس عہد کی انسانی زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر گیا ہے۔ جب ایسی صورتحال ہوتی ہے تو زندگی کا کوئی شعبہ ایسا باقی نہیں رہ جاتا جس کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس نظریئے پر استوار نہ ہو جائے۔ یا اس کے مطابق چلائی نہ جانے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی صورت میں زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس نظریئے پر قائم اور اسی روح کے ذریعہ چلائی جانے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اس نظریئے سے الگ کسی نظریئے پر قائم کسی معاشرہ حتی کہ فرد کا باقی رہنا محال ہو جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ یا فرد اگر پایا بھی جائے تو وہ کلیۃً حاشیئے پر کھڑے ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ابلیس کے ذریعہ قائم یہ عالمی نظام جو فساد ملکوت حکمی یا فساد شرک پر قائم تھا اور جس کی روح یہ تھی کہ ”جو ملک کا مالک ہے وہ ملکوت کا مالک ہے“... اس وقت روئے ارض پر قائم انسانی معاشرے پر کلی طور پر محیط ہو چکا تھا۔ زندگی کا ایک ایک گوشہ اسی شرک پر قائم ہو چکا تھا۔ وہ لوگ جو اللہ کے ہونے اور اس کے احد و واحد ہونے کے قائل تھے یا تو کلیۃً مفقود ہو چکے تھے یا معاشرہ میں بالکل حاشیہ (Marginalised) پر دھکیل دیئے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی معاشرہ اس شرک فی ملکوت یا شرک فی الذات والصفات پر قائم ہو چکا ہو تو وہ مجرد حالت میں پایا نہیں جاتا ہوگا کہ لوگ صرف یہ خیال یا تصور رکھتے ہونگے۔ بلکہ اس کے حقیقی اور تصوراتی مظاہر بھی مستحکم ہو چکے ہونگے۔ یعنی علامتیں، تصورات، تصویریں، اصنام اور بت جو الگ الگ اعتبار سے ملکوت میں حصہ دار قرار دیئے جاتے ہوں گے۔ پھر ان علامتوں سے خصوصی نسبت رکھنے والے افراد ہونگے جو دراصل عمائد نظام کی طرح پورے نظام کو تھامے ہوئے ہونگے اور ان سب میں سب سے بڑا خود بادشاہ معظم ہوگا جو ملکوت کے مالک الملک کا بیٹا، اوتار یا نمائندہ قرار دیا گیا ہوگا۔ اور گویا ان نسبتوں پر قائم ہو کر خود کو ملکوت کا مالک کہلاتا ہوگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان بنیادوں پر عقائد اور عقیدتیں راسخ ہو چکی ہوں گیں۔ اور ان عقیدتوں پر معاشرے اور معاشرتی و اخلاقی آداب و اطوار، رسوم، عبادات اور قیود اور قوانین و ضوابط نے لوگوں کو پوری سختی سے جکڑ لیا ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس وقت اس طرح اس نظام ابلیس کے گرد اگرد تین مضبوط و مستحکم قلعہ بندیاں تھیں جن کا توڑنا کسی کے لئے ممکن نہ تھا۔ یہ قلعہ بندیاں دراصل شرک کے اقتدار اعلیٰ کی قلعہ بندیاں

تھیں جنہیں ذیل میں اس طرح درج کیا جاسکتا ہے:

(۱) اقتدار اول : انتظام نظام کی قلعہ بندی
(۲) اقتدار دوم : انتظام معاشرت، رسوم و قیود کی قلعہ بندی
(۳) اقتدار سوم : انتظام عقیدہ، عقیدت، عبادات کی قلعہ بندی
(۴) اقتدار چہارم : منصب بادشاہ کی قلعہ بندی

اقتدار کی ان چار دفاعی قلعہ بندیوں میں محفوظ و مستحکم فساد شرک کا عالمی نظام کس قدر ناقابل تسخیر ہوگا اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بادشاہ کو قتل کیا جاسکتا ہے، عقیدہ و عقیدت سے بغاوت کی جاسکتی ہے، معاشرہ اور معاشرتی رسوم و قیود کے خلاف اعلان جنگ کیا جاسکتا ہے۔ دنیا کے انتظامی امور سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے لیکن جب کوئی نظام ایسا مستحکم ہو جس کی یہ چار قلعہ بندیاں ہوں اس کو ہلایا تک نہیں جاسکتا اس لئے کہ ایک ستون یا قلعہ بندی کے گرتے ہی بقیہ ستون اور قلعہ بندیاں اس کا ازالہ کر دیتی ہیں یا اسے تھام لیتی ہیں اور دیکھتے دیکھتے وہ پہلی صورت بحال ہو جاتی ہے۔ میرے علم کی حد تک تاریخ انسانی میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامے کے علاوہ کوئی دوسری مثال نہیں ملتی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس کارنامے کی نظیر ہو۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کوشش خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے میثاق کی اگلی کڑی ہے اس لئے گویا وہ ایک ہی کوشش ہے۔

ایک ایسے ناقابل تسخیر نظام کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا اور اسے زمین بوس کر دینا تو دور کی بات ہے محض اس کا انکار کر دینا بھی ایک ایسے ایمان کا تقاضا کرتا ہے جو پہاڑ کی طرح مستحکم ہو۔ حضرت ابراہیم اس فساد عظیم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہاں اسی ایمانی سفر کو اقامت ایمان سے موسوم کیا گیا ہے جس کے دو شعبے ہیں پہلا شعبہ ’’اظہار ایمان‘‘ اور دوسرا شعبہ ’تقویت ایمان‘‘۔ اظہار ایمان کا تعلق حضرت ابراہیم کے اپنے ایمان اور اس کے تقاضے کی تکمیل سے ہے جبکہ تقویت ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی اس مدد سے ہے جو اس نے ان نازک موقعوں پر حضرت ابراہیم کی تقویت کے لئے عطا فرمائی۔

(۱) **پہلا اظہار ایمان:** حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلا اظہار ایمان، انکار غیر اللہ اور اعلان انکار غیر اللہ سے کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس اظہار کے صلے میں ان کی تقویت ایمان کا

سامان فرمایا: قرآن کا ارشاد ہے:

ولقد آتینا ابراھیم رشدہ من قبل وکنا بہ علمین (الانبیاء ۵۱)

ترجمہ: اور آگے دی ہم نے ابراہیم کو اس کی نیک راہ اور ہم رکھتے ہیں اس کی خبر۔

(۲) دوسرا اظہار ایمان: حضرت ابراہیم نے دوسرا اظہار ایمان، انہدام مظاہر غیر اللہ اور دعوت انکار غیر اللہ سے کیا۔ یوں تو پہلا اظہار ایمان ہی پورے نظام کو چیلنج دینے کے مترادف تھا دوسرا اظہار ایمان اس پورے نظام کے خلاف گویا عملی طور پر آغاز جنگ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ چنانچہ یہ مرحلہ بے حد جانکاہ تھا جو غیر معمولی ایمانی قوت کا تقاضا کرتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ سے اس ایمان کی دعا فرمائی آپ نے فرمایا:

رب ارنی کیف تحی الموتی (البقرہ ۲۶۰)

ترجمہ: اے رب مجھے دکھلا کیسے تو مردہ کو زندگی دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پوچھا:

اولم تؤمن (البقرہ ۲۶۰)

ترجمہ: کیا تجھ کو یقین نہیں آتا۔

حضرت ابراہیم نے جواب دیا:

بلی ولکن لیطمئن قلبی (البقرہ ۲۶۰)

ترجمہ: کیوں نہیں لیکن اس واسطے چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جائے میرے دل کو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حیات وموت کے تعلق سے اپنے ملکوت کا مشاہدہ کرایا:

قال فخذ اربعة من الطیر فصرھن الیک ثم اجعل علی کل جبل منھن جزائم ادعھن یاتینک سعیا واعلم ان اللہ عزیز حکیم (البقرہ ۲۶۰)

ترجمہ: فرمایا: تو پکڑ لے چار جانور اڑنے والے پھر ان کو ہلا لے اپنے ساتھ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر ان کو بلا چلے آویں گے تیرے پاس دوڑتے۔ اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا۔

(۳) تیسرا اظہار ایمان: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تیسرا اظہار ایمان اعلان کلی براۃ عن غیر اللہ یعنی شرک کے ہر مدعی کے خلاف کلی اعلان جنگ سے کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asiaalam.net

حیات طیبہ کا یہ سب سے سنگین مرحلہ تھا جہاں آپ یک وتنہا پوری کائنات غیر اللہ کے خلاف کھڑے ہوگئے۔ یہ اظہار ایمان دنیا کے سارے بادشاہوں، ساری حکومتوں، ان کی ساری قوت بلکہ سارے نظام کے خلاف حضرت ابرہیم کا تنہا اٹھ کھڑا ہونا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سنگین ترین مرحلے میں آپ کی تقویت کا سامان کیا اور آپ کو پورے ملکوت السموت والارض کا مشاہدہ کروایا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وکذلک نری ابراھیم ملکوت السموت والارض ولیکون من الموقنین۔ فلما جن علیه الیل را کو کبا قال ھذا ربی فلما افل قال لا احب الافلین۔ فلما را القمر باز غا قال ھذا ربی فلما افل قال لئن لم یھدنی ربی لاکونن من القوم الضالین۔ فلما را الشمس باز غة قال ھذا ربی ھذا اکبر فلما افلت قال یقوم انی بری مما تشر کون (الانعام ۷۸۔۷۵)

ترجمہ:

اور اس طرح ہم نے دکھایا ابراہیم کو ملکوت السموات والارض۔ اور یہ اس لئے دکھایا کہ وہ صاحب (علم) یقین ہوجائے۔ پھر جب اندھیرا کرلیا اس پر رات نے اس نے ایک ستارہ دیکھا۔ اس نے (اپنے آپ سے) کہا: کون ہے ہمارا رب؟ پس (ابھی اس نے یہ سوال پوچھا ہی تھا کہ) وہ غائب ہوگیا۔ ابراہیم نے کہا میں غائب ہوجانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر اس نے چاند کو روشن ہوتے دیکھا۔ اس نے (اپنے آپ سے) کہا: کون ہے ہمارا رب؟ پس وہ غائب ہوگیا تو ابراہیم نے کہا اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ دے رہا ہوتا تو میں بے شک بھٹک جانے والوں میں سے ہوجاتا۔ پھر اس نے سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے (اپنے آپ سے) کہا: کون ہے ہمارا رب؟ کون بڑا ہے؟ پھر وہ غائب ہوگیا تو ابراہیم نے پکار کر کہا اے میری قوم! (تم کچھ کرلو) یہ ناممکن ہے کہ میں اللہ کی ذات میں انہیں شریک کروں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس 'اقامت ایمان باللہ' کو قرآن میں ''توجیہ للہ'' کے نام سے پکارا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

انی وجھت وجھی للذی فطر السموت والارض حنیفا وماانا من المشر کین

(الانعام ۷۹)

ترجمہ: میں پورا کا پورا یکسو ہو گیا ہوں اس کے لئے جس نے سموات اور ارض کو پیدا کیا ہے اور میں شریک کرنے والوں میں نہیں ہو سکتا۔

اقامت اعلاء کلمۃ حق

اقامت اعلاء کلمۃ حق سے مراد عام طور پر تبلیغ و دعوت لی جاتی ہے۔ جو پوری طرح درست نہیں بلکہ کسی قدر گمراہ کن ہے۔ تبلیغ و دعوت اس اقامت کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہوا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول بنیادی طور پر 'ہدیٰ' کے ساتھ 'اظہار' کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اور وہ اس 'ہدیٰ' کی روشنی میں 'اظہار' کی 'سنت' قائم فرماتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اعلاء کلمۃ حق کی اقامت فرمائی۔

اقامت ایمان کے ذیل میں یہ بات گزر چکی ہے کہ فساد ملکوت حکمی یعنی فساد شرک ایک عالمی نظام (World Order) کی صورت میں اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ قائم تھا جس کی چار مضبوط و مستحکم قلعہ بندیاں تھیں۔ اس نظام کا انہدام ان قلعہ بندیوں کے ٹوٹ جانے کے بعد ہی ممکن تھا۔ ایک ہمہ گیر اعلاء کلمۃ حق کے بغیر ان قلعہ بندیوں کا خاتمہ ناممکن تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس اعلاء کلمۃ حق کے لئے ایک ہمہ گیر نقشہ تیار کیا جس کے تین مدرج تھے اور ہر مدرج میں کم از کم دو بڑے شعبے نمایاں تھے۔ واضح رہے کہ حضرت ابراہیم کے سامنے اعلاء کلمۃ حق کے چار مخاطب ہو سکتے تھے۔ (۱) اہل خاندان (۲) عوام (۳) علماء و عمائد نظام اور چھوٹے بادشاہ (۴) اس عالمی نظام کا سب سے بڑا بادشاہ۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان میں سے ہر ایک طبقے کے سامنے اعلاء کلمۃ حق کی حجۃ پوری فرمائی۔

(۱) اقامت اعلاء کلمۃ حق اول: اعلاء کلمۃ حق کا یہ پہلا مدرج ہے۔ حضرت ابراہیم نے اس مدرج میں دو عظیم الشان کام انجام دیئے جو اس مدرج کے دو شعبے شمار ہوئے جو درج ذیل ہیں:

(الف) اعلان نبوت: آپ نے لوگوں کو بتایا کہ اللہ رب العزت نے آپ کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے اور یہ بنی نوع انسان اس میثاق کے ماننے اور اسے پورا کرنے کا پابند ہے جو اللہ اور

prepared by M. Aamir Mehmood
www.israralam.net

حضرت نوح کے مابین ہوا تھا۔ آپ نے اپنے والد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

یا ابت انی قد جاء نی من العلم مالم یا تک فاتبعنی اھدک صراطا سویا (مریم ۴۳)

ترجمہ: اے باپ میرے مجھ کو آئی ہے خبر ایک چیز کی جو تجھ کو نہیں آئی سو میری راہ چل دکھلا دوں تجھ کو راہ سیدھی۔

آپ نے سبھوں کو حضرت نوح سے کئے میثاق کو یاد دلایا اور اسے پورا کرنے اور ابلیس کے اتباع سے باز رہنے کی تلقین کی۔ آپ نے اس عذاب سے بھی ڈرایا جس کا خوف حضرت نوح کو دلایا گیا تھا (سورہ ہود ۴۸)۔ آپ نے فرمایا:

یا بت لاتعبد الشیطن ان الشیطن کان للرحمن عصیا. یابت انی اخاف ان یمسک عذاب من الرحمن فتکون للشیطن ولیا (مریم ۴۔۴۳)

ترجمہ: اے باپ میرے مت پوج شیطان کو بے شک شیطان ہے رحمٰن کا نافرمان۔ اے باپ میرے میں ڈرتا ہوں کہیں آ لگے تجھ کو ایک آفت رحمٰن سے پھر تو ہو جائے شیطان کا ساتھی۔

(ب) دعوت توحید: آپ نے لوگوں کو حجت اور دلیل کے ساتھ سمجھایا کہ اللہ رب العزت صرف ایک ہے وہی خالق ارض وسماء ہے۔ ساری کائنات پر اس کا حکم چلتا ہے۔ اس کے سوا کوئی نفع پہنچانے والا ہے نہ نقصان اس لئے کہ ملکوت السموٰت والارض کا صرف وہی مالک ہے۔ اور اس کے سوا کوئی مالک نہیں۔ آپ نے فرمایا:

قال بل ربکم رب السمٰوٰت والارض الذی فطرھن وانا علی ذلکم من الشھدین (الانبیاء ۵۶)

ترجمہ: بولا نہیں رب تمہارا وہی ہے رب آسمانوں اور زمین کا جس نے ان کو بنایا اور میں اسی بات کی گواہی دیتا ہوں۔

آپ نے لوگوں کو ان کے اعتقادات کے کھوکھلے پن کی طرف متوجہ کیا اور انہیں جھنجھوڑتے ہوئے ان سے کہا کہ خدا کے سوا اور کو اس کے ملکوت میں دخیل اور شریک ماننا کتنا کھوکھلا عمل ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ انہیں صنم اور بت بنا کر پوجنا اور انہیں نفع اور نقصان کا مالک سمجھنا تو اور بھی بڑے عقلی دیوالیہ پن کی دلیل ہے۔ آپ نے فرمایا:

قال هل يسمعو نكم اذتدعون. اوينفعونكم او يضرون (الشعراء۳۔۷۲)

ترجمہ: کہا کچھ سنتے ہیں تمہارا کہا جب تم پکارتے ہو یا کچھ بھلا کرتے ہیں تمہارا یا برا

اس سے آگے جا کر آپ نے لوگوں کو اپنی مثال دی اور صاف صاف کہا کہ میں صرف اللہ واحد کو مانتا ہوں اور وہی اس کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی ملکوت کا مالک ہے نہ اس کی کائنات میں زرہ برابر بھی اختیار رکھتا ہے نہ کسی کے نفع اور نقصان پر قدرت رکھتا ہے۔ میں اللہ کے سوا ہر کسی کو رد کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا:

فانهم عدولي الارب العلمين. الذی خلقنی فهو يهدين والذی هو يطعمنی ويسقين واذا مرضت فهو يشفين والذی يميتنی ثم يحيين والذی اطمع ان يغفرلی خطيئتی يوم الدين (الشعراء۸۲۔۷۷)

ترجمہ: سو وہ میرے دشمن ہیں مگر سارے جہانوں کا رب۔ جس نے مجھ کو بنایا سو وہی مجھ کو راہ دکھلاتا ہے اور جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوں تو وہی شفا دیتا ہے اور جو مجھ کو مارے گا پھر زندہ کرے گا اور وہ جو مجھ کو توقع ہے کہ بخشے میری تقصیر حساب کے دن۔

(۲) اقامت اعلاء کلمۃ حق دوم: اعلاء کلمۃ حق کا یہ دوسرا مدرج تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مدرج میں پہلے مدرج سے بھی زیادہ عزیمت کا ثبوت دیتے ہوئے دو غیر معمولی کام انجام دیئے۔ اس کام کی باریکی اور نزاکت اعلاء کلمۃ حق کی راہ کی نازک ترین منزل ہے۔ فساد شرک پر مبنی نظام لوگوں کے جسم و جان میں اس طرح پیوست تھا کہ صرف ایسا نہیں کہ لوگ شرک کے ماحول میں رہتے تھے اور صرف مشرکانہ رسوم، عبادات، قوانین اور معاشرت سے گھرے ہوئے تھے بلکہ یہ مشرکانہ امور ان کی زندگیوں میں ہی نہیں بلکہ دل و دماغ میں عقیدہ اور عقیدت کے اعتبار سے راسخ تھے۔ کلیتاً بے حقیقت چیز بھی عقیدہ اور عقیدت کی زمین پر پہاڑ کی طرح مستحکم ہو جاتی ہے۔ لوگ ان مشرکانہ باتوں اور عقائد کے بارے میں دل سے ایسا سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقت ہیں۔ ایسے میں اصل ضرورت کس بات کی ہوتی ہے؟ کیا کسی کے مشرکانہ عقاید پر اس لئے ضرب لگائی جائے کہ اس سے اس کے جذبات مجروح ہوں یا اس لئے کہ اس پر منکشف ہو جائے کہ اس کے عقاید بے حقیقت ہیں۔ پہلی ضرب اعلاء کلمۃ حق کو روکنے والی اور نقصان پہنچانے والی ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلام نے دوسروں کے معبودوں کو برا کہنے سے روکا ہے

تا کہ جذبات کے مجروح ہونے کے بعد کوئی اللہ کو محض اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے برا نہ کہدے۔ حضرت ابراہیم نے وہ راہ اختیار کی جو اصل مقصود تک پہنچانے والی، اظہار کو یقینی بنانے والی اور ماسوا اللہ کے ملکوت میں قدرت رکھنے کے عقیدے کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرنے والی تھی۔ حضرت ابراہم نے اس تعلق سے دو عظیم کام کئے جو قولی نہیں بلکہ عملی تھے۔

(الف) معبود غیر اللہ کے بے حقیقت ہونے کو ثابت کرنا:

معبود بنائے جانے اور عبادت کئے جانے سے قبل کوئی تصور یا وجود لوگوں کی عقیدت کا حصہ بن جاتا ہے لوگوں کے قلوب اور ان کے دل و دماغ اس وجود کی عقیدت سے بھر چکے ہوتے ہیں۔ لوگ خواہ غلط اور بے حقیقت اشیاء اور وجود کی ہی کیوں نہ پرستش کر رہے ہوں لیکن وہ منافقانہ طور پر ایسا نہیں کرتے بلکہ دل کی گہرائیوں سے ایسا کرتے ہیں۔ صحیح یا غلط اس سے بحث نہیں لیکن وہ چیزیں لوگوں کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوتی ہیں تب جا کر کہیں کسی کی پرستش ہوتی ہے۔ لہذا حضرت ابراہیم نے دعوت توحید کے عام ہونے کے بعد ایک ایسا عملی مظاہرہ کیا جو کسی انتقام کے جذبے سے کیا گیا تھا نہ کسی کی بے حرمتی کے ارادے سے بلکہ آپ نے بہت سوچ سمجھ کر اور پورے اہتمام کے ساتھ یہ عمل کیا۔ ان کا یہ عمل بجائے خود مقصود نہیں تھا بلکہ دعوت عام کے بعد اس طرح کا عمل اس ذہنی اور قلبی کیفیت کے پیدا کرنے کے لئے تھا جس میں انہیں حجت کی وہ آخری بات کہنی تھی جو اس وقت تک نہیں کہی جا سکتی تھی جب تک کہ لوگوں کے دل و دماغ اس حجت کو دیکھنے، اس پر غور کرنے اور نتیجہ اخذ کرنے کی کیفیت میں نہ آ چکے ہوں۔

ایسا لگتا ہے کہ اس کے لئے خصوصی اہتمام کئی پہلو سے تھا۔ آپ نے پہلا اہتمام یہ کیا کہ اس کام کے لئے پورے نظام کے سب سے مرکزی مقام کو منتخب فرمایا جہاں اس نظام فساد ملکوت کی عقیدت کی اعلیٰ ترین صورت پائی جاتی تھی۔ آپ نے دوسرا اہتمام یہ فرمایا کہ اس کام کے لئے ایک ایسے وقت کا انتخاب کیا جس میں پوری قوم اور اس کے کہہ و مہ سب ہی وہاں موجود ہوں۔ آپ نے تیسرا اہتمام یہ فرمایا کہ یہ سارا کام آپ نے جس حجت کے پورا کرنے کے لئے کیا تھا اس کے لئے آپ کا وہاں بنفس نفیس موجود ہونا ضروری تھا لہذا آپ نے لوگوں کے اس سیلاب بے پناہ میں جو آپ کے خلاف اس عمل کے نتیجے میں امنڈ آیا تھا اپنے آپ کو پہاڑ کی طرح

مستحکم اور موجود رکھا۔ چنانچہ قرآن اس عظیم الشان حجت ابراہیمی کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے:

(۱) وتالله لاكيدن اصنامكم بعد ان تولوا مدبرين (الانبیاء ۵۷)

ترجمہ: اور قسم اللہ کی میں علاج کر دوں گا تمہارے بتوں کا جب تم جا چکو گے پیٹھ پھیر کر۔

(۲) فنظر نظرة في النجوم فقال اني سقيم فتولوا عنه مدبرين (الصافات ۸۸_۹۰)

ترجمہ: پھر نگاہ کی ایک بار تاروں کی طرف پھر کہا میں جلدی بیدار ہو گیا۔ پس جب وہ لوگ پیٹھ پھیر کر جا چکے۔

(۳) فراغ الى آلهتكم فقال الا تاكلون مالكم لا تنطقون۔ فراغ عليهم ضربا باليمين (الصافات ۹۳_۹۱)

ترجمہ: تو پھر وہ ان کے بتوں کے پاس جا گھسا۔ بولا تم لوگ کیوں نہیں کھاتے۔ تم آخر بولتے کیوں نہیں۔ پھر گھسا ان پر مارتے ہوئے داہنے ہاتھ سے۔

(۴) فجعلهم جذذا الا كبيرا لهم لعلهم اليه يرجعون۔ قالوا من فعل هذا بالهتنا انه لمن الظلمين۔ قالوا سمعنا فتى يذكرهم يقال له ابراهيم۔ قالوا فاتوا به على اعين الناس لعلهم يشهدون (الانبیاء ۶۱_۵۸)

ترجمہ: پھر کر ڈالا ان کو ٹکڑے ٹکڑے مگر ایک بڑا ان کا کہ شاید اسکی طرف رجوع کریں۔ کہنے لگے کس نے کیا یہ کام ہمارے معبودوں کے ساتھ۔ وہ تو کوئی ظالم ہے۔ وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان بتوں کو کچھ کہا کرتا ہے اس کو کہتے ہیں ابراہیم وہ بولے اس کو لے آؤ۔ لوگوں کے سامنے۔ شاید وہ دیکھیں۔

(۵) فاقبلوا اليه يزفون (الصافات ۹۴)

ترجمہ: پھر لوگ آئے اس پر دوڑ کر گھبراتے ہوئے۔

(۶) قالوا ءانت فعلت هذا بالهتنا يا براهيم قال بل فعله كبيرهم هذا فسئلوهم ان كانوا ينطقون۔ فرجعوا الى انفسهم فقالوا انكم انتم الظلمون۔ ثم نكسوا على رء وسهم لقد علمت ما هؤلاء ينطقون (الانبیاء ۶۵_۶۲)

ترجمہ: بولے کیا تو نے کیا ہے۔ یہ ہمارے معبودوں کے ساتھ اے ابراہیم۔ بولا نہیں پر یہ کیا ہے

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarlalam.net

ان کے اس بڑے نے سوان سے پوچھ لو۔ اگر وہ بولتے ہیں۔ پھر سوچے اپنے جی میں پھر بولے لوگو تم ہی ظالم ہو۔ پھر اوندھے ہوگئے سر جھکا کر تو تو جانتا ہے جیسا یہ بولتے ہیں۔

(۷) قال اتعبدون ما تنحتون و الله خلقکم وماتعملون (الصافات۹۶۔۹۵)

ترجمہ: بولا کیوں پوجتے ہو جب آپ تراشتے ہو۔ اور اللہ نے بنایا تم کو اور جو تم بناتے ہو۔

(۸) قال افتعبدون من دون الله مالا ینفعکم شئیا ولایضرکم اف لکما ولما تعبدون من دون الله افلا تعقلون (الانبیاء۶۷۔۶۶)

ترجمہ: بولا کیا پھر تم پوجتے ہو اللہ کے سوا ایسے کو جو تمہارا کچھ بھلا کرے نہ برا۔ بیزار ہوں میں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا۔ کیا تم کو سمجھ نہیں۔

ان آیات کو دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عزیمت عظمی کا یہ کام حضرت ابراہیم نے آخر کیوں کیا؟ وہ کیا چاہتے تھے جسے انہوں نے بخوبی سرانجام دیا؟ یہ کام نہ جذباتی عمل تھا نہ خفیہ کارروائی۔ حتی کہ نظام وقت کے سب سے بڑے معبد میں بتوں کو اس دن توڑنا اور سب سے بڑے بت کو چھوڑ دینا جس دن ساری قوم جس میں عام زائرین سے لیکر مذہبی، سیاسی، معاشرتی عمائد حتی کہ بادشاہ وقت سب ہی موجود ہوں یہ سب اس لئے کیا گیا تھا تا کہ وہ بات کہی جا سکے جس کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔ اس کے لئے بنفس نفیس آپ کا وہاں موجود ہونا اور بلائے جانے پر نظام کے سارے منتخب لوگوں کے سامنے جرأتمندانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کرنا اور ان سب کے سامنے پوری جراءت اور دیانت کیساتھ حق بات کہنا اور اس کی حجت کو پوری کرنا حضرت ابراہیم جیسے اولوا العزم رسول سے ہی ممکن تھا۔

دراصل آپ تمام لوگوں کے سامنے دو باتیں عملاً ثابت کرنا چاہتے تھے۔ پہلی بات تو وہی ہے جس کا عنوان قائم کیا گیا ہے یعنی آپ پوری قوم، اس کے تمام اہل علم، اہل مذہب اور عمائد نظام حتی کہ بادشاہ کے سامنے عملاً ثابت کرنا چاہتے تھے کہ یہ معبودان غیر اللہ جس سے لوگوں نے فی الواقع عقیدت کی نسبت بنا رکھی ہے، جس کے بارے میں وہ صدق دل سے سمجھتے ہیں کہ یہ ملکوت میں تصرف رکھتے ہیں اور واقعی لوگوں کی عقیدت اور پرستش کے مستحق ہیں اس لئے کہ ان کے قبضۂ قدرت میں ملکوت ہے، وہ لوگوں کو نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ سو لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ سب بے حقیقت ہے۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ملکوت میں تصرف رکھنا تو دور

www.booksube.net
www.urdudube.net
prepared by M. Aamir Mehmood

کی بات ہے ان متصور معبودان غیر اللہ کی، جن کی عقیدت میں لوگ ان کے اصنام اور بت بنا کر انہیں پوجتے ہیں، انہیں ملکوت السموات والارض میں کوئی تصرف اور قدرت حاصل نہیں۔ بلکہ وہ تو اتنے بے حقیقت اور بے قوت ہیں کہ وہ خود اپنے بتوں اور مجسموں کو بھی بچانے کی حالت میں نہیں نہ اس کو کچھ نقصان پہنچانے کی حالت میں ہیں جس نے ان کے مجسموں اور بتوں کی یہ درگت بنائی ہے۔ آپ نے اس سے آگے جا کر پورے نظام پر یہ بات بھی باور کرانے کی عملی کوشش کی کہ ان معبودان باطل کی بات الگ رہی یہ بت جنہیں ان سے نسبت ہے یا جو ان کی علامتیں ہیں اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے محض لکڑی یا پتھر کے بت ہیں۔ جنہیں خود لوگ جانتے ہیں کہ ان کی کیا حقیقت ہے۔ جب ان معبودان غیر اللہ کی ہی کوئی حقیقت اور وجود نہیں تو ان بتوں کی کیا حیثیت جن کی تصوراتی شکلوں پر انہیں بنایا گیا ہے۔

(ب) معبودان غیر اللہ کے خوف سے لوگوں کو باہر نکالنا

عقیدت کا یہ پہلو پہلے حصے سے کم مستحکم نہیں ہوتا۔ ہر چند کہ لوگ آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں اور تصویروں کو پوجتے ہیں لیکن جو چیز انہیں عقیدت پر مجبور کرتی ہے وہ کاغذ کی تصویریں یا مٹی یا پتھر کے بت نہیں بلکہ یہ احساس کہ یہ فی الواقع معبود ہیں اور اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ وہ دل سے ایسا سمجھتے ہیں کہ ان معبودان غیر اللہ کی رضا انہیں نفع اور انکی ناراضگی نقصان پہنچا سکتی ہے چنانچہ یہ عقیدت دراصل ایک خوف کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ بہت سے لوگ انہیں پتھر کے بنائے ہوئے بت بھی سمجھتے ہیں لیکن پھر بھی ان کے تعلق سے ایک غیر معلوم اور انجانے خوف سے ڈرتے بھی ہیں۔

حضرت ابراہیم نے سبھوں کے سامنے لوگوں کو عملی طور پر دکھایا کہ کس طرح انہوں نے ان معبودان غیر اللہ کو مسمار کیا اور ان کا کچھ بھی نقصان نہیں ہوا۔ وہ ان کے سامنے کھڑے ہو کر سمجھا رہے تھے کہ ان بتوں اور ان سے منسوب اصلی معبودان غیر اللہ کو کوئی طاقت وقدرت حاصل نہیں بلکہ وہ بے حقیقت ہیں۔ وہ جب اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے نہ اپنے توڑنے والوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں نہ توڑنے والے کو نقصان پہنچا سکتے ہیں پھر انہیں ملکوت میں مقتدر سمجھنا کیسی نادانی

prepared by M. Aamir Mehmood
www.urdunovels.net

اور بے وقوفی کا کام۔ حضرت ابراہیم کا یہ عمل قولی اور ادعائی نہیں تھا بلکہ عملی تھا۔ ہزاروں لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ واقعی یہ معبودان غیر اللہ کس طرح ٹوٹے اور بکھرے پڑے تھے اور یہ کہ ان کی کیا حقیقت ہے؟

(۳) **اقامت اعلاء کلمہ حق سوم:** یہ اقامت اعلاء کلمہ حق کا تیسرا مدرج ہے۔ غور کرنے والوں کے لئے اس کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کہ دوسرا مدرج ہی اس پورے عالمی نظام کو چیلنج دینے کے مترادف تھا چہ جائے کہ یہ تیسرا مدرج۔ اس تیسرے مدرج کا مطلب ہے فساد ملکوت حکمی یا فساد شرک کی آخری اور اعلیٰ ترین قوتوں کے سامنے کلمۂ حق کا عملی اظہار۔ دوسرے مدرج کا اختتام وہیں ہوتا ہے جہاں سے تیسرے مدرج کا آغاز ہوا۔ یہ بات بڑی واضح ہے کہ دوسرے مدرج میں اقامت اعلاء کلمۂ حق سے ہی حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کا جو چند بلکہ مٹھی بھر افراد ہونگے اور نظام وقت کا جو ایک عالمی نظام تھا بالکل سیدھا اور براہ راست تصادم ہو گیا ہوگا۔ ان دونوں طبقوں کا یہ تصادم اتفاقی نہیں تھا نہ ہی حق کے مقابلے میں باطل کی شہہ زوریوں اور دیدہ دلیریوں سے ہونے والا تصادم تھا بلکہ یہ تصادم پورے شعور کے ساتھ ہوا اور باطل کی نہیں بلکہ حق کی مرضی اور کوشش سے ہوا۔ درست بات یہ ہے کہ حق نے باطل کو اس مقام پر پوری قوت سے کھینچ کر لا دیا جہاں حق اور باطل کے مابین سیدھے سیدھے تصادم کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں بچ گئی تھی۔ حضرت ابراہیم نے باطل کو اپنے دلائل اور اولوالعزمی سے مجبور کر دیا کہ وہ مندرجہ ذیل دو باتوں میں سے کوئی ایک بات قبول کر لے:

(۱) یا تو حضرت ابراہیم کی بات مان کر پورا نظام فساد ملکوت حکمی سے تائب ہو جائے اور اللہ کو ملکوت السموات والارض کا اکیلا مالک مان لے۔

(۲) یا اپنے تمام معبودان غیر اللہ کی مدد سے انہیں اس اظہار حق سے روک لے۔

ظاہر ہے اپنی طاقت، قوت اور جبروت کے ایسے نشے میں جسے لانے میں فساد ملکوت حکمی کی اعتقادی شراب کو دخل ہو پہلی بات کب قبول ہوگی۔ چنانچہ نظام وقت کا جبروت بے قابو ہو گیا اور اس نے وہی فیصلہ کیا جو اس طرح کی طاقت کرنے کی عادی ہوتی ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے ابھی کہا گیا کہ یہ تصادم اتفاقی طور پر نہیں ہوا نہ باطل کی شہہ زوریوں سے ہوا بلکہ حق نے پورے شعور کے ساتھ باطل کو مجبور کیا کہ وہ فیصلہ کے اس مقام پر آ جائے اور چونکہ یہ بات بالکل یقینی تھی اور

www.booksube.net
prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarulalam.net

حضرت ابراہیم خوب جانتے تھے کہ یہ نظام پہلا راستہ قطعاً اختیار نہیں کر سکتا اس لئے اہل حق اور نظام وقت کا ٹکراؤ بالکل سیدھا اور براہ راست تصادم کی شکل اختیار کرے گا۔

ادھر حضرت ابراہیم کی حالت یہ تھی کہ وہ بھاگے ہوئے تھے نہ کسی خفیہ مقام سے ایسی کارروائی کر رہے تھے بلکہ وہ خود لاکھوں لوگوں کے جم غفیر میں نظام کے منتخب لوگوں کے درمیان کھڑے تھے۔ اس صورتحال میں پہلی بات کے قبول کرنے کا یوں بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے اقامت اعلاء کلمۂ حق کا تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

ظاہر ہے لوگوں نے آپ کو گرفتار کرا یا ہوگا اور نظام کے بادشاہ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا ہوگا۔ اس تیسرے مدرج میں حضرت ابراہیم نے دو مزید عظیم الشان عزیمتوں کا ثبوت دیا۔ جس نے اعلاء کلمۂ حق کے اظہار کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا۔ یہ دو عزیمتیں درج ذیل ہیں:

(الف) ظاہری منبع فساد ملکوت حکمی کو عملاً بے حقیقت ثابت کر دینا:

حضرت ابراہیم گرفتار کر لئے گئے اور نظام کی سب سے بڑی عدالت یعنی بادشاہ نظام کے سامنے پیش کئے گئے۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ حضرت ابراہیم وہاں بری ہونے کے لئے کوشاں نہیں تھے نہ اس بات کے خواہشمند کہ آپ یہ ثابت کریں کہ لوگوں نے خواہ مخواہ ایک بے گناہ کو پکڑ لیا ہے اور یہ کہ آپ کو چھوڑ دیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے اقامت اعلاء کلمۂ حق کے مدرج دوم پر کھڑے ہی اس لئے ہوئے تھے کہ آپ اس حجت کو پوری کر سکیں جس کے بعد ابلیس کے فساد ملکوت حکمی پر قائم نظام کے پاس شکست تسلیم کرنے کے سوا کوئی اور راہ باقی نہ بچ جائے۔ ابلیس کے نظام فساد ملکوت حکمی نے آپ کو نظام کی سب سے بڑی عدالت میں پیش ہونے کے لئے مجبور نہیں کیا بلکہ حضرت ابراہیم نے نظام فساد ملکوت حکمی کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کو اپنی سب سے بڑی عدالت میں پیش کرے۔ نظام وقت کی سب سے بڑی اور اونچی مسند پر بیٹھا بادشاہ دراصل نظام فساد ملکوت حکمی کا وہ منبع شر تھا جو خود کو رب کہتا تھا۔ ابلیس نے اسے باور کرایا تھا کہ وہ رب العالمین ہے اس لئے کہ وہ ملک کا مالک ہے۔ اور چونکہ وہ ملک کا مالک ہے اس لئے ملکوت کا بھی مالک ہے۔ ابلیس نے اس کے لئے پورے نظام کو برپا کیا تھا جس کی ہر شئے اسے ہمہ وقت شہادت دیتی تھی کہ وہ فی الواقع ملکوت کا مالک اور رب العلمین ہے۔

جب حضرت ابراہیم کا اس خود ساختہ رب العالمین سے سامنا ہوا تو ظاہر ہے آپ نے

جو کچھ بھی کہا ہوگا وہ یہی ہوگا کہ تم رب العالمین نہیں ہو۔ اگر تم رب العالمین ہو تو ثابت کرو۔ یہی وہ مقام ہے جو دراصل حق کو مطلوب تھا۔ اس طرح حضرت ابراہیم نے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ابلیس کے ذریعہ پھیلائے اس مکر کبار کی سب سے بڑی مملکت کے سب سے بڑی مقتدر شخصیت کو اس مقام پر لا دیا کہ وہ یا تو ثابت کرے کہ فی الواقع وہ ملکوت کا مالک ہے اس لئے کہ اس کے پاس ملک ہے۔ جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے۔ یا پھر اس سارے نظام پر یہ بات کھل کر واضح ہو جائے کہ یہ سب ابلیس کے مکر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ روئے ارض پر منعقد ہونے والی اس عظیم اور عدیم النظیر معرکہ آرائی کو قرآن نے غیر معمولی طریقے سے یوں پیش کیا ہے:

(۱) قالو احرقوہ وانصروا الھتکم ان کنتم فعلین (الانبیاء ۶۸)

ترجمہ: بولے اس کو جلا ڈالو اور مدد کرو اپنے معبودوں کی اگر کچھ کرنا ہو۔

تصور کیجئے کہ ہزاروں یا لاکھوں لوگوں کا جم غفیر ہے جن کے مابین حضرت ابراہیم نے ان بتوں کو توڑنے کی بات بالواسطہ قبول کی تھی اور ان بے حقیقت بتوں کو پوجنے پر لوگوں کو سخت ملامت کی تھی۔ ہر چند کہ لوگ ان دلیلوں کے سامنے جو حضرت ابراہیم نے پیش کئے گونگے ہو چکے تھے، اور ان کے دل قبول کر رہے تھے کہ کتنی پختہ اور درست بات کہی جا رہی ہے لیکن ابلیس نے انہیں اور بالخصوص ملاء کو اکسایا کہ وہ ان دلیلوں کو پس پشت ڈالیں اور عصبیت کی بنیاد پر اس بات کا فیصلہ کریں۔ چنانچہ ملاء پکار اٹھے اور بادشاہ وقت سے مطالبہ کیا کہ وہ اس شخص کے زندہ جلا دیئے جانے کا فیصلہ صادر کرے تاکہ ان کے معبودوں کی بے عزتی کا بدلہ لیا جا سکے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نظام وقت کے سب سے بڑے بادشاہ کے سامنے پیش کئے گئے۔ بھرے دربار میں آپ نے نہ صرف یہ کہ پیش آمدہ باتوں کی تصدیق کی بلکہ اس کے سامنے اللہ کی توحید کا پیغام پیش کیا اور کہا کہ اللہ واحد رب العالمین ہے۔ اس کے سوا کوئی رب نہیں۔ چنانچہ اس شہادت حق کا ردعمل وہی ہونا تھا جو پیش آیا۔ دنیا کے سب سے بڑے نظام کا مطلق العنان بادشاہ جو فی الواقع خود کو ملکوت کا مالک سمجھتا تھا اس نے کہا کہ میں رب العالمین ہوں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

(۲) الم ترالی الذی حاج ابراھیم فی ربہ (البقرہ ۲۵۷)

ترجمہ: کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے اس کے رب کی بابت۔

بادشاہ نے اپنے کو اس لئے رب کہا کہ اسے ابلیس نے یہی باور کرایا تھا کہ وہ رب ہے اس لئے کہ

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

اس کے پاس ملک ہے۔ اور ملک کا مالک ملکوت کا مالک ہوتا ہے۔

(۳) ان آته الله الملک (البقره ۲۵۷)

ترجمہ: اسی وجہ سے کہ دی تھی اللہ نے اس کو ملک

(۴) اذ قال ابراهیم ربی الذی یحیی ویمیت قال انا احیی وامیت. (البقره ۲۵۷)

ترجمہ: جب کہا ابراہیم نے: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو اس بادشاہ نے کہا کہ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔

(۵) قال ابراهیم فان الله یاتی بالشمس من المشرق فات بها من المغرب (البقره ۲۵۷)

ترجمہ: کہا ابراہیم نے کہ بے شک اللہ تو لاتا ہے سورج کو مشرق سے اب تو لے آ اس کو مغرب سے۔

(۶) فبهت الذی کفر والله لا یهدی القوم الظالمین (البقره ۲۵۷)

ترجمہ: تب حیران رہ گیا وہ کافر اور اللہ سیدھی راہ نہیں دکھاتا ظالموں کو۔

اس صورت واقعہ اور اس کی غیر معمولی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ طوفان نوح کے بعد نئے منہج کے مطابق پھیلائے سب سے بڑے نظام ابلیس کا سب سے بڑا بادشاہ خود اپنے دعوے کے تعلق سے وہاں پہنچا دیا گیا جہاں وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی راہ نہیں بچ گئی تھی کہ وہ قبول کرلے کہ وہ جو کچھ سمجھتا اور دعویٰ کرتا رہا ہے اور جس پر ابلیس نے سارا نظام برپا کر رکھا ہے کہ ملک کا مالک ملکوت کا مالک ہوتا ہے، غلط ہے۔ ملک کا مالک ملکوت کا مالک نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ملکوت کا مالک ہوتا تو سورج کو مغرب سے نکالنے پر قدرت رکھتا۔ لیکن حجت ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہ بات نہیں تھی جس کے لئے حضرت ابراہیم نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ بادشاہ نظام وقت خوب سمجھ چکا تھا کہ پورے نظام اور اس کی اساس کی عزت اب داؤ پر لگ چکی ہے۔ اس صورتحال میں کسی نظام کے مقتدر اعلیٰ سے اسی ردعمل کی توقع کی جا سکتی تھی جس کا فیصلہ بالآخر بادشاہ نے کر دیا۔ بلاشبہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہاں ایک اور کھلی شکست اس کا انتظار کر رہی ہے۔ چنانچہ غصے میں آ کر اور اپنے لرزاں جبروت کو ثابت کرنے کے لئے بادشاہ

prepared by M. Aamir Mehmood
www.astardalam.net

نے وہی فیصلہ دے دیا جس کا مطالبہ اس کے تمام عمائد کر رہے تھے۔ قرآن نے فرمایا:

قالوا ابنو له بنیانا فالقوه فی الجحیم (الصافات ۹۷)

ترجمہ: بولے بناؤ اس کے واسطے ایک عمارت پھر ڈالو اس کو آگ کے ڈھیر میں۔

چنانچہ ایک عظیم و مہیب فرنس (Furnace) تیار کیا گیا اور ہزاروں لوگوں کی آنکھوں کے سامنے حضرت ابراہیم کو اس کی دھکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا۔ ہزاروں لوگوں اور بادشاہ نے دیکھا کہ اس کے فوجیوں نے حضرت ابراہیم کو ایک مہیب بھٹی میں پھینک دیا ہے۔ ایک ایسی بھٹی جس کی دھکتی ہوئی آگ پل بھر میں بڑی سے بڑی چیز کو راکھ کر سکتی ہے۔ بادشاہ بے حد خوش ہوا کہ اس نے بالآخر ثابت کر دکھایا کہ وہ ملکوت کا بھی مالک ہے۔ سارے لوگوں نے بھی دیکھا کہ نظام سے ٹکرانا کتنا مہنگا پڑتا ہے۔ سارے نظام اور بادشاہ نے اطمینان کا سانس لیا اور خوش خوش گھر لوٹ گئے کہ نظام وقت کے اتنے بڑے دشمن کو ان لوگوں نے کیفر کردار تک پہنچا دیا تھا۔ جو تھوڑے سے اہل ایمان تھے ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انجام نے سبھوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

ادھر جب بادشاہ کے حکم سے حضرت ابراہیم دھکتی ہوئی آگ میں پھینکے جا رہے تھے تو حضرت ابراہیم نے لوگوں سے اور بالخصوص بادشاہ سے فرمایا:

قرآن کا ارشاد ہے:

وقال انما اتخذ تم من دون الله اوثانا مودة بینکم فی الحیوة الدنیا ثم یوم القیامة یکفر بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا وما وکم النار ومالکم من نصرین (العنکبوت ۲۵)

ترجمہ: اور ابراہیم بولا جو ٹھہرائے ہیں تم نے اللہ کے سوا بتوں کے آستانے سو دوستی کر کر آپس میں دنیا کی زندگانی میں پھر دن قیامت کے منکر ہو جاؤ گے ایک سے ایک اور لعنت کرو گے ایک کو ایک اور ٹھکانا تمہارا آگ ہے اور کوئی نہیں تمہارا مددگار۔

ظاہر ہے یہ حجت کے آخری کلمات تھے۔ ہر چند کہ حضرت ابراہیم خوب سمجھ رہے تھے کہ وہ حق پر ہیں اور جس بات پر وہ اس عظیم و ہیبتناک سزا کے مستحق قرار دیئے گئے ہیں صرف وہی حق اور یہ سزا دینے والے بر سر غلط ہیں لیکن ان کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور دل سمجھ رہا تھا کہ چند ہی ثانیے بعد

جب وہ اس آگ میں پھینکے جائیں گے تو وہ آگ پل بھر میں انہیں راکھ بنا دے گی۔ لیکن وہ حق پر قائم رہے اور اللہ کی رضا پر راضی ہو گئے کہ اگر اس کلمۂ حق کے اظہار پر انہیں یہ سزا دی جا رہی ہے تو وہ اسے بطیبِ خاطر قبول کرتے ہیں۔ ہاں انہوں نے بادشاہ اور پورے نظام کو آگاہ کیا کہ وہ اس کی پاداش میں اس سزا سے نہیں بچ سکیں گے جو آخرت میں ان کا انتظار کر رہی ہے اور یہی لوگ جو آج ملکوت کے مالک بنے بیٹھے ہیں اور وہ دیوتا جن کا یہ نام لیتے ہیں اور ابلیس آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہونگے اور ایک دوسرے پر لعنت کر رہے ہونگے۔

یہاں تک کہ فوجیوں نے حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینک دیا تو اللہ نے ملکوت میں حکم جاری فرمایا: قرآن کا ارشاد ہے:

قلنا ینار کونی بردا وسلاما علی ابراهیم (الانبیاء ۶۹)

ترجمہ: ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈک ہو جا اور سلام ابراہیم پر

ابھی آپ کو آگ کی لپٹ چھو بھی نہ سکی تھی کہ اس کی سنت بدل گئی۔ ظاہر میں سبھوں نے دیکھا کہ ابراہیم خاکستر ہو گئے لیکن وہاں ابراہیم پوری طرح محفوظ و مامون تھے۔ اگلا دن گزر گیا۔ سارا نظام خوشیاں منا رہا تھا۔ چند اہل ایمان یا وہ لوگ جو حضرت ابراہیم سے ہمدردی رکھتے تھے اس بھیانک انجام کے بعد سکتے میں پڑے ہوئے تھے کہ رات کی تاریکی میں اچانک حضرت ابراہیم علیہ السلام نمودار ہوئے اور تنہائی میں حضرت لوط سے جو ان کے بھتیجے اور ان کے سب سے قریب تھے آن کر ملے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے آپ کو محفوظ رکھا ہے اور یہ کہ اب وہ اللہ کے حکم سے ہجرت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم نے پوچھا کہ کیا لوط ان کا ساتھ دیں گے؟ حضرت لوط نے کہا کہ وہ ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ پوچھا کہ آپ کہاں جائیں گے اور کیا کریں گے؟ چنانچہ حضرت ابراہیم نے جواب دیا:

(۱) وقال انی مهاجر الی ربی انه هو العزیز الحکیم (العنکبوت ۲۶)

ترجمہ: اور وہ بولا: بے شک میں تو مہاجر ہوتا ہوں اپنے رب کی طرف بے شک وہی ہے زبردست حکمت والا۔

(۲) وقال انی ذاهب الی ربی سیهدین (الصافات ۹۹)

ترجمہ: اور بولا: بے شک میں جاتا ہوں اپنے رب کی طرف وہ مجھ کو راہ دکھائے گا

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

حضرت ابراہیم نے جواب دیا کہ انہیں نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہے۔ وہ امید کرتے ہیں کہ ان کا رب ان کو درست جگہ لے جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ کنعان چلے جائیں اور اسے دارالہجرت قرار دیکر مرکز اظہار بنالیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

ونجینه ولوطا الی الارض التی بر کنا فیها للعلمین (الانبیاء ۷۱)

ترجمہ: اور بچا نکالا ہم نے اس کو اور لوط کو اس زمین کی طرف جس میں برکت رکھی ہم نے جہانوں کے واسطے (اقامت اعلاء کلمۂ حق سوم کی تکمیل بعد میں ملاحظہ فرمائیں)

اقامت ہجرت

ہجرت اظہار کی راہ کی ایک جانکاہ مگر عظیم الشان منزل ہے۔ ہجرت سے مراد ہے صرف اللہ کی رضا کے لئے دنیا کی ہر شئے کو چھوڑ دینا جو اللہ رب العزت کی رضا کی تکمیل میں حارج یا اس سے متصادم ہو۔ حضرت ابراہیم وہ پہلے رسول ہیں جنہوں نے اس مفہوم میں اللہ کی راہ میں ہجرت کی۔ آپ سلطنت بابل چھوڑ کر شام میں کنعان چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے لئے دارالہجرت قرار دے دیا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں حادثات کے وقوع کا یہ تسلسل بے حد تیز اور بے حد طویل تھا؟ اس کا فہم دراصل اس بات کو واضح کرتا ہے آپ نے اظہار کے لئے کتنی طویل اور جانگداز جدوجہد فرمائی ہے اور اس راہ میں کیسی جگر سوزی اور جاں کاہی کے مراحل سے گزرے ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

قالو اسمعنا فتی یذکرهم یقال له ابراهیم (الانبیاء ۶۰)

ترجمہ: وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان بتوں کو کچھ کہتا رہتا ہے۔ اس کو کہتے ہیں ابراہیم۔

چنانچہ حضرت ابراہیم کو جب آگ کی بھٹی میں پھینک دیے جانے کا واقعہ پیش آیا اس وقت آپ نوجوانی کی عمر میں تھے اگر تحقیری انداز بیان کی رعایت کی جائے مثلاً تحقیراً بعض سن رسیدہ لوگ اپنے سے کم عمر لوگوں کو حتیٰ کہ تیس پینتیس سال تک کے لوگوں کو بھی 'لونڈا' کہہ دیتے ہیں تو اس رعایت کے ساتھ جب اس وقت آپ کی عمر ۲۰ اور تیس سال کے مابین رہی ہوگی لوگوں کا قول 'فتی' یہی مفہوم رکھتا ہے۔ یہاں سے ایک طویل اور جاں کاہ سفر کا آغاز ہوتا ہے جس میں حضرت ابراہیم نے راہ خدا میں اس استقامت کا ثبوت دیا ہے جس کی دنیا میں نظیر نہیں مل سکتی۔ (یہاں

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.astaralam.net

اس الجھاؤ سے صرف نظر کرنا طوالت سے بچنے کے لئے احسن ہے جو توراۃ کے بیان سے پیدا ہوتا ہے)

حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ پہلے رسول ہیں جنہوں نے راہ 'اظہار' میں ہجرت کی۔ اسلام میں اس ہجرت کے علاوہ کوئی اور ہجرت نہیں۔ چنانچہ ہجرت کا صرف ایک قرآنی مفہوم ہے جس کے درج ذیل شرائط ہیں:

(۱) محض اللہ کی رضا کی تکمیل کے لئے ہر شئے کو ترک کرنا حتی کہ اپنے مسکن (وطن) کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جانا۔

(۲) کسی ایسی جگہ جانا جہاں چھوڑی ہوئی جگہ کے مقابلے میں رضاء الہی کی تکمیل کی نسبتاً زیادہ آزادی اور مواقع میسر ہوں۔

(۳) صرف اس لئے مسکن (وطن) سے دارالہجرۃ منتقل ہونا تاکہ ضروری تیاری کے ساتھ واپس پلٹ کر اس قوت کا خاتمہ کیا جائے اور چھوڑے ہوئے مقام کو لوجہ اللہ واگزار کرایا جائے۔

قرآنی ہجرت کے یہ تین بنیادی شرائط ہیں۔ جس نقل مکانی میں یہ تین باتیں نہ پائی جائیں وہ ہجرت نہیں۔ اس قرآنی ہجرت میں ایک اور شرط ہے لیکن چونکہ وہ خود ان تینوں شرائط کے اندر مفہوم ہے اس لئے اسے الگ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اس وقت ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس مفہوم کو کھول کر بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ چوتھی شرط یہ ہے کہ ہجرت اور اس کے تحت عاید ہونے والی ذمہ داری اور تقاضے کو پورا کرنے کا اطلاق صرف ان لوگوں پر نہیں ہوتا جو براہ راست متاثرین یعنی ہجرت کرنے والے ہیں بلکہ یہ ذمہ داری علی الاطلاق اشتمالی ہوتی ہے۔ یعنی یہ ذمہ داری کل امت مومنہ پر عاید ہوتی ہے۔ اگر واضح طور پر کہا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہجرت اور جہاد لازم و ملزوم ہیں۔ بغیر ہجرت کے جہاد تو ممکن ہو سکتا ہے لیکن ایسی ہجرت جس کا مقصد اولین و آخرین اقامت جہاد نہ ہو سرے سے ہجرت نہیں۔ ہجرت جہاد کا پیش خیمہ اور اسے لازم بنا دینے والی ہے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ ہجرت دراصل اس طویل جدوجہد کا پیش خیمہ تھی جسے جہاد فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔ اس ہجرت کے بعد جس وقت حضرت ابراہیم الفتح سے سرخرو ہوئے اس وقت آپ کی عمر شریف پچاسی سال کی تھی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے ہجرت

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asraram.net

کے بعد جہاد کی کتنی طویل اور جان کاہ مراحل گزارے۔ ایک عام اندازے کے مطابق یہ مدت پچاس پچپن سال کی ہوتی ہے۔

اقامت مقام

اقامت مقام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ غیر معمولی کارنامہ ہے جس پر پوری نوع انسان ان کا ہمیشہ ممنون رہے گا اور ان کے اس عظیم احسان کے تلے دبا رہے گا۔ 'مقام' کا مفہوم ہے کھڑے ہونے کی جگہ۔ لیکن جب اس لفظ کا اطلاق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تناظر میں ہو تو اس کی خاص اصطلاحی معنویت وحیثیت بن جاتی ہے۔ آج اس اصطلاحی معنویت کے کلیتاً مجوب ہو جانے کی صورت تو اس کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کا مفہوم کھول کر واضح کیا جائے لیکن اس عاجز کو خوف ہے کہ اگر اسے قابل لحاظ حد تک بھی زیر بحث لایا گیا تو یہ ذکر اتنا طویل ہو جائے گا کہ کہیں اس سلسلۂ بحث پر نا قابل برداشت بوجھ نہ بن جائے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس کی صرف ضروری تفہیم کر کے سلسلۂ بحث کو جاری رکھا جائے۔

قرآن کا ارشاد ہے:

واتخذوا من مقام ابراھیم (البقرہ ۱۲۵)

ترجمہ: اور بنالو ابراہیم کے (مقاموں میں) سے (اس) مقام کو.........

ہمارے مفسرین کرام اس تعلق سے نہایت بے سروپا بات کرتے رہے ہیں اور خود غور نہیں کرتے کہ وہ نقل کے نام پر کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ صورتحال متاخرین کے یہاں اور بھی وحشتناک ہوگئی ہے۔ چنانچہ اگر کسی مشکل مقام کی تشریح صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیھم اجمعین سے منقول بھی ہے تو کم ہی مفسرین متقدین اسے سمجھ پائے خاص حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس کی باتوں کو اور مفسرین متقدین کی باتوں کو کم ہی مفسرین متاخرین سمجھ پائے اور تحقیق کے فقدان اور نقل کے جبر نے الجھانے میں جو کسر رہ گئی تھی وہ پوری کردی۔ چنانچہ دونوں کی مثالیں اس لفظ کے تعلق سے ملاحظہ فرمائیں:

مفسرین متاخرین: ''مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر خانۂ کعبہ کو تعمیر کیا گیا تھا۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کا نشان ہے اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر حج کی دعوت دی

prepared by M. Aamir Memon

تھی۔ اور وہ جنت سے لایا گیا تھا جیسے حجر اسود'' (موضح فرقان۔ تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی بر ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ)

غور کیا جائے کہ مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر آپ کھڑے ہو کر خانۂ کعبہ بنا رہے تھے یا وہ جگہ ہے جہاں وہ پتھر رکھا گیا تھا۔ اگر پتھر ہے تو لازماً اسے کعبۃ اللہ کے بناتے وقت کعبہ کے چاروں طرف الگ الگ مقامات پر رکھا گیا ہوگا اس صورت میں اصل چیز پتھر ہے نہ کہ وہ مقام جہاں آج وہ پتھر ہے یا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں تھا۔ اس صورت میں حکم 'پتھر کی طرف' ہونا چاہئے۔ اگر مقام ابراہیم سے مراد پتھر نہیں بلکہ وہ جگہ ہے جہاں آپ پتھر پر کھڑے ہو کر کعبۃ اللہ کی تعمیر کر رہے تھے تو کیا کسی ایک مقام پر پتھر پر کھڑے ہو کر کعبہ کی تعمیر ہو سکتی ہے؟ اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ آخر یہ تفصیلات معلوم کہاں سے ہوئیں؟

مفسرین متقدین: ابن جریر طبری نے تقریباً دو صفحات پر مشتمل تفسیر درج کی ہے۔ جس کے چند قابل غور امور نیچے درج کئے جاتے ہیں:

(۱) مقام ابراہیم سے مراد پورا کا پورا حج ہے۔
(۲) عرفہ، مزدلفہ، الجمار سب مقام ابراہیم ہیں۔
(۳) عرفہ، مزدلفہ، منیٰ اور جو کچھ اعمال حج ہیں سب مقام ابراہیم ہیں۔
(۴) پورا مکہ مقام ابراہیم ہے۔
(۵) مقام عرفہ مقام ابراہیم ہے۔
(۶) حرم مقام ابراہیم ہے۔
(۷) مسجد حرام مقام ابراہیم ہے۔
(۸) یہ پتھر کا وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم نے اپنے پاؤں رکھے تھے جسے حضرت اسمٰعیل کی زوجہ نے رکھا تھا اور اس پر آپ کے پاؤں کے نشان آ گئے اور اللہ نے اسے شعار بنا دیا۔

یہ ساری باتیں ابن عباس، عطاء، مجاہد، سدی، شعبی کے حوالے سے کہی گئی ہیں۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام سے جو باتیں لوگوں تک پہنچیں وہ درست تھیں لیکن بہت سی باتوں کے نہ سمجھنے کے سبب بیان کرنے والوں نے اسے کچھ سے کچھ کر دیا۔ اور بعد میں وہ

باتیں مزید کچھ اور ہو گئیں۔

مختصر یہ کہ مقام ابراہیم دراصل وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام خصوصی طور پر اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور اللہ کو پکارا اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کی پکار سنی اور اسی مقام پر انہیں ایک مخصوص بلکہ خاص الخاص فضل اور رؤیت سے نوازا جسے مخصوص قسم کی تجلی اور رؤیت کہی جا سکتی ہے جو اپنی کیفیت کے اعتبار سے حضرت موسیٰ پر ہونے والی تجلی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سدرۃ المنتہیٰ سے پرے ہونے والی رؤیت کے مابین ہے۔ یا بالفاظ دیگر چونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ رؤیت روئے ارض سے پرے ہوئی تھی اس اعتبار سے روئے ارض پر ہونے والی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر وہ تجلی اور رؤیت عالم انسانیت میں سب سے بڑی اور عظیم الشان رؤیت ہے۔ یہ ہے مخصوص اور اصلی مفہوم 'مقام' کا لیکن اس کا اطلاق ان جگہوں پر بھی ہوتا ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور اللہ کو پکارا اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ چنانچہ مفسرین متقدین سے جو باتیں مروی ہیں وہ وسیع تناظر میں اسی مقام سے متعلق ہیں جو اپنی جگہ درست ہیں لیکن یہ توسیع دراصل اس مخصوص صورت پر مبنی ہے جو پہلے مذکور ہوئی۔ چنانچہ روئے ارض پر کم از کم دو ایسے مقامات معلوم ہیں جہاں حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ کی طرف اس مخصوص قسم کی توجہ کی اور پھر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم پر اپنا فضل خاص الخاص کرتے ہوئے اس رؤیت سے سرفراز فرمایا جس میں نہ صرف یہ کہ حضرت ابراہیم کی دعا قبول فرمائی بلکہ ان پر انعام خاص الخاص کی بارش فرمائی۔ قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے۔ کعبۃ اللہ سے متصل ایک مقام ابراہیم کے علاوہ بھی روئے ارض پر اور مقام ابراہیم ہیں۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

واتخذوا من مقام ابراھیم (البقرہ ۱۲۵)

ترجمہ: اور بنا لو ابراہیم کے مقام میں سے

اس عاجز کے علم کی حد تک کعبۃ اللہ سے متصل مقام ابراہیم کے علاوہ دوسرا مقام ابراہیم شخم Shechem میں واقع ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مقام کی اقامت فرمائی اس سے دو باتیں مراد ہیں۔ حضرت ابراہیم سے قبل انبیاء اللہ تعالیٰ کو پکارتے تھے اور گویا دور سے انہیں جواب دیا جاتا تھا۔ حضرت

www.booksube.net
prepared by M. Aamir Mehmood

ابراہیم نے اللہ تعالیٰ کو پکارا اور انہیں نہ صرف یہ کہ قریب سے جواب دیا گیا بلکہ وہ بات یک گونہ رؤیت کے قریب تھی۔ گویا یہ اس کیفیت کی بحالی تھی جو الجنۃ میں آدم وحوا کی تھی۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہوئی کہ آپ کسی سے ملنا چاہیں اور ملاقات کی اجازت نہ ہو ہاں آپ تحریر بھیج سکتے ہیں اور جواب بھی تحریر میں مل جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ تحریر بھیجیں اور ہر چند کہ ملاقات نہ ہو لیکن مرسل الیہ آپ سے انٹرکام پر بات کر لے۔ اس سے آگے تو صرف وہی صورت باقی رہتی کہ وہ تخلیہ میں بالمشافہ آپ سے ملاقات کرے۔ چنانچہ اس اقامت سے پہلی بات یہ مراد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سلسلہ کا آغاز فرمایا یا ان کے ذریعہ اس سلسلہ کا آغاز ہوا تا کہ بنی آدم الجنۃ سے قریب تر صورت میں اللہ تعالیٰ سے پھر ہمکلام ہو اور اللہ تعالیٰ نے حیثیت آدم کی تنزلی کے سبب جس فضل کو روک دیا تھا اسے پھر جاری اور بحال کر دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے روئے ارض پر اس بحالی کو قبول فرما لیا۔ اور حضرت ابراہیمؑ اس سے نوازے گئے۔ دوسری صورت وہ ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ عنقریب آئے گا۔

اقامت ذبح

اقامت ذبح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اگلی عظیم الشان عزیمت تھی۔ آپ نے اللہ رب العزت کے حضور جانوروں کی قربانی پیش کی۔ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گویا اس کا اظہار فرمایا کہ اے اللہ اب میں آپ کی راہ میں ہجرت کر چکا ہوں اور جہاد کا معرکہ درپیش ہے میں آپ کے حضور جانور کی جان کی قربانی اس امتثال میں پیش کر رہا ہوں کہ میں آپ کے حضور اپنی جان بھی پیش کرنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ ہوں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حیات الجنۃ اور حیات ارض کے مابین خون کی ایک دیوار ہے۔ انسان کے رگ و پے میں جو خون رواں ہے اس کی حقیقت سمجھے بغیر حضرات آدم وحوا کے زمین پر آنے کو سمجھنا ممکن نہیں۔ لیکن چونکہ یہ بحث ان شاء اللہ ذبح عظیم کے عنوان کے تحت زیر بحث آئے گی اس لئے سردست ہم اسے یہیں ختم کرتے ہیں۔

اقامت جہاد

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قیادت میں قافلہ حق اس آخری تصادم کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے لئے حضرت ابراہیم کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے اقامت اعلاء کلمۂ حق کروائی پھر اقامت ہجرت پھر اقامت مقام اور پھر اقامت ذبح۔

حضرت ابراہیم اس آگ کی بھٹی سے جب نکلے تو وہ خاموشی سے سلطنت بابل کی سرحدوں سے باہر تشریف لے آئے۔ نظام وقت نے چین کا سانس لیا۔ بلکہ کسی درجے میں اس پر فتح وتمرد کا نشہ طاری ہو گیا اس لئے کہ اس نظام کے سب سے بڑے دشمن کو انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دھکتی ہوئی بھٹی میں ڈال دیا اور سب نے باور کر لیا کہ اس کا جسم ایسی راکھ میں بدل گیا ہوگا جس کا نشان ملنا بھی مشکل ہو۔ ملک کے مالک کی ملکوت پر عملداری کی اس سے زیادہ نمایاں مثال اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس وقت ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ جس شخص کو انہوں نے اس دھکتی ہوئی بھٹی میں ڈالا تھا اور جس کا راکھ ہونا ہزاروں لوگوں نے اپنی آنکھون کے سامنے دیکھا تھا وہ زندہ سلامت ہوگا۔

ادھر حضرت ابراہیم اس ملکوت پر قدرت کے دعویدار نظام کے خلاف جہاد کی تیاریاں کر رہے تھے۔ آپ نے پہلا مرکز شخم (Shechem) کو بنایا اور کام کا آغاز کیا۔ شخم ہی وہ جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے پہلی بار اقامت مقام کروائی۔ یہیں حضرت ابراہیم نے اقامت ذبح کی۔

آپ لوگوں کے مابین جاتے اور انہیں حق کی طرف دعوت دیتے اس طرح تقریباً پچاس سالوں تک آپ نے انصار واعوان تیار کئے۔ جہاد کی یہ تیاری بڑی عجیب وغریب تھی۔ یہ جہاد پہلا جہاد تھا جو زمین پر قائم کیا جا رہا تھا۔ اس جہاد میں اور اس جہاد میں جس کی اقامت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے ایک جوہری فرق ہے۔ ہر چند کہ اس کی تفصیل تو اس کے اپنے مقام پر آئے گی لیکن اس وقت صرف اتنا عرض کرنا کفایت کرے گا کہ اگر چہ یہ دونوں ہی جہاد حربیانہ تھے یعنی دونوں میں ہتھیاروں اور اسلحوں سے جنگ ہوئی تھی اور خون کا بہنا تھا لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد جہاد ملک تھا جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جہاد جہاد ملکوت۔ اگر

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asiaalam.net

اس کی تفہیم کے لئے ایک مثال دی جائے تو بات سمجھ میں آ جائے گی اور وہ مثال ہے غزوۂ بدر الکبری کی۔ غزوۂ بدر الکبری اپنی اصلیت اور حقیقت کے لحاظ سے جہاد ملکوت زیادہ تھا اور جہاد ملک کم۔ چنانچہ حضرت ابراہیم جس جہاد عظیم کی تیاری فرما رہے تھے اور اقامت مقام و اقامت ذبح جس کی تیاریوں کے اہم منازل تھیں وہ جہاد دراصل جہاد ملکوت تھا۔ حضرت ابراہیم کا بادشاہ اور نظام کی بھڑکائی ہوئی آگ میں بے خوف کود جانا بادشاہ اور نظام کے سامنے صرف ایک بہادری یا استقامت کی مثال سمجھی جا رہی تھی لیکن اب تقریباً پچاس سالوں کے بعد وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ اسی شخص کی قیادت میں جس کو انہوں نے جلا ڈالا تھا اور جس کا جلنا ہزاروں لوگوں نے اسی طرح دیکھا تھا جس طرح اپنی ہتھیلی کو دیکھتے ہیں ایک فوج اس عظیم نظام کی فوجوں سے برسر پیکار نبرد آزما ہو رہی تھی۔ بدر میں تین سو تیرہ اصحاب رسول ﷺ ابلیس کی فوج کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ تین سو تیرہ افراد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پندرہ سالوں کی محنت شاقہ کا نتیجہ تھے۔ تاریخ عالم حیرت میں ہے کہ یہ تین سو تیرہ افراد آخر کیا تھے! روئے ارض اب ایسی جمعیت قیامت تک نہیں دیکھ سکتی۔ یہ کیسے لوگ تھے؟ ان کی کیا خاصیت تھی؟ ان کی حقیقت کیا تھی؟ انہوں نے کیا کیا تھا؟ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور گواہی دی:

انہ قد شھد بدرا وما یدریک لعل اللہ اطلع علی اھل بدرا فقال اعملوا ما شئتم فقد وجبت لکم الجنۃ (متفق علیہ)

ترجمہ: یہ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے ہیں اور تمہیں کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے حالات پر مطلع ہوتے ہوئے فرمایا کہ جو چاہو کرو، تمہارے لئے جنت واجب ہو گئی۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے وہ گواہی جو حضرت جبریل نے دی:

عن رفاعۃ بن رافع قال جاء جبرئیل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ماتعدون اھل بدر فیکم قال من افضل المسلمین کلمۃ نحوھا قال وکذلک من شھد بدرا من الملائکۃ (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر حضرت جبرئیل عرض گزار ہوئے: آپ اہل بدر کو اپنے میں کیسا شمار کرتے ہیں؟ فرمایا کہ مسلمانوں میں سب سے افضل یا اس کے مانند کلمہ۔ حضرت جبرئیل نے فرمایا کہ اسی طرح ہم

بدر میں شامل ہونے والے ملائکہ کو شمار کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی پچاس سالوں کی محنت شاقہ اور کنعان سے لیکر مصر تک تگ و دو کر کے تین سو اٹھارہ لوگوں کی ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند جمعیت کھڑی کرلی۔ اصحاب بدر کے طرح یہ تین سو اٹھارہ لوگ حضرت ابراہیم کے وہ اصحاب تھے جو فساد ملکوت حکمی کے خلاف اس جہاد و معرکہ عظیم میں حق کی گواہی دینے والے تھے۔

ایسا لگتا ہے کہ شدہ شدہ یہ بات مشہور ہوگئی کہ وہ شخص جس نے عمائد نظام کو لاکھوں لوگوں کے سامنے اور بادشاہ وقت کو بھرے دربار میں اپنی حجت سے قائل کر دیا تھا کہ 'ملکوت کا مالک صرف اللہ رب العزت ہے' اور 'یہ معبودان باطل نہ ملکوت کے مالک ہیں نہ بادشاہ' اور جسے محض ہٹ دھرمی میں ہزاروں لوگوں کے سامنے دھکتی ہوئی آگ کی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا اور جسے سب نے جلتے ہوئے دیکھا تھا وہ نہ صرف یہ کہ زندہ ہے بلکہ اس نظام کے خلاف لوگوں کو آمادۂ پیکار کر رہا ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ کتنے ہی افراد اور حکومتیں در پردہ اس کی حلیف ہو چکی ہیں۔ اس اطلاع پر ان کے خوف کا کیا عالم ہوا ہوگا۔ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ظاہری بات ہے کہ اس خبر نے اس نظام میں خوف کی لہر دوڑا دی ہوگی۔ چنانچہ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ اس قوت سے لڑنے کے لئے اس نظام نے اپنے حلیفوں کو ایک وفاق کی صورت دے دی جس کی سربراہی ایلام کے بادشاہ کے ہاتھوں میں تھی۔ درج ذیل حکومتوں پر مشتمل یہ وفاق غالباً اس وقت دنیا کی سب سے بڑی قوت کی نمائندگی کرنے والا وفاق تھا:

(۱) مملکت شنار جس کا بادشاہ امرافیل تھا۔
(۲) مملکت ایلسر جس کا بادشاہ اریوخ تھا۔
(۳) مملکت ایلام جس کا بادشاہ خنظر لاؤمر تھا۔
(۴) مملکت گوئی جس کا بادشاہ تدل تھا۔

وہ حکومتیں جن سے حضرت ابراہیم کا یا تو تحالف کا معاملہ تھا یا جو حضرت ابراہیم کی بات مان کر اسلام قبول کر چکی تھی یعنی یہ بات تسلیم کر چکی تھی کہ 'ملک کا مالک ملکوت کا مالک نہیں' 'ملک اور ملکوت دونوں کا مالک صرف اللہ رب العزت ہے' وہ درج ذیل ہیں:

(۱) مملکت مصر

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asreralam.net

(۲) مملکت سدوم جس کا بادشاہ بیرا تھا
(۳) مملکت گمورہ جس کا بادشاہ برشا تھا
(۴) مملکت ادمہ جس کا بادشاہ شناب تھا
(۵) مملکت زبوئیم جس کا بادشاہ شمیبر تھا
(۶) مملکت زاوٗر جس کا بادشاہ بیلا تھا

یہ بات حتمی طور پر کہی نہیں جا سکتی کہ کئی دیگر اقوام مثلاً (۱) رفائیم (۲) زوزیم (۳) ایمیم (۴) حوریئین (۵) عمالقہ (۶) عموریئین حضرت ابراہیم کی حلیف تھیں یا نہیں۔ ممکن ہے آپ کی دعوت ان ملکوں اور قوموں میں بھی پھیل چکی ہو۔

فتح مبین

بہرحال مملکت ایلام کے بادشاہ خضرلاؤمر کی سربراہی میں نظام باطل کا عظیم لشکر بالآخر مملکت سدوم، مملکت گمورہ، مملکت ادمہ، مملکت زبوئیم اور مملکت زاوٗر پر حملہ آور ہوا جو حضرت ابراہیم کی حلیف حکومتیں تھی جہاں حضرت ابراہیم نے اپنے نمائندہ حضرت لوط علیہ السلام کو مقرر کر رکھا تھا۔ شروع میں اس وفاق نے نہ صرف یہ کہ بے حد کشت و خون کیا بلکہ حضرت ابراہیم کی ان حلیف مملکتوں کو بری طرح کچل ڈالا اور حضرت لوط کو گرفتار کر کے لے جانے لگے۔ یہی وہ گھڑی ہے جب حضرت ابراہیم اس فوج قاہرہ سے ٹکرا جانے کو تیار ہو گئے۔ چنانچہ آپ اپنے تین سو اٹھارہ اصحاب کی فوج کے ساتھ نکل پڑے۔ دمشق کے شمال میں مقام حوبہ میں ان کے ساتھ آمنا سامنا ہوا۔

حالات و کوائف سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ گھڑی ویسی ہی تھی جیسی غزوۂ بدرالکبریٰ کی۔ اللہ کے رسول حضرت ابراہیم اپنی تین سو اٹھارہ اصحاب پر مشتمل فوج کے ساتھ وقت کے سب سے بڑے وفاق الممالک کی فوجوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ عجیب نظارہ ہوگا۔ ایک شخص جس کو ہزاروں افراد نے اپنی آنکھوں کے سامنے دھکتی ہوئی بھٹی میں جھونکے جاتے ہوئے اور جل کر مرتے ہوئے دیکھا تھا آج وہ زندہ سامنے کھڑا ایک فوج کی کمان کر رہا تھا۔ یقیناً غیر اللہ کے واہمہ میں مبتلا اس وفاق الممالک کی فوج نے یہی سوچا ہوگا کہ یہ کوئی مافوق

الفطرت وجود ہے جس سے لڑا نہیں جا سکتا۔ اس سے لڑنا موت کو دعوت دینا ہے۔ اس لئے کہ یہ تو مرنے سے رہا اور جو مارا نہیں جا سکتا اس کی ضرب سے بچا بھی نہیں جا سکتا۔ چنانچہ جنگ سے قبل ہی پوری فوج ہار چکی تھی۔ اور ان لوگوں نے سپر ڈال دیئے۔ یہ ایک شکست فاش تھی۔ کوئی صلح نہیں۔ وفاق الممالک کی وہ پوری فوج قاہرہ سپر انداز ہو چکی تھی۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ حضرت لوط رہا ہو گئے بلکہ سدوم، گمورہ، ادمہ، زبوئیم اور زاؤر کے سارے قیدی اور مال و اسباب جو لوٹ لئے گئے تھے واگزار ہو گئے۔

چنانچہ یہ وہی منظر تھا جو فتح مکہ کے دن تھا۔ جو حضرت ابراہیم کو ملک سے نکالنے والے تھے، جو انہیں آگ کی بھٹی میں ڈالنے والے تھے آج وہی ان کے رحم و کرم پر تھے۔

غلبۂ عام

قرآن عظیم نے اللہ تعالیٰ کی سنت بیان کرتے ہوئے اور خبر دیتے ہوئے فرمایا: کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی (المجادلہ ۲۱)

ترجمہ: اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب ہوں گے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس عزیمت عظمیٰ کے بدلے فتح مبین سے نوازا۔ آپ کا جہاد نہ مملکت کی جنگ تھا نہ 'ملک' کا جہاد۔ اس لئے آپ اور آپ کی فوج کی مثال فرشتوں کی اس فوج کی ہے جو زمین کے فساد کو ختم کرنے کے لئے اتری ہو اور فساد اور وجہ فساد کے قلع قمع کے بعد واپس چلی گئی۔ چنانچہ آپ کو نہ مال غنیمت سے مطلب تھا نہ کسی اور منفعت سے۔

اس فتح مبین نے پوری روئے ارض پر دراصل یہ ثابت کر دیا کہ ابلیس کے برپا کردہ فساد ملکوت حکمی کی کوئی حقیقت نہیں۔ 'ملک کا مالک ملکوت کا مالک نہیں ہوتا'۔ بلکہ ملک اور ملکوت سب پر اللہ واحد و قہار کی حکمرانی ہے وہی موت اور حیات کا مالک ہے۔ اسی کے اشارے پر کائنات رواں اور دواں ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ کسی کو اسکی کائنات میں کوئی قوت اور قدرت حاصل نہیں الا یہ کہ خود اللہ نے کسی کو کوئی قوت دی ہو۔

حضرت ابراہیم نے آگ کی آزمائش پر پورا اتر کر یہ ثابت کیا کہ ظاہری منبع فساد ملکوت

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asarealam.net

حکمی یعنی بادشاہ اور اس کا رب العالمین بن کر لوگوں کی موت و حیات کا مالک بننے کا دعویدار ہو جانا محض بے حقیقت اور لغو ہے۔ ملکوت پر حکم رانی کا دعویٰ کرنے والا بادشاہ اور اس کا نظام اپنی پوری قوت اور جبروت کا استعمال کر کے بھی ایک شخص کو آگ میں جلا نہیں سکا۔ اور آج وہی جلانے والے اور اس کے اعوان و انصار اپنی پوری فوج کے ساتھ اس شخص کے رحم و کرم پر تھے۔

حضرت ابراہیم کا اگلا اقدام تھا باطنی منبع فساد ملکوت حکمی یعنی منبع شرک غیر اللہ کو عملاً بے حقیقت ثابت کرنا۔

اس معرکے کے نتیجے میں حضرت ابراہیم نے ان بادشاہوں اور حکمرانوں پر باور کرایا کہ انہیں ابلیس نے جن خام خیالیوں میں مبتلا کر رکھا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ بھی معبودان کا وجود ہے اور وہ اللہ کے ملکوت میں دخیل اور صاحب قوت ہیں۔ ان کی بات سنی اور مانی جاتی ہے۔ اور یہ کہ وہ بادشاہ ان کے بیٹے، نمائندے یا چہیتے ہیں۔ آج حضرت ابراہیم نے سبھوں کی آنکھوں کے سامنے ان بادشاہوں پر واضح کر دیا کہ اللہ کے سوا کوئی قدرت رکھنے والا نہیں۔ کسی معبود غیر اللہ کا وجود نہیں۔ یہ محض دھوکا ہے۔ کسی کو اللہ کی ملکوت میں کوئی عمل دخل نہیں۔ اللہ ہی سب کا مالک ہے۔ اور ملکوت اسی کا ہے۔

یہ ہے وہ عظیم کارنامہ جو تاریخ انسانی کی چوتھی عظیم جست (The Fourth Quantum Jump) کہلاتا ہے۔

پندرہ سولہ سال کی عمر سے پچاسی سال کی عمر تک فساد ملکوت حکمی کے لق و دق اور بے سنگ میل صحرا میں یہ سفر اور اس میں ان تھک جد و جہد کی یہ وہ داستان ہے جو آج اس مقام پر پہنچ گئی جہاں نوح علیہ السلام سے کیے گئے میثاق کو اس کے بیٹے ابراہیم نے پورا کر دیا۔ نسل آدم نے ایک عظیم جست (The Quantum Jump) لے لی تھی جس نے حیثیت آدم کو وہ جست دلا دی جسے Space Barrier سے گزر جانا کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم نے آباد زمین کے اس کنارے سے اس کنارے تک اس ابلیسی فساد کا خاتمہ کر دیا تھا جسے فساد ملکوت حکمی یعنی فساد شرک کہا جاتا ہے۔

جست چہارم

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بالآخر ابلیس کے اس منبع فساد ملکوت حکمی یعنی فساد شرک

prepared by M. Aamir Mehmood
www.urdunovels.net

کو ہر اعتبار سے درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ یہ اس میثاق کی تکمیل تھی جسے اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام سے کیا تھا۔ حیثیت آدم کی بحالی کی یہ چوتھی عظیم جست (The Fourth Quantum Jump) تھی۔ اس جست نے آدم کی حیثیت کو وہاں پہنچا دیا جہاں حضرت آدم وحوا الجنہ میں گناہ اور خطا سے قبل تھے۔ یعنی عملاً روئے زمین پر ہوتے ہوئے اپنی حالت کے اعتبار سے آدم کی پھر وہی حیثیت ہوگئی جو گناہ سے قبل تھی۔ (ملاحظہ فرمائیں نقشہ ھبوط وترقی آدم) گویا آدم وحوا ہر گناہ سے پاک وصاف اس حالت میں ہوں جسے 'یا آدم اسکن انت **وزوجک الجنة وکلا منها رغدا حیث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتکون من الظالمین**' (اے آدم جا کر رہ تو اور تیری زوج الجنہ میں اور کھا اس میں جو چاہو جہاں سے چاہو اور پاس مت کرنا اس شجرہ کو ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے ظالم) کی حالت کہتے ہیں۔ چنانچہ بیک وقت تین باتیں روئے ارض پر واقع ہوگئیں۔ پہلی تبدیلی منہج، دوسری میثاق نو اور تیسری انعام وتفویض:

(۱) تبدیلی منہج: چونکہ حضرت ابراہیم نے ابلیس کے اس منہج کو جسے اس نے طوفان نوح کے بعد اختیار کیا تھا شکست فاش دے دی تھی لہذا اب اس شکست کے بعد ابلیس نے نئے منہج کی بنیاد ڈالی۔

(۲) میثاق نو: ابلیس کے نئے منہج کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے نئی نوع انسان کی طرف سے نیا میثاق لیا۔ جسے حضرت ابراہیم نے قبول فرمایا۔

(۳) انعام وتفویض: ابلیس کے سابقہ منہج کو تباہی سے دوچار اور نئے میثاق کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو نئے انعامات اور تفویض سے نوازا۔

ان شاء اللہ ان سب امور کا ذکر عنقریب کیا جائے گا۔

www.booksube.net
prepared by M. Aamir Mehmood

حصہ دوم

منہج چہارم: فساد ملک ارض یا فساد ملک

دور اول

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ہر ناکامی اور شکست کے بعد ابلیس کا طریقہ کار رہا ہے کہ وہ سابقہ منہج کو تبدیل کر کے اور ایک نئے منہج کے ساتھ پھر معرکہ خیر و شر کے میدان میں جنگ کو آگے بڑھاتا ہے۔ دوسری جانب اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ ہر جست عظیم کے بعد آدم قوی تر ہوئے اور ابلیس کمزور تر۔ آدم کے قوی تر ہونے سے مراد ہے ان کی حیثیت کا حالت ارضی سے ترقی کرنا اور حالت الجنہ سے قریب تر ہوتا جانا اور ابلیس کے کمزور تر ہونے سے مراد ہے اپنے دعوے کے اعتبار سے اس کی زمینی یا واقعاتی حقائق (Ground Realities) کا کمزور تر ہو جانا۔

طوفان نوح کے بعد ابلیس نے جو منہج اختیار کیا تھا وہ منہج فساد ملکوت حکمی، فساد فی توحید اللہ یا فساد شرک تھا جس کا مفہوم ہے:

’جو ملک کا مالک ہے وہ ملکوت کا مالک ہے‘

یہ منہج بالآخر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں تباہی کا شکار ہو کر درہم برہم ہو گیا۔ ابلیس کے منہج کی اسی تباہی نے دو نتائج برآمد کئے:

(۱) آدم کی حیثیت مزید بحال ہو گئی۔

(۲) ابلیس کی واقعاتی صورتحال مزید کمزور ہو گئی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے ہاتھوں اس وقت آدم کی حیثیت کی بحالی کی حقیقی صورتحال کیا تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ بحالی انقلابی بحالی تھی جس کے درج ذیل عواقب اور مضمرات مرتب ہوئے۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.urduadab.net
www.asiaurdu.net

(۱) حضرت ابراہیم کی اس جست نے آدم کو روئے ارض سے ہمیشہ کے لئے نکال کر الجنہ کی اس حالت میں پہنچا دیا جہاں حضرات آدم و حوا گناہ سے قبل تھے یعنی روحانی اور طبعی ہر دو شعبوں کا قصور و فساد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

(۲) اس جست سے بحالیٔ حیثیت کا مرحلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور ترقی و ارتقاع کا وہ مرحلہ شروع ہوا جو اس وقت الجنہ میں جاری رہتا اگر آدم و حوا سے غلطی سرزد نہ ہوئی ہوتی۔ یعنی گناہ کے سبب جس طویل زمینی سفر کا آغاز ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔

اسی طرح ابلیس کی واقعاتی صورتحال میں مزید کمزوری اور انحطاط آ گیا۔ ہر چند کہ اس کی بہتنا کی اور شدت جنگ بڑھ گئی لیکن اب وہ پہلے کے مقابلے میں کمتر سطح پر اور کمتر امور کے لئے جنگ آزما ہو رہا تھا۔ یہ جدا بات ہے کہ اس کی یہ جنگ اسی عنوان کے تحت ہو رہی تھی اور زیادہ بھیانک طریقے سے ہو رہی تھی جسے 'معرکۂ خلافت' کہا جاتا ہے۔ اس بات کی تشریح و توضیح ایک اور طریقے سے کی جا سکتی ہے۔ یہ ابلیس کا انتخاب اور Prerogative ہے کہ وہ معرکۂ خیر و شر یعنی معرکۂ خلافت کے لئے کیسی جنگ چھیڑے، کن ہتھیاروں سے اور کن میدانوں میں جنگ کرے۔ چنانچہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بنی آدم سے ابلیس کے اس منتخب کردہ یا اختیار کردہ منہج کو سامنے رکھ کر میثاق لیتا ہے اور میثاق کا پورا کرنا یہ ہے کہ ابلیس کے اسی اختیار کردہ طریقۂ جنگ، زیرِ استعمال ہتھیاروں اور اسلحوں اور اس کے منتخب کردہ میدان میں اسے شکست دی جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں شکست کھانے اور منہج فسادِ ملکوت حکمی کی تباہی کے بعد ابلیس نے جو منہج اختیار کیا وہ تھا: منہج فسادِ ملک جس کا مفہوم تھا:

'جو زمین کا مالک ہے وہ ملک کا مالک ہے'

یقیناً یہ 'منہج فسادِ ملک' ماقبل کے 'منہج فسادِ ملکوت حکمی' کے مقابلے میں کمتر اور نچلی سطح کا منہج تھا لیکن اپنی شدت، وسعت اور ہمہ گیر شمولیت کے اعتبار سے زیادہ خطرناک تھا۔ ابلیس کے اس نئے منہج کی حقیقت اور اس کی روح کیا تھی؟

غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ منہج فسادِ ملکوت حکمی کی تباہی سے اس معرکۂ خیر و شر کا عملاً خاتمہ ہو گیا جسے اپنی وسعت کے اعتبار سے کائناتی معرکہ کہا جا سکتا ہے۔ ہر چند کہ ابلیس اب بھی وہی کائناتی لڑائی لڑ رہا تھا لیکن اب پوری کائنات میں اس کی فوج اور اس کی صفیں برہم ہو چکی تھیں۔

prepared by Mr. Aamir Mehmood

اور اس کی بچی کھچی لڑائی کا میدان لے دے کر بس روئے زمین کی ایک مخصوص صورتحال رہ گئی تھی۔ چنانچہ آدم کی اس چوتھی جست کے بعد اور حیثیت آدم کے ماقبل گناہ کی صورت میں الجنہ میں بحالی کے ساتھ ہی اس جنگ کا آغاز ہوا جسے آپ کئی ناموں سے پکار سکتے ہیں:

(۱) معرکۂ فساد ملک: The Conflict of Perversion of Authority

(۲) معرکۂ ملکیت زمین The Conflict of Proprietorship of the Land

(۳) معرکۂ حقیت زمین The conflict of Authority on Earth

(۴) معرکۂ حقیت برانسان The Conflict of Authority on Mankind

اس نئے منہج کے ساتھ اب لڑائی ،خلافت اللہ، کی نہیں بلکہ ،ملکیت زمین، حقیت زمین اور حاکمیت برزمین، کی لڑائی یعنی 'خلافت اللہ' کی نہیں بلکہ 'امامت ناس' کی لڑائی بن گئی۔ ہر چند کہ ابلیس یہ لڑائی اپنے سابق دعویٰ خلافت کے عنوان سے ہی لڑ رہا تھا لیکن اس کی واقعی صورتحال (Ground Realities) بدل چکی تھی۔ اس منہج کی بنیاد یہ تھی کہ 'ملک' (Authority) کس کا ہے؟

ابلیس نے اس فساد کی بنیاد اس پر رکھی کہ جو زمین کا مالک ہے یعنی جس کا زمین پر قبضہ ہے وہی ملک یعنی (Authority) کا مالک ہے۔ زمین اس کی ہے اور اس زمین اور اس کے اندر اور اس کی فضا میں پائی جانے والی ہر چیز پر اسی کا اختیار ہے یہاں تک کہ اس زمین پر بسنے والی انسانی آبادی کا وہی حاکم اور مالک ہے۔ چنانچہ قانون اسی کا چلنا چاہئے۔ مختصر ابلیس کے اس نئے منہج فساد کی روح اس میں مضمر تھی کہ جس کے قبضہ میں زمین ہے 'ملک' (Authority) اسی کا ہوتا ہے یعنی

'جو زمین کا مالک ہے وہی ملک کا مالک ہے'

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم کامیابی اور اس کے نتیجے میں ابلیس کے ذریعہ تبدیلیٔ منہج کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توسط سے ایک نیا میثاق لیا۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarulalem.net

یہ میثاق بڑا معنی خیز تھا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

واذا بتلی ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماما
(البقرہ ۱۲۴)

ترجمہ: اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کلمات سے تو اس نے انہیں پورا کر دیا تو (اس کے رب نے) کہا کہ بے شک میں (اب) تم کو بناؤں گا انسانوں کا امام۔

یہی وہ میثاق ہے جس کا ذکر سورۃ الاحزاب آیت ۷ میں کیا گیا ہے۔ اللہ رب العزت کو خوب معلوم تھا کہ ابلیس نے منہج فساد ملکوت میں ناکامی کے بعد منہج فساد ملکوت حکمی کا آغاز کیا تھا اور اب اس کی ناکامی کے بعد اس نے جس منہج کے روبہ عمل لانے کا ارادہ کیا ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ ابلیس اس کے تحت پوری روئے زمین پر لڑائی کی آگ بھڑکانے والا ہے۔ یہ لڑائی زمین پر قبضہ اور اس پر ملک یعنی اتھارٹی (Authority)، قوت حاکمہ اور قوت نافذہ کی لڑائی ہو جائے گی۔ اس لڑائی کے ذریعہ ابلیس گویا یہ ثابت کرنا چاہے گا کہ زمین کا اصلی خلیفہ وہی ہے۔ چنانچہ یہ لڑائی زمین کی لڑائی، زمین پر قبضہ کی لڑائی، زمین پر حکم چلانے کی لڑائی، زمین پر قانون نافذ کرنے کی لڑائی، ملک، ملک کے مرکز قوت، ملک کے حدود، ملک کی قوت نافذہ، ملک کے مالک اور ملک کے تناظر میں نافذ کردہ قانون سے انکار کرنے والوں کی لڑائی کی صورت اختیار کر لے گی۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے اسی تناظر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توسط سے تمام بنی آدم سے میثاق لیا:

'ملک اللہ کا ہے۔ اور کوئی اس کا شریک نہیں۔'

'الملک للہ' 'ان الحمد والنعمة والملک لاشریک لک'

حضرت ابراہیم علیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام نے اس میثاق کو قبول فرمایا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس قبولیت کے بعد تفویض فرمائی:

انی جاعلک للناس اماما (البقرہ ۱۲۴)

ترجمہ: بے شک میں بنانے والا ہوں تجھ کو انسانوں کے لئے امام۔

حضرت ابراہیم نے اس عظیم ذمہ داری کے اٹھانے کے لئے ہمت، طاقت اور مدد کی دعا فرمائی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک عظیم بشارت سے سرفراز فرمایا:

فبشرنہ بغلام حلیم (الصافات ۱۰۱)

ترجمہ: پھر خوش خبری دی ہم نے اس کو ایک تحمل والے لڑکے کی۔

چنانچہ حضرت ابراہیم نے نئے میثاق کے تحت ابلیس کے منبع فساد ملک کی بیخ کنی کی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ اس وقت آپ کی عمر شریف پچاسی سال سے تجاوز کر گئی تھی۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہدیٰ کے مطابق آپ نے کام کا آغاز کیا۔ ابتداءً یہ کام دورویہ (Two - Pronged) تھا جو چند ہی سالوں میں سہ رویہ (Three-Pronged) شکل اختیار کر گیا۔

اقامت ملک

جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر شریف چھیاسی سال ہو چکی تھی۔ آپ نئے میثاق کے تحت اس عمر میں اقامت 'ملک اللہ' کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی پھر آزمائش کی۔ اس بار اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ حضرت ابراہیم معرکۂ خیر و شر کے اس مرحلے کے مرکز خیر کی تعمیر کے لئے کمربستہ ہو جائیں اور اس کے لئے ایک عظیم قربانی پیش فرمائیں۔ اور وہ قربانی تھی آئندہ معرکۂ ملک کے مرکز کی تعمیر کے لئے اس اکلوتے بچے کو جسے حضرت ابراہیم نے چھیاسی سال کی عمر میں پایا تھا اللہ کے حوالے کر دینا۔ چنانچہ حکم ملتے ہی آپ حضرت ہاجرہ اور شیر خوار حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کو لیکر الخلیل سے ہزاروں میل دور جنوب میں صحرائے عرب میں وہاں تشریف لے گئے جہاں آج کعبۃ اللہ ہے۔ اس وقت وہ علاقہ لاکھوں مربع کیلومیٹر پر ایک لق و دق صحرا تھا جہاں انسانی آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔

تفویض الی اللہ تعیین بیت اور تسکین ذریت

حضرت ابراہیم ملک شام سے سفر کر کے اس لق و دق صحرا میں پہنچے اور زمین پر اقامت ملک اللہ کا آغاز فرمایا۔ آپ اپنی لونڈی حضرت ہاجرہ اور ان سے اپنے واحد لخت جگر حضرت اسمعیل علیہما السلام کو اس صحرا میں جہاں کسی انسان کا وجود نہ تھا اللہ کے حکم سے اللہ کے حوالے کر کے واپس ملک شام روانہ ہو گئے۔ عزیمت کے اس عدیم النظیر اور دل دہلا دینے والے واقعے کی جو تصویر کشی بخاری کی ایک حدیث میں ملتی ہے وہ قابل ذکر ہے:

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrealam.net

فرمایا عبداللہ بن عباس نے: عورتوں میں سب سے پہلے حضرت ہاجرہ نے کمر پٹہ باندھا۔ ان کی غرض یہ تھی کہ حضرت سارہ ان کا سراغ نہ پائیں (کہ وہ حمل سے ہیں)۔ پھر حضرت ابراہیم حضرت ہاجرہ اور انکے بچے (اسمٰعیل) کو (صحرائے عرب میں اس مقام پر) لے آئے (جسے آج مکہ کہتے ہیں)۔ حضرت ہاجرہ حضرت اسمٰعیل کو دودھ پلاتی تھیں۔ حضرت ابراہیم نے ان دونوں کو ایک بڑے درخت کے تلے بٹھادیا جو اس مقام پر تھا جہاں زمزم ہے مسجد کے بلند جانب میں۔ اس وقت مکہ میں آدمی کا نام ونشان نہ تھا۔ نہ وہاں پانی موجود تھا۔ حضرت ابراہیم نے دونوں کو وہاں بٹھادیا اور انکے پاس ایک تھیلہ کھجور اور ایک مشکیزہ پانی کا رکھ دیا اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔ حضرت اسمٰعیل کی والدہ (حضرت ہاجرہ) ان کے پیچھے لپکیں اور پکارا اے ابراہیم! ہم دونوں کو اس وادی میں چھوڑ کر جہاں نہ آدم زاد ہے نہ کوئی چیز۔ تم کہاں جارہے ہو؟ کئی بار حضرت ہاجرہ نے پکار پکار کر کہا لیکن حضرت ابراہیم نے (جواب دینا تو کجا) مڑکر دیکھا تک نہیں۔ آخر حضرت ہاجرہ نے ان سے پکار کر پوچھا:

'کیا اللہ کا ایسا ہی حکم ہے؟'

(تب) حضرت ابراہیم نے جواب دیا: ہاں!

تب حضرت ہاجرہ نے کہا پھر تو پروردگار ہمیں ہلاک نہیں کرنے کا۔ یہ کہہ کر حضرت ہاجرہ لوٹ آئیں۔ اور حضرت ابراہیم آگے بڑھ گئے۔ جب وہ اس پہاڑی پر پہنچے جہاں سے وہ دونوں دکھائی نہیں پڑتے تھے تو آپ نے ادھر رخ کیا جہاں اب کعبہ ہے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کی: اے پروردگار! میں نے اپنی ذریت کو ایک بے آب وگیاہ وادی میں تیرے محترم بیت کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار، یہ میں نے اس لئے کیا کہ یہ لوگ صلوٰۃ قائم کریں لہذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے شاید کہ یہ شکر گزار بنیں'

(بخاری: کتاب بدء الخلق)

اس طرح حضرت ابراہیم نے اللہ کے حکم سے ابلیس کے منبع فساد ملک کے قلع قمع کے لئے تین اقدامات فرمائے جو درج ذیل ہیں:

(۱) **تفویض الی اللہ:** چنانچہ حضرت ابراہیم نے اپنی واحد اولاد حضرت اسمٰعیل کو شیر خوارگی کی حالت میں اس لق ودق صحرا میں اللہ کے حوالے کر دیا۔ حضرت اسمٰعیل کو شیر خوارگی کی

www.bookstube.net www.urdutube.net prepared by M. Aamir Mehmood www.urdumovies.net

حالت میں لق ودق صحرا میں چھوڑ دینا ایک قسم کا ذبح اور قربانی تھی۔ اسے اس طرح سمجھا جائے کہ اگر حضرت جبرئیل تشریف نہ لاتے اور زندگی کا سامان نہ کرتے تو گویا حضرت اسمٰعیل مر جاتے۔ اب اس صورت میں ان کی زندگی کا جو سامان ہوا اور اس سے قبل حیات کا جو فیضان ہوا وہ گویا ایک نئی زندگی تھی اس طرح دراصل حضرت اسمٰعیل کو ایک نئی زندگی ملی۔ اس زندگی کی سطح پہلی زندگی کی سطح نہیں تھی۔ بلکہ آپ عالم بشریت میں ہوتے ہوئے حیات کے اعتبار سے عالم عصر میں آگئے۔ نوع آدم کی حیثیت میں یہ ایک عمودی چھلانگ (Vertical Jump) تھی[۱۸]

(۲) **تعیین بیت محرم:** وہ مقام جہاں حضرت ابراہیم نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کو صحرا کے بیچوں بیچ چھوڑا تھا اور جہاں آج کعبۃ اللہ ہے وہ مقام روئے ارض پر حضرت آدم وحوا کی آبادکاری کے وقت ہی 'بیت اللہ محرم' بنادیا گیا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے بعد میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسریٰ اور پھر معراج ہوئی۔ یہ وہی جگہ ہے جو زمین پر سیدھی عرش کے نیچے ہے۔ حضرت ابراہیم نے فساد ملک کے قلع قمع کے لئے روئے ارض پر اس 'بیت محرم' کو مرکز اور راجدھانی قرار دیا۔

(۳) **تسکین ذریت:** اس مرکز زمین کو معرکۂ فساد ارض میں حق کی راجدھانی اور روئے ارض پر اللہ کے 'ملک' کی علامت قرار دینے کے لئے حضرت ابراہیم نے اس کی تعمیر کا آغاز فرمایا اور اس کے پہلے اقدام کے طور آپ نے اپنی ذریت کو وہاں بسا کر اللہ کے حوالے کر دیا۔

(۴) **تلقین حرا:** اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی اس عظیم قربانی اور عزیمت کو شرف قبول بخشا اور آپ کی چھوڑی ہوئی ذریت پر اس کے فضل عمیم کا آغاز ہوا۔ یہ فضل عمیم دراصل مرحلۂ فساد ملک کی جنگ میں ابراہیم کی پیش کش کی قبولیت پر ظاہر ہونے والی ایک آیت باہرہ تھا جس کا ظہور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوا۔ اس آیت باہرہ کے ظہور کو تعیین و تلقین حرا کہا جاتا ہے۔ 'حراء' روئے ارض پر اللہ تعالیٰ کا وہ فضل خاص ہے جو صرف حضرت ابراہیم اور حضرت ہاجرہ کی عزیمت اور خود سپردگی کے سبب پورے بنی آدم پر ہوا۔ اس کا مفہوم ہے 'وہ مقام جہاں اللہ اپنے بندے کو مستقل دیکھتا ہے اور اس کی زندگی کی اسے ضمانت دی جاتی ہے' روئے ارض پر 'حرا' کا مقام اس فضل خاص سے بھی بڑھکر ہے جو حضرت نوح علیہ السلام پر طوفان سے قبل نصرت خاص کی صورت میں ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

واصنع الفلک باعیننا ووحینا (ہود ۳۷)

ترجمہ: اور بنا کشتی میری نگاہوں کے سامنے اور میری وحی کے مطابق۔

اس فضل خاص کی منظر کشی کرتے ہوئے حدیث شریف میں آیا تھا:

'ادھر حضرت ہاجرہ کا یہ حال گزرا کہ وہ حضرت اسمٰعیل کو دودھ پلاتی اور مشک میں سے پانی پیتی رہیں۔ جب پانی ختم ہو گیا تو خود بھی پیاسی ہوئیں اور بچہ کو بھی پیاس لگی۔ بچہ کو دیکھا تو وہ پیاس کے مارے تلے اوپر ہو رہا تھا۔ (بچے کی یہ تڑپ) ان سے دیکھی نہیں گئی۔ قریب ہی صفا پہاڑ تھا وہ اس پر چڑھ گئیں شاید کوئی آدمی نظر آئے (تاکہ اس سے پانی مانگیں) لیکن کوئی دکھائی نہیں دیا۔ وہاں سے اتریں اور اپنا کرتہ سمیٹ کر وادی کے نشیب میں اس طرح دوڑیں جیسے کوئی مصیبت زدہ دوڑتا ہے۔ وادی کے پار جا کر مروہ پہاڑ پر چڑھیں وہاں بھی دیکھا کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ سات چکر انہوں نے اسی طرح مارے۔ ابن عباس نے کہا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی سبب سے لوگوں نے صفا مروہ کا پھیرا (حج میں) شروع کیا۔ جب (ساتویں پھیرے میں) مروہ پر چڑھیں تو انہوں نے ایک آواز سنی۔ اپنے آپ کہنے لگیں چپ رہ! پھر کان لگایا تو وہی آواز سنی۔ اس وقت پکار اٹھیں (خدا کے بندے) میں نے تیری آواز سنی تو کچھ ہماری مدد کر سکتا ہے تو کر۔ پھر دیکھا تو جہاں زمزم ہے وہاں ایک ملک (حضرت جبرئیل) کھڑا ہے۔ انہوں نے اپنی ایڑی یا پنکھ مار کر زمین کھود ڈالی یہاں تک کہ پانی نکل آیا۔ حضرت ہاجرہ حوض کی طرح اس کو بنانے لگیں، ہاتھ سے اس کے گرد منڈیر کرنے لگیں اور پانی چلو سے لے لے کر مشک میں بھرتی جاتی تھیں۔ جوں جوں پانی لیتی جاتی تھیں وہ چشمہ اور جوش مارتا۔ حضرت ابن عباس نے کہا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اسمٰعیل کی والدہ پر رحم کرے! اگر وہ زمزم کو اپنے حال پر چھوڑ دیتیں یا یوں فرمایا اگر وہ چلو بھر بھر کر (مشک میں پانی) نہ لیتیں تو زمزم ایک بہتا چشمہ رہتا۔ خیر حضرت ہاجرہ نے پانی پیا اور اپنے بچے کو بھی پلایا۔ فرشتے (حضرت جبرئیل) نے ان سے کہا: **لا تخافوا الضیعۃ فان ھھنا بیت اللہ یبنی ھذا الغلام وابوہ فان اللہ لا یضیع اھلہ۔** (بخاری: کتاب بدء الخلق)

حضرت جبرئیل کا قول **لا تخافوا الضیعۃ** ہی تلقین حرا ہے۔ یہ فیضان صرف یہی نہیں کہ حضرت اسمٰعیل کے جان بچا لینے کی بشارت تھا بلکہ انہیں ایک نئی زندگی عطا کرنے کی بھی بشارت تھا۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.urdumoves.net

روح کے اعتبار سے حضرت اسمٰعیل کے جسم بشری میں جو روح تھی وہ مدرج اشیاء میں نفس تھی اور اب وہ اس عارض ہونے والی موت سے جس سے انہیں بچالیا گیا تھا لوٹ کر مدرج عصر میں جسے عالم صورت بھی کہا جاتا ہے متمکن ہوگئی تھی۱۹

اقامت ذبح عظیم

اقامت ذبح عظیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ عظیم الشان عزیمت اور شہادت حق ہے اور بنی آدم پر ایسا احسان عظیم ہے جس کے بوجھ کو عالم انسانیت کبھی اتار نہیں سکتا۔

'ذبح عظیم' کیا تھا اور کس طرح اس کا ظہور ہوا؟ قرآن نے اس کی بڑی واضح تفصیل بتائی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

فلما بلغ معه السعی قال یبنی انی اری فی المنام أنی اذبحک فانظر ماذاتری. قال یابت افعل ماتؤمر ستجدنی ان شاء الله من الصابرین. فلما اسلما وتله للجبین ونادینه ان یا براهیم قد صدقت الرءیا انا کذلک نجزی المحسنین. ان هذا لهو البلٰؤا المبین وفدینه بذبح عظیم وترکنا علیه فی الآخرین سلم علی ابراهیم. کذلک نجزی المحسنین انه من عبادنا المؤمنین

(الصافات ۱۱۱۔۱۰۲)

ترجمہ: وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیم نے اس سے کہا: بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا 'ابا جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالئے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔ آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ذبح کر دیا اور ہم نے ندادی کہ اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزاء دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دیکر اس بچے کو چھڑا لیا۔ اور اس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لئے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیم پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا'۔

اس 'ذبح عظیم' کو اس سے زیادہ بلیغ طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے

کہ حضرت ابراہیم کو اللہ رب العزت نے خواب میں ذبح کی طرف کیوں متوجہ کیا؟ حضرت ابراہیم نے اسے پورا کیوں کردیا؟ حضرت اسمٰعیل ذبح ہونے پر راضی کیوں ہوگئے؟ اس ذبح سے کائنات میں کیا ہوا؟ اور سب سے آخر میں یہ بات کہ یہ ذبح عظیم کیسے ہے؟

ان سارے سوالوں کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ بات جانیں کہ جب حضرات آدم وحوا گناہ سے قبل الجنہ میں تھے تو ان کا وجود دو چیزوں پر مشتمل تھا (۱) پہلی۔ روح اور دوسری (۲) جسم عنصری۔ وہاں حضرات آدم وحوا سے اللہ تعالیٰ کی یہی رضا تھی کہ وہ الجنہ سے ترقی کر کے مقام محمود تک پہنچیں۔ سوء اتفاق ان سے گناہ سرزد ہوگیا جس نے ان کی روح اور جسم دونوں کو مجروح کردیا۔ یہ گناہ ایک بم کی طرح تھا جس کے انفجار نے روح اور جسم کے پرخچے اڑا دیئے۔ بہت کچھ روح میں منہدم ہوگیا تو بہت کچھ جسم عنصری میں منہدم ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں دونوں جگہ بہت سی خرابیاں اور نقائص پیدا ہوگئے۔

ہم لوگوں نے ابتک اس کی کسی قدر تفصیل دیکھی ہے کہ کس طرح اس روز سے اس وقت تک آدم نے اپنی حیثیت کی بحالی کی جدوجہد کی ہے۔ حضرت ابراہیم نے اس بحالی اور ترقی کی رفتار میں انقلاب لا دیا۔ یہی وہ احسان عظیم ہے جس کے بوجھ سے نوع آدم کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ اس گناہ کے سبب الجنہ میں حضرات آدم وحوا کے وجود میں انفجار ہوا تو ان کے الگ الگ نتائج برآمد ہوئے جو درج ذیل ہیں:

(۱) روح اور اس میں واقع ہونے والے انہدام:

(۱) الجنہ میں حضرات آدم وحوا کی روح عالم عصر میں تھی وہ گر کر اس زمین پر عالم اشیاء میں نفس کی پابند ہوگئی یعنی نفخ نفس میں بدل گئی۔

(۲) الجنہ میں گناہ سے قبل آدم وحوا کا روحانی سفر عالم عصر سے عالم بریۃ کی طرف تھا اور اسے مزید آگے جاکر عالم اصل یعنی مقعد صدق تک پہنچنا تھا۔ اب اس کی سطح مزید نیچے گر کر عالم اشیاء پر چلی آئی لہذا روئے ارض پر اس کا روحانی سفر دراصل عالم اشیاء سے عالم عصر کی طرف ہوگیا۔ اور چند لوگوں کو چھوڑ بقیہ لوگوں پر یہ سفر بھی دشوار تھا اس لئے کہ جسم پر روح کو حاوی کرنا اور اسے مزید اوپر لے جانا اس توسیع کے بعد سب کے لئے آسان نہیں رہ گیا تھا۔

(۳) نفخ کا مقام سر سے اتر کر ریڑھ کی ہڈی کے نچلے سرے پر آ کر ٹھیر گیا۔

(۲) جسم اور اس میں واقع ہونے والے انہدام:

(۱) جسم پر سب سے پہلا اثر یہ مرتب ہوا کہ جسم کی پوشش ختم ہوگئی۔

(۲) جسم کا بنیادی خلا اپنے دوسروں پر مخرج میں بدل گیا یعنی ایک طرف منہ، ناک، کان اور آنکھیں اور دوسری طرف دونوں شرمگاہوں کے مقامات پھٹ کر کھل گئے اور باہر کی طرف نکل آئے یعنی (Protrude) ہوگئے اس طرح الجنۃ کے سابقہ آدمی جسم میں جوارح پیدا ہوگئے۔

(۳) جسم کے اندر ایک اور انفجار ہوا اور ایک اور خلا پیدا ہوگیا جس میں ایک اینٹی جن (Anti-gen) داخل ہوگئی۔ یعنی خون کی رگیں اور شریان اور سب سے اہم دل، جگر اور پھیپھڑے اور ان کے اندر بہتا ہوا خون۔ الجنہ میں یہی خون وہ اینٹی جن (Anti-gen) ہے جو ابلیس کے ذریعہ جسم آدم وحوا میں داخل کیا گیا۔ (اغلب گمان ہے کہ جب حضرت آدم سے حضرت حوا پیدا کی گئیں تو دونوں کے جسم متصل تھے لہٰذا گویا ایک ہی جسم تھے۔ تھوڑے عرصے کے بعد یہ دونوں جسم کلیتاً الگ الگ ہوگئے۔)

یہی وہ انفجار تھا جس نے ایک طرف تو انسانی جسم کو درہم برہم کر کے رکھ دیا اور دوسری جانب اب الجنہ اس کو برداشت کرنے کی اہل باقی نہیں رہ گئی [۲۰]

چنانچہ اس روئے زمین پر روح کی بحالی سے مراد یہ بات تھی کہ روح عالم اشیاء سے الجنہ کے مقام عالم عصر میں منتقل ہو جائے اور مقام روح ریڑھ کے نچلے حصے سے سر (سر سے مراد وہ مقام ہے جہاں الجنہ میں موجود جسم آدم وحوا میں نفخ تھی) کے مقام پر منتقل ہو جائے۔ اور روح کی ترقی یہ ہے کہ بحال ہونے کے بعد وہ عالم عصر سے عالم بریہ اور اس سے آگے جا کر عالم اصل کی طرف عروج کرنے لگے۔

اسی طرح زمین پر رہتے ہوئے جسم کی بحالی یہ تھی کہ جسم آدم اسی ارض پر رہتے ہوئے ان تینوں نتائج کا ازالہ کر لے جو گناہ کے سبب برآمد ہوگئے تھے۔ یہ ازالہ ان کی ہیت، اعمال،

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarulalam.net

نتائج اور مضمرات کے راستے سے ممکن تھے اور ان سب کی اپنی اپنی علامتیں قرار پائیں۔

چنانچہ روحانی بحالی کی ایک روداد تو ہم نے حضرت ابراہیم سے قبل دیکھی۔ حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل کو لق و دق صحرا میں چھوڑ کر دراصل پہلی قربانی دیکر پہلی پاکی حاصل کرلی۔ یہ پاکی اسی طرح حاصل ہوئی جیسے گناہ کے بعد پاکی حاصل کی جاتی ہے۔ مثلاً الجنہ میں ہی اللہ تعالیٰ قابیل کے حمل کو ضائع کردیتا اور اس طرح حضرت حوا اس سے پاک ہو جاتیں۔ یا اسی طرح الجنہ میں ہی حضرات آدم وحوا کے گناہ اور اس کے اثرات مٹا دیئے جاتے۔ یا پھر اس طرح کہ زمین پر آدم وحوا کی روح عالم عصر سے عالم اشیاء میں انحطاط پزیر ہوگئی تھی اس قربانی سے وہ عالم اشیاء سے اٹھ کر پھر عالم عصر میں حالت الجنہ میں بحال ہوگئی ہو۔ دونوں صورتحال کا انجام ایک ہی ہے۔

اس ذبح عظیم کے ذریعہ حضرت ابراہیم نے روح کی بحالی ہی نہیں کی بلکہ اس سے آگے جا کر اسکی ترقی کے سفر کا آغاز کیا اور اس ذبح کے ذریعہ عالم عصر میں بحال روح عالم بریہ میں متمکن ہوگئی۔

یہ ذبح عظیم جسم آدم کو بھی پہلے بحال اور پھر ارتقاء پزیر کرکے وہاں لے گیا جو الجنہ میں سفر کی اگلی منزل تھی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس گناہ کے سبب جسم میں دو خلا پیدا ہوگئے تھے۔ ان میں سے ایک خلا اوپر اور نیچے منہ اور شرمگاہوں کے مابین ہے اور دوسرا خلا اسی سے مربوط خون کی رگوں کا خلا ہے جس میں خون بھر گیا ہے۔ جہاں تک اوپر اور نیچے کے مابین خلا کا تعلق ہے تو اس پر بحث ان شاء اللہ اقامت ختنہ کے ذیل ہوگی۔ ہم یہاں صرف خون کی رگوں والے خلا کو زیر بحث لائیں گے۔

یہاں دو باتوں کا ذکر غور وفکر کرنے والوں اور بطور خاص آفاق وانفس میں غور وفکر کرنے والوں کے لئے مزید آسانی کا باعث ہوگا۔

(۱) پہلی بات: بالکل ابتداء میں عرض کیا گیا تھا کہ الجنہ میں آدم وحوا کو صرف تین احکام دیئے گئے تھے گویا تین کام۔ دو کرنے کے ایک نہ کرنے کا۔ جب انحطاط کے سبب نوع انسانی زمین پر بھیجی گئی تو یہی تین کام تین لاکھ کاموں کی شکل میں توسیع دے دیئے گئے۔ لیکن اس میں بھی اگر خوب غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شریعت کے سارے احکام آدم وحوا کے جسم میں ہونے

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asanalam.net

والے بنیادی طور پر انہیں تین انجبارات اور ان کے عواقب سے ہی متعلق ہیں۔ طہارت، صلوۃ، صوم، حج، زکوۃ، فرائض کسی سے متعلق احکامات پر غور کرلیا جائے۔ گویا اگر یہ انجبار نہ ہوتا تو شریعت کی یہ توسیع بھی نہ ہوتی۔ غور کیا جائے تو شریعت کے اوامر ونواہی اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ وہ اس انجبار کے عواقب کو Contain اور Regulate کرنے کے لئے ہیں۔

(۲) دوسری بات: الجنہ کے جسم میں جو چیز آدم وحوا کے عمل یعنی عملی خلاف ورزی کے علاوہ ہوئی وہ باہر سے کسی چیز کا داخل ہو جانا تھی اور داخل کردہ چیز وہ تھی جس نے آج خون کی شکل لے لی ہے۔

مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شریعت میں مذکور باب المظالم یعنی جنایات کی بنیاد خون ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ غور کرنے والا امر یہ ہے کہ ہر خون خواہ حلال جانوروں کا ہی کیوں نہ ہو وہ حرام ہے۔ اسی طرح خون اور اس کا قریب ترین متبادل دودھ ہر دو حرمت کی بنیاد آخر اس کی کنہ کیا ہے؟ اس پر غور وفکر اس بحث کو مزید واضح کر دے گا ان شاء اللہ۔ اس ذبح عظیم کی حقیقت جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اس زمین اور خون کی حقیقت اور ان کے مابین تعلق پر غور کیا جائے۔

شریعت کی نظر میں روئے ارض پر شرک کے علاوہ تین عظیم ترین گناہ ہیں:

(۱) قتل نفس: یوں تو روئے ارض پر قتل نفس کی متعدد شکلیں پائی جاتی ہیں لیکن ان سب کی بنیاد دراصل قتل ہے جس کا براہ راست تعلق سفک دم یعنی خون بہانے سے ہے۔ سانس کا رشتہ کسی طرح منقطع ہو، جسم میں خون، اس کے اعمال اور اسکے عواقب کے اثرات کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔

(۲) زنا: روئے ارض پر اس کی جو بھی صورتیں ہوں عمل زنا میں خون یا اس کے By-Product کی ایک جسم سے دوسرے جسم میں ناجائز منتقلی کا عمل ہوتا ہے۔

(۳) غصب: غصب حصول کی ناجائز صورت کو کہتے ہیں۔ خواہ کسی صورت میں ہو لاعلمی میں چوری ہو یا زبردستی چھین لینا یا اس کی کوئی اور صورت ہو۔ ہم طول مبحث سے بچنے کے لئے غصب سے سردست صرف نظر کرتے ہیں یا مان لیتے ہیں کہ اس کا تعلق حکمی ہے اور اس طرح عینی نہیں جیسا قتل نفس اور زنا کا ہے۔ اس صورت میں ہم بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ شریعت میں جنایات کی بنیاد 'خون' ہے۔ اور ان میں بھی سب سے بڑے جرم کی شکل میں اگر کوئی عمل ہے تو وہ

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarulan.net

سفک دم یعنی قتل ہے۔ چنانچہ قرآن نے فرمایا:

من قتل نفسا بغیر نفس اور فسادفی الارض فکا نما قتل الناس جمیعا

(المائدہ ۳۲)

ترجمہ: جوکوئی قتل کرے ایک جان کو بلاعوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے زمین میں تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو۔

یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ زمین پر سفک دم کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کی رضا کیا ہے جس کی عملی صورت شریعت اسلامیہ پیش کرتی ہے؟

(۱) اسلام چاہتا ہے کہ روئے ارض پر انسانی خون ناجائز طور پر قطعاً نہ بہایا جائے۔ ناجائز طور پر خون بہانے سے مراد ہے 'بغیر نفس و فساد' کے علاوہ صورتوں سے خون کا بہانا۔ چنانچہ روئے ارض پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ خون کا بہانا نقطۂ صفر (Reduction to the Zero Level) پر لادیا جائے۔

غور کیا جائے تو روئے ارض پر خون کا بہانا عملیت کے اعتبار سے صرف تین راستوں سے نقطۂ صفر پر لایا جا سکتا ہے۔

(۱) صرف فساد کے زیر کرنے کے لئے خون بہایا جائے۔

(۲) قصاص لینے کے لئے خون بہایا جائے۔

(۳) دیت کے ذریعہ اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔

فساد کا زیر کرنا خالص اسلامی ہیئت حاکمہ میں محض ایک خارجی عمل ہے یعنی جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ فساد کا زیر کرنا جس میں مؤمن اور ذمی شامل نہیں۔ ملک اللہ یا حکومت عادلہ میں خالص اندرونی عمل پورا کا پورا یا تو قصاص پر مشتمل ہے یا دیت پر۔ پوری انسانی تاریخ میں روئے ارض پر وہ معاشرہ جہاں ناجائز طور پر خون بہانے کو محض دعویٰ اور پروپگنڈا کے بطور نہیں بلکہ حقیقی طور پر بالکل Mathematical Zero پر پہنچا دیا گیا ہو صرف عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ کا معاشرہ ہے۔ لہٰذا عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ کی ایک تعریف یہ بھی ہو سکتی ہے: 'وہ عہد جس میں روئے ارض پر سفک دم کو صفر پر پہنچا دیا گیا ہو'۔ اب اللہ کی رضا کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ دو چیزیں پسند کرتا ہے۔ جو ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں:

prepared by M. Aamir Mehmood
www.urdunovels.net

(۱) روئے ارض پر ناجائز طور پر خون کا بہانا (سفک دم) کم ترین درجے تک یعنی صفر کے درجہ تک لا دیا جائے۔

(۲) روئے ارض پر تطوعاً خون کا بہانا (Voluntary Spilling of Blood) یعنی انسان محض اللہ کی رضا کے لئے خود اپنا وہ خون بہا کر جو الجنۃ کے ایمنی جن کا مابقیہ ہے اور اپنی جان دیکر جو اللہ کی امانت ہے شہادت حاصل کرے۔ یعنی وہ جان حاصل کرے جو الجنۃ کی اعلیٰ ترین جان اور حیات ہے۔ نفس سے نئی جان دے کر نفس مطمئنہ سے نئی جان حاصل کرنا ہے۔

یہ ایک ہی سکے کے دو دو رخ ہیں۔ چنانچہ پہلے کی خلاف ورزی پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے ایک جان ناجائز طور پر لی اس نے گویا پوری انسانیت کا قتل کیا۔ اور دوسری طرف اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ کہلوایا کہ 'جس شخص میں شہادت کی موت کی تمنا نہ ہو وہ مومن نہیں'۔

اس کے برعکس ایک اور منظر بھی ہے۔ روئے ارض پر انسان کے بسائے جانے کے بعد سے ابتک بلافصل ابلیس کی یہ کوشش رہی ہے کہ:

(۱) روئے ارض پر ناجائز طور پر خون کا بہانا (سفک دم) بدترین حد تک بڑھا دیا جائے یعنی خوں ریزی کو صد فی صد مقام پر لا دیا جائے۔ ابلیس کی اصلی خواہش یہ ہے کہ روئے ارض پر ہر طرف خون ہی خون بہے اور ہر جان خون ریزی کے ذریعہ ختم ہو۔

(۲) اسی طرح ابلیس کی دوسری خواہش یہ ہے کہ روئے ارض پر تطوعاً خون بہانے کو یعنی شہادت کی موت مرنے کو کم ترین سطح یعنی صفر پر لا دیا جائے۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ بعض اوقات کفار ابلیس کی ہدایت کے مطابق کسی مومن کو موت کی سزا صرف اس لئے نہیں دیتے کہ کہیں وہ شہید نہ ہو جائے اور روئے ارض پر ایک ایسی جان کا اضافہ نہ ہو جو درجۂ شہادت پا چکی ہو۔ آخر اس کا راز کیا ہے؟

سفک دم ہو یا خون کی ناجائز منتقلی یعنی زنا یہ ابلیس کے فساد کو بڑھاتی ہے اور آدم کے مقام کو نیچے گراتی ہے یا اوپر بحال ہو کر ترقی حاصل کرنے نہیں دیتی ہے۔ جب کہ اسی خون کو تطوعاً روئے ارض پر گرا دینا حیثیت آدم کو بلندی عطا کرتا ہے۔ خون کا تطوعاً گرانا اس لئے بلندی عطا کرتا ہے کہ انسان صرف اسی خون کا امانت دار ہوتا ہے جو اس کی اپنی رگوں میں بہہ رہا ہے۔

شہادت کی اصلی روح یہ نہیں ہے کہ ہیبت ناک سے ہیبت ناک اسلحوں سے جنگ کی جائے اور اللہ کے باغیوں کا مقابلہ اسلحوں کی برتری سے کیا جائے اور انہیں زیادہ سے زیادہ مارا جائے یا انہیں شکست فاش دی جائے۔ یہ سب باتیں شہادت کی بنیاد نہیں۔ شہادت کی بنیاد تو صرف اپنی رگوں میں بہتے ہوئے اس خون کو جو دراصل ابلیسی فساد کا ایک مابقیہ ہے اور اس مومن کے جسم کو لاحق ہے صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے بہادیا جائے۔ کفار کی شکست اور ان کا زیاں محض اللہ کے انعامات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء نے اسلحوں کی دوڑ کی روایت قائم نہیں کی بلکہ ساری دنیا کے سامنے قاہر سے قاہر فوج کے مقابلے میں صرف اللہ کی رضا کے لئے تطوعاً خون بہانے کو آمادہ افراد تیار کئے۔ وہ افراد جو اس راز کو جانتے ہیں کہ روئے ارض پر خود اپنی رگوں کا خون بہانا صرف اس انسان کو ہی نہیں جس نے اپنی رگوں کا خون شہادتاً بہایا ہے بلکہ پورے نوع آدم کو بلندیوں کے حسین مقام عالی پر لے جاتا ہے۔ شہادت کے جذبے سے سرشار نفوس قدسیہ کو 'دہشت گرد' کہنا دراصل ابلیس کے اس پروپگنڈے کا حصہ ہے جس کے تحت اس کی کوشش ہوتی ہے کہ روئے ارض پر ایک قطرۂ خون بھی شہادتاً نہ بہے۔ اسی میں ابلیس کی فتح ہے۔ اسی طرح اس کی کوشش ہے کہ روئے ارض پر ناجائز خون جتنا بہایا جاسکے بہتر ہے۔ مثلاً قتل عام، رحم مادر میں جنین کا بڑے پیمانے پر خاتمہ اور دیگر طریقوں سے قتل عام۔ چنانچہ تاریخ میں Weapon of Mass Destruction کو ایجاد کرنے والے ہمیشہ روئے ارض پر وہی لوگ ہوئے جو ابلیس کے آلۂ کار تھے۔ اس مقام پر اگر اس نکتے کو سمجھ لیا جائے تو ترقیٔ آدم کا اصلی راز سمجھ میں آجائے گا۔ چنانچہ دین اللہ کے اصول ملاحظہ فرمائیں:

(١) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنی اولادوں کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔

(٢) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خوب اولادیں پیدا کرو میں چاہتا ہوں کہ میری امت زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہو۔ اور حشر کے میدان میں وہ سب سے کثیر تعداد پر مشتمل ہو۔

(٣) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شہادت کی تمنا نہ کرے وہ مومن نہیں۔

آخر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ان باتوں سے کیا مراد ہے؟ کیا درج ذیل کے علاوہ کوئی اور بات مراد ہو سکتی ہے؟

(١) اللہ کے رسول چاہتے ہیں کہ پیدا ہونے والے مقدر افراد کی زیادہ سے

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarulalam.net

زیادہ تعداد مومن پیدا ہو یا کم از کم یہ کہ مومن پشت میں محفوظ کوئی اولاد روئے ارض پر پیدا ہونے سے نہ رہ جائے۔

(۲) صدفی صد مومن شہادت پائیں یا اگر ایسا ان کے مقدر میں نہیں تو ایسی نیت رکھنے کے سبب وہ شہیدوں میں شمار ہوں۔ یہ بات معلوم و مشہور ہے کہ انسان مرنے کے بعد انہیں لوگوں میں اٹھایا جائے گا جس کا اس کے اندر میلان ہوگا۔

اس کے برخلاف ابلیس یہ چاہتا ہے کہ روئے ارض پر یا تو اولاد آدم کم سے کم پیدا ہو یا جو پیدا ہو وہ مومن پیدا نہ ہو اور اس دنیا میں پیدا ہونے والے زیادہ سے زیادہ افراد ناجائز موت میں مارے جائیں اور اگر کوئی ناجائز موت سے نہ مرے تو کم از کم شہادت کی موت نہ مرے۔

یہ ہے وہ راز جس کے بعد اس ذبح عظیم کا سمجھنا کسی قدر آسان ہو جائیگا۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام ہر دو نے اپنی جانب سے تطوعاً اپنا خون بہایا۔ یہ خون اس روئے ارض پر بہایا گیا لیکن جو خون بہا وہ عالم اشیاء کا خون نہیں تھا۔ حضرت اسمٰعیل اپنی پہلی موت (شیر خوارگی میں) میں عالم اشیاء سے عالم عصر میں منتقل ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان کی روح ذبح کئے جانے کے وقت میں نفس کی حالت میں نہیں بلکہ نفخ کی حالت میں تھی۔ اور جب نفخ کی حالت میں وہ خون پیش کیا گیا تو لازماً حیثیت آدم عالم عصر سے عالم بریہ میں صعود کر گئی۔ یہ بحالی نہیں بلکہ پہلی عظیم ترقی تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اس عظیم قربانی کو قبول فرمالیا اور حضرت اسمٰعیل کو فدیہ قرار دے دیا۔

اے کاش اس مقام پر اتنی گنجائش ہوتی کہ 'فدیہ کیا ہے؟' کی تشریح کی جا سکتی۔ لیکن اس سوال کو سر دست نظر انداز کرنا ہی احسن ہے۔ چنانچہ فدیہ قرار دیئے کے بعد حضرت اسمٰعیل ہر چند کہ اس روئے زمین پر ایک انسان کی طرح زندہ رہے لیکن دراصل وہ الجنہ میں گناہ سے قبل کی حالت سے بھی مرتفع حالت میں اور وہ بھی عالم بریہ میں 'خیر البریۃ' کے مقام پر فائز ہو چکے تھے۔ یہی وہ راز ہے جس کی طرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا تھا کہ میں دو 'ذبح' کی نشانی ہوں۔ اور اس سے آگے بڑھکر یہی وہ ذبح ہے جس کے لئے خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو پیش فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے دن ۱۰۱ اونٹوں کی قربانی پیش فرمائی۔ سو (۱۰۰) اونٹ کسی جان کی سب سے قیمتی دیت ہے۔ اور فدیہ ہے۔ گویا خود آنحضور

www.booksbe.net
www.urdutubebe.net
prepared by M. Aamir Mehmood

صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے دن اسی طرح کی قربانی پیش فرمائی۔ کیا عجیب کہ اس دن آدم عالم بریہ سے ترقی کر کے عالم اصل میں مقعد صدق کے نزدیک پہنچ چکے ہوں۔ یعنی حجۃ الوداع کے اس دن خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات محمد اور روح محمد مقعد صدق میں داخل ہو چکی ہو۔ شہادت روح انسانی کو الجنہ کی حالت پر یا اس سے بھی آگے لے جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ احادیث میں آیا ہے کہ شہید بغیر حساب وکتاب کے جنت میں جائے گا یعنی شہید ایسا ہی ہے گویا اس پر روئے ارض کی تکلیف ساقط ہو جائے۔ گویا وہ الجنہ میں ہی تھا اب یا وہاں رہے یا اس سے بھی آگے جائے۔ اس لئے قرآن نے فرمایا ہے:

ولا تقولوا لمن يقتل فی سبيل الله اموات بل احياء ولكن لا تشعرون
(البقرہ ۱۵۴)

ترجمہ: اور نہ کہو ان کو جو قتل کئے گئے اللہ کی راہ میں کہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو خبر نہیں۔

موت تو نفس پر طاری ہوتی ہے جو عالم اشیاء کی صورت روح ہے۔ جب کوئی عالم اشیاء سے نکل گیا تو پھر اب اس کی روح پر موت طاری نہیں ہو سکتی۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن   نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

اقامت ختنہ

اقامت ختنہ سے مراد اقامت ازالۂ غرل یا اقامت ازالۂ قلفہ کرنا ہے۔ اقامت ختنہ حضرت ابراہیم علی نبینا الصلوۃ والسلام کی وہ اگلی عظیم الشان عزیمت ہے جو اقامت ذبح عظیم کی طرح ہی حیثیت آدم کی بحالی میں ایک انقلاب ثابت ہوئی۔ غرل یا قلفہ سے نجات امتثالاً دراصل حیثیت آدم میں انقلابی بحالی ہے۔

اقامت ذبح عظیم کے ذیل میں عرض کیا گیا تھا کہ الجنہ میں گناہ کے سبب روح کی طرح آدم وحوا کے جسم میں بھی ایک انفجار ہوا تھا جس نے جسمانی نظام میں انہدام وفساد کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جس کی کم از کم تین جہتیں تھیں

(۱) جسم کے اوپری غلاف کے تعلق سے۔

(۲) جسم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک واقع خلا (Tran-Corpus

(Passage) کے دونوں سروں پر انفجار فتق (Rapture) اور باہر کی طرف ابھار (Protruding) کے تعلق سے۔

(۳) متوازی خلا کے بننے اور اس میں خون نامی مضاد جسم (Anti-gen) کے دخول کے تعلق سے۔

یہی انہدام اور فسادات روئے ارض پر بیشتر تکلیف یا تکلیفات شرعی کے باعث ہوئے۔ اس کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے۔ اگر صرف یہ فرض کر لیا جائے کہ الجنہ میں یہ تینوں نتائج برآمد اور متعلقہ اثرات مرتب نہ ہوتے تو اس صورت مین روئے ارض میں بیشتر تکلیفات شرعی کا وجود نہ ہوتا۔ ان تمام تکلیفات شرعی ____ طہارت، عبادات، زکوۃ، حج، فرائض اور جنایات پر نظر ڈال لی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس صورت میں یا تو ان کا وجود نہ ہوتا یا یہ تکلیفات ہزاروں درجہ کم ہو جاتیں۔

اقامت ختنہ ایک اقامت بھی ہے اور ایک انعام بھی۔ انعام کی صورت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی اللہ رب العزت کے سامنے کامل سپردگی کا ہی نتیجہ اور صلہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ اقامت ختنہ فرمائیں یعنی ان کے توسط سے اور ان کی عزیمتوں کے سبب بنی آدم کی 'حالت الجنہ قبل گناہ' کو بحال کر دینے کا فیصلہ ہوا۔

خَتَن کا کیا مفہوم ہے؟

جسم کے ایک مخصوص عضو کے ایک حصے کو کاٹ کر الگ کر دینا اصطلاحی معنی ہے جس کی بذاتہ کوئی حیثیت نہیں تاوقتیکہ اس کے اصلی معنی کا تناظر نہ ہو۔ خَتَن کا اصلی مفہوم ہے:

(۱) کسی نوجوان کا بالغ ہونا

(۲) کسی نوجوان کا شادی کے لائق ہونا

(۳) کسی نوجوان کو داماد بنانا

اور اسی سے لڑکی کا باپ خَتَن اور خوشدامن ختنہ اور داماد خَتَن کہلاتے ہیں۔ قدیم زمانے میں اس عمل کو یوں کیا جاتا تھا کہ جب کوئی شخص اپنی لڑکی کی شادی کسی شادی کے لائق نوجوان سے کرنا چاہتا تو وہ اس نوجوان کا ختنہ کرتا تھا۔ یہی عمل دراصل شادی کا عمل قرار پاتا۔ چونکہ کسی نوجوان کو داماد یعنی اسی عمل کے ذریعہ بالغ، لائق شادی اور داماد بنایا جاتا تھا اور یہ عمل کرنے والا

لڑکی کا باپ ہوتا تھا اس لئے اس مخصوص حصے کو کاٹ کر الگ کر دینے کو ختنہ کہا گیا۔ بعد میں اصلی معنویت باقی نہیں رہی لہذا اب ختنہ صرف ایک عضو کے مخصوص حصے کو کاٹ ڈالنے کو ہی کہتے ہیں۔

حضرت ابراہیم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے دراصل الجنہ میں گناہ کے انجار اور اس کے نتیجے میں واقع ہونے والے فسادات کے ازالے کی علامت کے بطور اس حصے کا انقطاع اور اس راستے سے خون کے بہانے کا حکم فرمایا۔ اس کی تفہیم اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ اس عمل کے ذریعہ عالم مثال میں آدم و حوا کے جسم کو عمل جراحی کے ذریعہ ان نقائص اور ابھار سے پاک کر دیا گیا ہے جو گناہ کے انجار کے نتیجے میں ان میں پیدا ہو گئے تھے۔ جب آدم و حوا الجنہ میں گناہ سے قبل تھے تو:

(۱) نہ ان کا لباس اترا تھا

(۲) نہ ان کے جسم کے بیچوں بیچ موجود خلا کے دونوں سروں پر مخرج کا وجود تھا اور نہ ان مخرجوں کے پاس ابھار تھا۔

(۳) نہ اس خلا کے متوازی کوئی اور خلا تھا نہ اس میں خون (دم) جیسی کوئی Anti-gen باہر سے داخل ہوئی تھی۔

جب گناہ کے بعد الجنہ میں یہ صورتیں پیدا ہو گئیں اور ان کے نتائج برآمد ہونا شروع ہو گئے تو ان دونوں کو وہاں سے منتقل کر دیا گیا۔ اب جب کہ انہوں نے اپنی حیثیت بحال کر لی اور اس کے مستحق ہو گئے کہ انہیں الجنہ میں دوبارا واپس لایا جائے تا کہ وہ اگلے سفر کو از سر نو جاری کریں تو ان آلائشوں اور نقائص کے ساتھ انہیں بحال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ان عزیمتوں کے نتیجے میں آدم حیثیت سابق میں بحال ہونے کا مجاز و مستحق ہو گیا تو حضرت ابراہیم کو حکم دیا گیا کہ وہ اس جسم پر ایسا عمل جراحی کریں تا کہ آدم کا جسم الجنہ میں ما قبل گناہ کی حالت میں بحال ہو جائے۔ تاریخ آدم میں یہی اقامت ختنہ ہے۔ اور یہ حضرت ابراہیم کی اتنی بڑی عزیمت کا نتیجہ ہے کہ اسے ان کی عظیم الشان سنتوں میں سے ایک سنت قرار دیا گیا۔

یہی راز ہے اس حدیث مبارک کا جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع کلم کا ایک غیر معمولی نمونہ ہے۔ یہ حدیث اس روئے ارض پر روح دین، حقیقت شریعت، حقیقت معرکۂ خیر و شر، حقیقت فتنۂ ابلیس، حقیقت لغزش آدم اور سر نجات سب کی گتھیوں کو کھولنے والی ہے۔ اس

عاجز کے نزدیک اس حدیث کا یہ مقام ہے کہ اگر امام بخاری اسے اپنی صحیح میں درج پہلی اور دوسری حدیث کے درمیان درج فرماتے تو صحیح کا مرتبہ اور بلند ہو جاتا۔ حدیث مبارک ہے:

عن سهل بن سعد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : من يضمن لي مابين لحييه وما بين رجليه اضمن له الجنة (البخاری : حفظ اللسان: کتاب الرقاق)

ترجمہ: روایت کیا حضرت سہل بن سعد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے: (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا: جو شخص ضمانت دے اس چیز کی جو اس کے دونوں جبڑوں کے بیچ میں ہے اور جو اس کے دونوں پاؤں کے بیچ میں ہے تو میں اس کے لئے الجنہ کی ضمانت دیتا ہوں۔

اقامت صلوۃ یا اقامت ملک اللہ

آدم کی حیثیت کی بحالی اور اس کی جسمانی و روحانی تقویت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے روئے ارض پر اس عظیم مہم کا آغاز کیا جس کا مقصد 'منہج ابلیس' یعنی 'منہج فساد ملک' کا خاتمہ کرنا تھا۔ اس منہج کے تحت ابلیس روئے ارض پر جس بھیانک معرکے کا آغاز کرنے والا تھا اس کے اندر پوری زمین میں انسانوں کے مابین ایک ایسی کشمکش کا آغاز ہوتا جس کی بنیاد 'ملک' ہوتا یعنی:

'جو زمین کا مالک ہے وہی ملک کا مالک ہے'

حضرت ابراہیم کو اللہ تعالٰی نے جس 'ہدیٰ' سے نوازا تھا اس کے ذریعہ آپ بخوبی واقف ہو گئے تھے کہ اس عنوان سے ابلیس روئے ارض پر کیسی کیسی جنگیں اور کیسی کیسی تباہیاں لانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آنے والے دنوں میں روئے ارض پر:

(۱) ملک یعنی اتھارٹی کے استحقاق کی جنگ Conflict of the Prerogative of Authority

(۲) ملک یعنی اتھارٹی کے استعمال کے استحقاق کی جنگ Conflict of the Prerogative of the Use of Authority

(۳) ملک یعنی اتھارٹی کے سبب احتساب کے استحقاق کی جنگ Conflict

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarulam.net

of the Prerogative of the Accountability on account of Authority

کی ایسی گرم بازاری ہوگی جس کے سبب انسانی حیات اوراس کی حرمت پامال ہوکر رہ جائے گی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے 'منبع فساد ملک' کے خلاف اللہ تعالیٰ اوران کے مابین ہوئے میثاق کی تکمیل کا باضابطہ آغاز فرمادیا۔ اس عنوان کے تحت آپ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تحت چار عظیم الشان عزیمتوں کا ثبوت دیا جسے ہم ذیل میں اقامت صلوۃ، اقامت دین اللہ، اقامت بیت اللہ اور اقامت حج کے تحت زیر بحث لائیں گے۔

صلوۃ کیا ہے؟ اس کا کیا مفہوم ہے؟

عہد خلافت راشدہ کے بعد علوم اسلامی میں جو بڑے بڑے فساد برپا کئے گئے ان میں سے ایک فساد عظیم صلوٰۃ کے موجودہ مشہور و معروف مفہوم کی اشاعت ہے۔ (اس بحث اور تقریر کا موقع یہاں نہیں اس لئے اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔) چنانچہ اس فساد انگیزی کے تحت صلوٰۃ کا مفہوم مطلقاً دعا کرنا اور نماز پڑھنا مشہور کیا گیا ہے۔ اس عاجز کو نہیں معلوم کہ یہ مفہوم کہاں سے آیا؟ کہاں سے لیا گیا؟ کس نے لیا اور ان کے دلائل کیا ہیں؟

چودھویں صدی ہجری کے ایک مشہور لغت نویس نے 'صلوۃ' کا مفہوم درج کرتے ہوئے لکھا:

(۱) صلیٰ، صلاۃ : دعا واقام الصلاۃ (دعا کرنا، نماز پڑھنا)

(۲) صلی اللہ علیہ : بارک علیہ واحسن علیہ الثناء. برکت دینا۔ اچھی تعریف کرنا)

(۳) الصلاۃ او الصلوۃ بالواؤ : ارتفاء العقل الی اللہ لکی نسجد لہ ونشکرہ ونطلب منو نتہ، الدعاء، التسبیح (دعاء، نماز، تسبیح)

(۴) الصلاۃ من اللہ : الرحمۃ والثناء علی عبادہ ج صلوات (رحمت)

((۱) لوئس معلوف: المنجد فی اللغۃ (۲) مولانا عبدالحفیظ بلیاوی: مصباح اللغات)

حیرت ہے کہ ایک ہزار سال قبل عربی کے سب سے پہلے باضابطہ معجم نویس ابن درید کو یہ معانی معلوم نہ تھے چنانچہ دیگر معانی کے علاوہ جو قریب ترین اور متعلق مفہوم اس نے درج کیا

prepared by M. Aamir Mehmood
www.urdualam.net

ہے وہ درج ذیل ہے:

(۱) والصلاة من الواو وتجمع صلوات قال بعض اهل اللغة اشتقاقها من رفع الصلا في السجود (الصلوۃ واؤ سے جس کی جمع صلوٰات ہے۔ بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ وہ سجدہ کرتے ہوئے پیٹھ کے اٹھانے سے مشتق ہے)

(ابوبکر محمد بن الحسن بن درید الازدی البصری: کتاب جمهرة اللغة : متوفی ۳۲۱ ہجری: جلد۳)

جو حضرات مفسرین ومحدثین اور بالخصوص ثقہ اور محقق حضرات کے طرز اظہار کو گہرائی سے جانتے ہیں وہ خوب سمجھتے ہوں گے کہ ابن درید کا کہنا: قال بعض اهل اللغة : سے کیا مراد ہے؟ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کا یہ ایک المناک باب ہے کہ ایک گہری سازش کے تحت صلوٰۃ کے اس معنی سے جو 'عربیٔ مبین' کے مطابق اس کے معنی ہیں پوری امت کو محروم اور صلوٰۃ کی حقیقت کو محجوب کر کے رکھ دیا گیا۔ یہ محض ہماری کوتاہیوں اور کمزوریوں کے سبب نہیں ہوا بلکہ ابلیس کی ایک بڑی سازش کے تحت ہوا جس کے ہم کم ذمہ دار نہیں۔ صلوٰۃ معروف عربی لغت ہے ہی نہیں یہ تو 'عربی مبین' میں ایک اہم اور معنویت کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل لفظ ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ یہ لفظ صرف عربی مبین کا ہی حصہ نہیں بلکہ 'بیان' کا بھی حصہ ہے۔ چنانچہ عربی مبین میں اس کے معنی ہیں:

(۱) طاقت، قوت، قوت نافذہ، قوت حاکمہ، قوت مہیمنہ

(۲) طاقت حاصل کرنا، ظاہر کرنا، ثابت کرنا، قوت نافذہ اور قوت حاکمہ کا اظہار کرنا، قوت مہیمنہ کا مظاہرہ کرنا

(۳) قوت نافذہ، قوت حاکمہ اور قوت مہیمنہ کے اظہار کے لئے مرئی ومحسوس مظہر متعین وقائم کرنا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حکم فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے 'ملک' (Authority) کو قائم فرمائیں اور اس کے لئے مرئی ومحسوس مظہر کی اقامت کریں۔

اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم پر ایک اور فضل فرمایا اور وہ یہ کہ ان کی اقامت مقام کو توسیع دیکر اسے ایک طرف تو عام کر دیا اور دوسری طرف اسے ہی 'مظہر ملک' کی حیثیت سے قبول فرمالیا۔

prepared by Mr. Aamir Mehmood
www.astaralam.net

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے روئے ارض پر ابلیس کے 'فسادِ ملک' کے خلاف پہلا باضابطہ حملہ اس طرح فرمایا کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے 'ملک' کی اقامت کا اعلان فرمادیا اور اس اعلان کے لئے صلوۃ قائم فرمائی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بندے کے ذریعہ عبادت وعبودیت کا اظہار 'قیام' ہے۔

یہی گہرا راز اور فرق 'یا یھا المزمل قم الیل الاقلیلاً' (المزمل) ور 'یا یھا المدثر قم فانذر (المدثر) میں پوشیدہ ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء صرف 'حکم قیام' ہوا تھا چنانچہ آپ نے 'اقامت مقام' فرمائی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آپ اب باضابطہ اس کام کا آغاز کردیں جس کے لئے آپ مبعوث فرمائے گئے تھے تو آپ کو حکم ہوا کہ 'قم فانذر'۔ قم فانذر دراصل 'اقامت صلوۃ' کا حکم ہے۔ اور ظاہر ہے اس حکم کے بعد اس حکم کی تعمیل کے لئے جتنی چیزیں ضروری ہونگی ان کا کرنا لازم آئے گا۔ چنانچہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام لوازم کو پورا کرنے کا آغاز فرمایا۔ اسی جگہ اس آیت کا راز بھی پنہاں ہے۔ جس کا ذکر حضرت ابراہیمؑ کے تذکرے میں 'اقامت مقام' کے ذیل میں آچکا ہے:

واتخذوا من مقام ابراھیم مصلیٰ (البقرہ ۱۲۵)

ترجمہ: اور بنالو ابراہیمؑ کے (مقاموں میں) سے (اس) مقام کو (روئے ارض پر مرکز ومظہر) 'ملک اللہ'۔

'مصلیٰ' دراصل وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہوکر 'مامور من اللہ' درج ذیل امور کا اظہار کرتا ہے:

(۱) وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے اور اس کا قلب اور اسکی زبان اور اس کے جوارح اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ روئے ارض کو صرف اللہ کی ملک سمجھتا ہے اور اس پر صرف اس کے 'ملک' کو تسلیم کرتا ہے اس کے علاوہ کسی اور کے 'ملک' کے ہر دعوے کو رد کرتا ہے۔

(۲) وہ اس بات کا اقرار ہی نہیں بلکہ اعلان بھی کرتا ہے اور اس کا قلب، اسکی زبان اور اسکے جوارح اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ روئے ارض صرف اور صرف اللہ کی ملک ہے اور وہ کسی دوسرے کے ملک ہونے کو علانیہ رد کرتا ہے۔

(۳) وہ اس مقام پر کھڑے ہوکر ساری دنیا کو اس بات کے اقرار اور اعلان کے لئے بلاتا

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asraraam.net

ہے کہ 'پوری روئے ارض صرف اللہ کا 'ملک' ہے۔

(۴) وہ اس مقام کو ساری روئے زمین پر اللہ کے ملک کا اعلان کرنے، گواہی دینے، اس کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لئے 'مرکز' بناتا ہے (پوری روئے زمین پر پھیلے مصلے اسی مقام ابراہیم پر قائم مصلی کے تابع اور تو اردیا ردف ہیں)

(۵) وہ اس مقام کو پوری روئے زمین پر قائم 'ملک اللہ' (The Authority of Allah) کا 'مظہر' (Symbolic Seat of Allah's Power on Earth) قرار دیتا ہے۔

ابھی اس عاجز نے 'صلوۃ' کے مفہوم کی وضاحت میں یہ سوال کیا تھا: ''صلوۃ کا مفہوم دعا کرنا اور نماز پڑھنا مشہور کیا گیا تھا۔ اس عاجز کو نہیں معلوم یہ مفہوم کہاں سے آیا؟ کہاں سے لیا گیا؟ کس نے لیا؟ اور ان کی دلیل کیا ہے؟' تو اس کا یہ سوال بے جا نہیں۔

بھلا سوچنا چاہیے کہ روئے ارض پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ واضح طور پر 'صلوۃ' کا مطلب کون سمجھتا ہوگا۔ تو جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلا عظیم فیصلہ فرمایا اور اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک کی بات رد کردی اور فرمایا:

واللہ لا قاتلن من فرق بین الصلوۃ والزکوۃ۔

ترجمہ: خدا کی قسم! جو الصلوۃ اور الزکوۃ میں فرق کرتے ہیں ان سے لڑ کر رہوں گا۔ تو آخر اس کا مفہوم کیا تھا؟ واضح رہے کہ یہاں محققین 'ان سے لڑ کر رہوں گا' کا مطلب صرف یہ لیتے ہیں کہ یا تو ان کے خلاف جنگ کرکے اور انہیں شکست دیکر مجبور کروں گا کہ وہ حضرت ابوبکر خلیفہ رسول اللہ کو زکوۃ ادا کریں یا پھر اس لڑائی میں اپنی جان دے دوں گا۔ پھر آپ نے فرمایا:

واللہ لو منعونی عناقا کانوا یؤدونھا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علی منعھا۔

ترجمہ: خدا کی قسم! اگر یہ لوگ ایک بکری کا بچہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے مجھ کو نہ دیں گے تو میں ان کے نہ دینے پر ان سے ضرور لڑوں گا یعنی قتال کروں گا۔

سوچنا چاہیے کہ آخر زکوۃ نہ دینا یا زکوۃ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہ دینا ایسی کیا

بات تھی کہ حضرت ابوبکر نے یہاں تک کہہ دیا کہ یا تو لے کر رہوں گا یا زکوٰۃ کی وصولی کی لڑائی میں اپنی جان دے دوں گا۔ اور پھر یہ بھی سوچنا چاہئے کہ روئے ارض پر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ 'الصلوٰۃ' کا مطلب سمجھنے والا کون ہوگا جنہوں نے پہلے تو حضرت ابوبکر پر یہ اعتراض فرمایا:

'کیف تقاتل الناس وقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ فمن قالها فقد عصم منی ماله ونفسه الا بحقه وحسابه علی اللہ' (بخاری کتاب الزکوٰۃ)

ترجمہ: آپ ان لوگوں سے کیسے لڑیں گے جب کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: مجھے لوگوں سے لڑنے کا اسی وقت تک حکم ہے کہ لا الہ الا اللہ کہیں جب یہ کہنے لگیں تو انہوں نے اپنے مال اور جان کو مجھ سے بچا لیا البتہ کسی حق کے بدل پر یہ اور بات ہے۔ اب ان کا حساب اللہ پر ہے۔'

لیکن جب حضرت ابوبکر نے وہ جواب دیا جو اوپر نقل کیا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: **'فواللہ ما ھو الا ان قد شرح اللہ صدر ابی بکر فعرفت انه الحق'**

ترجمہ: پھر خدا کی قسم! اللہ نے ابوبکر کا سینہ کھول دیا تھا میں سمجھ گیا کہ وہ 'الحق' تھا۔

آخر یہ معمہ ہے کیا؟

حقیقت اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

(۱) کہ ہم ان لوگوں سے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر رہے ہیں کیسے لڑ سکتے ہیں اس لئے کہ وہ ایمان لا چکے ہیں اور ہمیں صرف ان کے خلاف لڑنے کا حکم یعنی جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو ایمان نہ لا رہے ہوں اور اللہ کی بغاوت پر کمربستہ ہوں۔ جہاں تک ان لوگوں کا معاملہ ہے جنہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو یہ ایمان پر قائم ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں۔

تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

(۱) زکوٰۃ کا نہ دینا یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان کے جانشیں خلیفۂ رسول اللہ ابوبکر کو زکوٰۃ نہ دینا دراصل الزکوٰۃ اور الصلوٰۃ میں فرق کرنا ہے یعنی اس 'ملک اللہ' سے

بغاوت ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا اور جس کی زمام کار اس وقت ان کے خلیفہ ابوبکر کے پاس ہے۔ الصلوٰۃ روئے ارض پر اللہ کا 'ملک' یعنی Authority ہے اور اس اتھارٹی کے نمائندہ ابوبکر ہیں لہٰذا ابوبکر کو زکوٰۃ نہ دینا دراصل اللہ کی اتھارٹی کا انکار اور اس کے خلاف بغاوت ہے۔

(۲) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایام میں ہی زکوٰۃ دینے سے انکار کرنا دراصل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ قائم کردہ 'الحکم' یعنی 'ملک اللہ' کو ڈھا دینا تھا۔ جس کے قائم کرنے کے لئے ہی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے یعنی زکوٰۃ کا انکار دراصل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کے حاصل کو ڈھا دینا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اس کی حفاظت کے لئے ابوبکر ضرور لڑائی کرے گا۔ اور اگر کوئی اس کا ساتھ نہیں دیتا جب بھی وہ تنہا جنگ کرے گا اور یا تو 'ملک اللہ' کے باغیوں کو شکست دے گا یا اس راہ میں اپنی جان دے دے گا اس لئے کہ روئے ارض پر انبیاء اور رسل کی بعثت کا جو مقصد اولین و آخرین ہے اور جس کے قائم رکھنے کا میثاق امت محمدیہ نے کیا ہے اور آج جس فیصلہ کن منصب پر ابوبکر فائز ہے اس 'ملک' Authority کو بچانا اور اسے قائم رکھنا اس کا مقصد حیات ہے۔ اس کے لئے تنہا نکل پڑنا اور اس کاز کے لئے ساری دنیا کے خلاف یک و تنہا کھڑا ہو جانا حتیٰ کہ جان دے دینا کوئی بات ہی نہیں بلکہ حاصل حیات ہے۔

یہ ہے وہ بات جس کے سمجھ لینے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: **انہ الحق** وہ 'الحق' تھا۔ یہ وہ برہان تھا جس کا فیضان اللہ ایسے نازک موقعوں پر انبیاء پر کیا کرتا تھا اور آج اس کا فیضان اس نے ابوبکر پر کیا ہے۔

حضرت عمر اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی بات تو بہرحال بعد میں آئے گی خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم 'الصلوٰۃ' کی حقیقت پر کیا فرماتے ہیں وہ اس حدیث میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

عن عبداللہ بن عمر وعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم : انہ ذکر الصلوۃ یوما فقال : من حافظ علیھا کانت لہ نورا وبرھانا ونجاۃ یوم القیامۃ. ومن لم یحافظ علیھا لم یکن لہ نور وبرھان ولانجاۃ وکان یوم القیامۃ مع فرعون

www.bookstube.net www.urdutube.net prepared by M. Aamir Mehmood www.urdumovies.net www.asraralam.net

وهامان وابی بن خلف.

(اخرجه احمد وابن حبان والطبرانی کذا فی الدرالمنثور للسیوطی وقال الهیثمی رواه احمد والطبرانی فی الکبیر والاوسط رجال احمد ثقات وقال ابن حجر فی الزواجر اخرجه احمد بسند جید وزاد فیه قارون ایضا مع فرعون وغیره وکذا زاده فی منتخب الکنز بروایة ابن نصر والمشکوة ایضا بروایة احمد والدارمی والبیهقی فی الشعب وابن القیم فی کتاب الصلوة)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن الصلوٰۃ کا ذکر کرنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا: جس نے اس کی حفاظت کی اس کے لئے نور اور برھان ہوگا اور قیامت کے روز نجات۔ اور جس نے اس کی حفاظت نہیں کی اس کے لئے نہ نور ہوگا نہ برھان اور نہ نجات اور وہ قیامت کے دن فرعون اور ھامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔

اس حدیث کی تشریح میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فرعون وھامان اور ابی بن خلف روئے ارض پر ان لوگوں کے رہنما ہیں جنہوں نے اللہ کی اتھارٹی یعنی 'ملک اللہ' کو چیلنج دیا تھا اور اس کے مقابلے میں اس 'ملک' کا انتساب اپنی طرف کیا تھا یا پھر ان لوگوں کا جو اس عمل میں ان کے شریک وسہیم رہے تھے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے روئے ارض پر اپنے 'قیام' کو وسعت دیکر 'صلوٰۃ' قائم فرمائی۔ آپ نے اسی وقت جب کہ آپ کو یہ حکم دیا جارہا تھا کہ اسمٰعیل کو اس لق ودق صحرا میں اللہ کے حوالے کردیا جاے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ اللہ تعالیٰ عنقریب انہیں یا ان کی اولاد کو 'اقامت صلوٰۃ' کا حکم فرمائے گا۔ ایک اولوالعزم رسول کے لئے اس سے بڑے انعام اور خوشی کی بات کیا ہوگی؟ لہذا آپ نے اس وقت اس احساس اور اندازے کو دعا کی شکل دیدی اور اللہ تعالیٰ سے اس فیضان کو مانگا۔ آپ نے فرمایا:

ربنا لیقیموا الصلوۃ (ابراہیم ۳۷)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں الصلوٰۃ قائم کریں۔

اور اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کا باضابطہ حکم فرمادیا تو حضرت ابراہیم نے بلا تاخیر الصلوٰۃ

کو روئے ارض پر قائم فرما دیا اور دعا کی:

رب اجعلنی مقیم الصلوۃ ومن ذریتی ربنا وتقبل دعاء (ابراہیم ۴۸)

ترجمہ: اے میرے پروردگار مجھے الصلوٰۃ قائم رکھنے والا بنا اور میری ذریت سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں) پروردگار میری پکار سن لے۔

اقامت دین اللہ فی الارض، اقامت ملت ابراہیمی

اقامت ملک کے تعلق سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اگلی غیر معمولی عزیمت اور میثاق کی تکمیل کی صورت 'اقامت دین اللہ فی الارض' ہے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے اقامت صلوٰۃ کے بعد اقامت دین اللہ فی الارض فرمائی۔

اقامت دین اللہ فی الارض کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ 'دین' کا مفہوم واضح ہو۔ لفظ دین بنیادی طور پر دو حرفوں اور ایک صوتیہ پر مشتمل ہے۔ یہ دو حروف ہیں: دال اور نون۔ یہ لفظ بھی عربی معروف نہیں اور عربی مبین، اور 'بیان' میں اس کے معانی درج ذیل ہیں:

(۱) وعدہ یا عہد کے پورا کرنے کی صورت، وجہ میثاق، صورت میثاق۔

(۲) نباہ۔

(۳) حکم، نظم، انتظام، فیصلہ، وہ اصلی اور کیفیاتی صورت یا ادارہ، حلقہ جس میں حکم و نظم کا نفاذ ہو۔ قانون کی اصل۔

(۴) ساتھ چلنے والی چیز، لازم آنے والی چیز۔

(۵) اتباع، حکومت، نافذہ۔

چنانچہ اسی لئے وہ علاقۂ زمین جہاں یہ نظم قائم کر دیا جائے اسے مدینہ کہتے ہیں۔ یہی اصلی سبب ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت اور میثاق مدینہ کے بعد یثرب کے نام کے مدینہ کر دیئے جانے کا۔ جہاں تک مدینہ بمعنی شہر کے ہے تو اس معنی کا عربی مبین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب لوگ اس کو تفسیر میں استعمال کر کے قرآن سمجھنا یا سمجھانا چاہتے ہیں (مثلاً سورۃ الکہف آیت ۱۹ یا سورۃ المجمل ۲۸، القصص ۱۵، ۱۸، ۲۰ وغیرہ) تو قرآن ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ بیشتر عربی معجمین اور لغت نویس حتیٰ کہ معجم لالفاظ القرآن کے مصنف نے بھی لفظ مدینہ کو دن، دان، دین کے ذیل میں نہ لکھ کر م کے تحت درج کیا ہے۔ علوم اسلامی میں

www.bookstube.net www.urdutube.net prepared by M. Aamir Mehmood www.urdumovies.net www.asiaalam.net

تحقیق کی کیا روایت، تاریخ اور عادت رہی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو جاتا ہے۔ تفو بر تو اے چرخ گرددں تفو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علی نبینا الصلوٰۃ والسلام نے اقامت ملک کے لئے تفویض الی اللہ، اقامت ذبح عظیم، اقامت ختنہ، یعنی اقامت ازالۂ غرل، اقامت صلوٰۃ یعنی اقامت ملک اللہ کے بعد اقامت دین اللہ فی الارض فرمائی۔ پوری روئے ارض پر اللہ تعالیٰ کے 'ملک' (Authority) کو اس یثاق کی روشنی میں قائم کرنا دراصل اقامت دین اللہ فی الارض ہے۔ یعنی روئے ارض پر وہ انتظامیہ اور اس انتظامیہ میں وہ نافذ العمل قانون جو 'ملک اللہ' کی ترجمانی کرتے ہوں اور اس پر قائم، اس کو اپنے اوپر نافذ العمل رکھنے والے اور اس کا اتباع کرنے والے افراد کے وجود کو حقیقی صورت دینا۔ اس لئے اقامت دین اللہ فی الارض کا دوسرا نام اقامت ملت ابراہیمی بھی ہے۔ اسی ملت ابراہیمی کا دوسرا نام امت مسلمہ ہے۔ اس لئے کہ اس ملت ابراہیمی کا شعار اسلام تھا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العلمین (البقرہ ۱۳۱)

ترجمہ: یاد کرو جب اس کو کہا اس کے رب نے کہ حکم برداری کر تو بولا کہ میں حکم بردار ہوں تمام عالم کے رب کا۔

حضرت ابراہیم نے اس اقامت دین اللہ فی الارض کئے جانے اور اسی کے لئے اپنی ذریت کے چن لئے جانے کی دعا کی تھی۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے اس کی اقامت ان کے ہاتھوں فرما دی تو آپ نے اپنی ذریت کو اس کی وصیت کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کے لئے پابند ہیں کہ روئے ارض پر اس اقامت دین اللہ کو قائم رکھیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

ووصی بھا ابراھیم بنیہ ویعقوب یبنی ان اللہ اصطفی لکم الدین فلا تموتن الا وانتم مسلمون (البقرہ ۱۳۲)

ترجمہ: اور یہی وصیت کر گیا ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب بھی کہ اے بیٹو بے شک اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو دین سو تم ہر گز نہ مرنا مگر مسلمان۔

حضرت ابراہیم نے ان تمام لوگوں کو جو اس ملت ابراہیمی کا حصہ ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ کی تلقین یاد دلائی کہ اس روئے زمین پر کامیابی کی واحد صورت 'ملک اللہ' اور اس پر قائم 'انتظامیہ' کو تھامے رکھنا ہے۔ جو اسے چھوڑ دے گا یا اس میں ناکام ہو جائے گا وہ خسران کا سودا کرے گا۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asaradan.net

قرآن کا ارشاد ہے:

ومن یرغب عن ملة ابراهیم الامن سفه نفسه ولقد اصطفینه فی الدنیا وانه فی الاخرة لمن الصلحین (البقره ۱۳۰)

ترجمہ: اور کون ہے جو پھرے ابراہیم کی ملت سے مگر وہی کہ جس نے احمق بنایا اپنے آپ کو اور بے شک ہم نے ان کو منتخب کیا دنیا میں اور وہ آخرت میں نیکوں میں ہیں۔

اقامت بیت اللہ علی الارض

حضرت ابراہیم نے 'ملک اللہ' کی اقامت کی عظیم مہم کو آگے بڑھاتے ہوئے روئے ارض پر اسی مقام کو جو 'بیت محرم' تھا اللہ تعالیٰ کے حکم سے منتخب کر لیا تا کہ ابلیس کے منہج فساد ملک کے مرحلے میں اسے 'ملک اللہ فی الارض'، دین اللہ فی الارض اور ملت ابراہیمی کا مرکز، نشان اور علامت قرار دے کر اس کی تعمیر کریں تا کہ وہ مرئی طور پر بھی مرکز قرار پائے۔ جس طرح کسی مملکت میں ایک شہر ہوتا ہے جو ملک کی راجدھانی اور دارالسلطنت قرار پاتا ہے اور اس دارالسلطنت میں ایک محل ہوتا ہے جو بادشاہ کا محل کہلاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پوری روئے ارض میں اللہ کا جو 'ملک' قائم کیا گیا ہے اس کی راجدھانی مکہ ہے اور پھر اس راجدھانی میں بادشاہ کا محل 'بیت اللہ' قرار دیا گیا اور اس کی تعمیر کا حکم حضرت ابراہیم کو ہوا۔

چنانچہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسمعیل علیھما السلام کو ساتھ لیا اور اس بیت اللہ کی تعمیر فرمائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے گئے اس حکم کی غرض و غایت کو خوب سمجھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس 'بیت' کی تعمیر کیوں کرانا چاہتا ہے۔ اور اس کے بعد معرکۂ خیر و شر روئے ارض پر کیا صورت اختیار کرے گا اور اس صورت میں انہیں کیا کرنا ہے حتیٰ کہ وہ اس عظیم ذمہ داری کو بھی خوب سمجھ رہے تھے جو ان کے توسط سے پورے بنی نوع انسان کے کاندھوں پر آنے والی تھی۔

حضرت ابراہیم خوب جانتے تھے کہ پیش نظر مرحلے میں خیر و شر کی لڑائی 'فساد ملک' کے تناظر میں روئے ارض پر 'ملک' (Authority) کے لئے لڑائی ہو جائیگی اور اس کا مرکز صرف یہی نہیں کہ بیت اللہ قرار پائے گا بلکہ اب یہ لڑائی دراصل 'معرکۂ بیت اللہ' کی صورت اختیار

کر لے گی۔ چنانچہ آپ نے دعا فرمائی:

واذیرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم. ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امة مسلمة لک وارنا مناسکنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم. ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم ایتک ویعلمھم اللکتاب والحکمة ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم (البقرہ ۹۔۱۲۷)

ترجمہ: اور یاد کرو جب اٹھاتے تھے ابراہیم بنیادیں 'البیت' کی اور اسمٰعیل اور دعا کرتے تھے اے پروردگار ہمارے! قبول کر ہم سے بے شک تو ہی ہے سننے والا جاننے والا۔ اے پروردگار ہمارے! اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک امت فرمانبردار اپنی۔ اور بتلا ہم کو ہمارے مناسک اور معاف کر ہم کو بے شک تو ہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان۔ اے پروردگار ہمارے! اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں کا کہ تلاوت کرے ان پر تیری آیتیں اور سکھلا دے ان کو کتاب اور حکمت اور پاک کرے ان کو بے شک تو ہی ہے بہت زبردست بڑی حکمت والا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بھی قبول فرمالی۔ حالات وواقعات کی ترتیب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو جب بھی کوئی حکم دیا گیا انہوں نے اسے پورا فرمایا اور پورا فرما کر ایک دعا کی اور وہ دعا قبول کر لی گئی اس لئے کہ وہ دعا خود اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی تھی۔ یا اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب بھی حضرت ابراہیم کو کوئی حکم دیا گیا انہوں نے اس کی غایت اور اللہ کی رضا کا اندازہ لگالیا اور اسی کو اپنی طلب بنا کر پیش کیا۔ چونکہ وہ طلب ہی اللہ کی رضا تھی لہٰذا اسے اللہ تعالیٰ نے خوب خوب درجہ میں قبول فرمالیا۔ اللہ کی رضا اور بندے کی رضا کا یہ انداز اور ایسا توافق حضرت ابراہیم کی ذات کے علاوہ شاید ہی کہیں اور نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے جسم وجان کا ایک ایک بال اور ایک ایک عضو اللہ تعالیٰ کے لئے سراپا نیاز تھا اور سپردگی کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم واقعی اللہ رب العزت کے لئے یکسو (حنیف) تھے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو سمجھتے ہوئے جہاں بیت اللہ کی تعمیر کی وہیں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوئے:

www.booksube.net
prepared by M Aamir Mehmood
www.asfaraam.net

واذ قال ابراهیم رب اجعل هذا بلدا آمنا وارزق اهله من الثمرات من آمن منهم بالله والیوم الآخر (البقرہ ۱۲۶)

ترجمہ: اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب! بنا اس کو بلد امن کا اور روزی دے اس کے رہنے والوں کو میوے جو کوئی ان میں سے ایمان لا دے اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی دعا قبول فرمائی جبکہ دراصل یہ خود اللہ رب العزت کی ہی مرضی تھی جو دعا کی صورت میں حضرت ابراہیم کی زبان مبارک پر جاری ہوئی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو آگاہ فرمایا کہ اس نے اس 'بیت اللہ' کو درج ذیل مقام عطا فرمایا ہے:

(۱) مثابۃ للناس: اللہ تعالیٰ نے 'بیت اللہ' کو ساری روئے ارض کے تمام لوگوں کے لئے مثابۃ بنا دیا ہے۔

(۲) امنا: اللہ تعالیٰ نے 'بیت اللہ' کو تمام مطیع مخلوقات کے لئے جائے امن قرار دے دیا ہے۔

لہذا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اب اسی بیت اللہ کو مثابۃ للناس اور امنا بنا دیا ہے اس لئے وہ اس جگہ کو 'مصلی' بنالیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرح بیت اللہ کو روئے ارض پر آباد پوری انسانی آبادی کے لئے 'مصلی' قرار دے دیا۔

اقامت حج، اقامت مناسک یا اقامت تکمیل صلاۃ

'اقامت ملک' کی آخری کڑی اور ایک بڑی عزیمت کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ روئے ارض پر 'ملک اللہ' کو پوری طرح نافذ کر دیں۔ اور اس 'ملک اللہ' کا اعلان کر دیں اور دنیا کے تمام انسانوں کو اس 'ملک اللہ' کے مان لینے اور اس کا عملی اظہار کرنے یعنی 'صلوٰۃ' قائم کرنے اور 'صلوٰۃ الصلوات' یعنی 'حج' ادا کرنے کی طرف بلائیں۔

روئے ارض پر ابلیس کے اس نئے منہج 'فساد ملک' کے خلاف یہ تھی حضرت ابراہیم کی وہ ارض گیر کوشش جو آپ نے اللہ تعالیٰ کے ہدیٰ کی روشنی میں روئے ارض پر سرانجام دی۔ اس آخری تکمیل عزیمت کا ذکر کرتے ہوئے اور اس کی باریکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

یوں بیان فرمایا:

واذبوانا لابراھیم مکان البیت ان لاتشرک بی شئیا وطھر بیتی للطائفین والقائمین والرکع السجود واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق لیشھدوا منافع لکم و یذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علی مارزقھم من بھیمۃ الانعام. فکلو امنھا اطعموا البائس الفقیر. ثم لیقضوا تفثھم ولیو فوا نذورھم ولیطو فو ابا لبیت العتیق. ذلک ومن یعظم حرمت اللہ فھو خیر لہ عندربہ (الحج ۳۰۔۲۶)

ترجمہ: اور جب ٹھیک کردی ہم نے ابراہیم کو جگہ اس گھر کی کہ شریک نہ کرنا میرے ساتھ کسی کو اور پاک رکھ میرا گھر طواف کرنے والوں کے لئے اور کھڑے رہنے والوں کے اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے اور پکار دے لوگوں میں حج کے واسطے کہ آئیں تیری طرف پیروں چل کر اور سوار ہو کر دبلے دبلے اونٹوں پر چلے آئیں راہوں دور سے تا کہ پہنچیں اپنے فائدے کی جگہوں پر اور پڑھیں اللہ کا نام کئی دن جو معلوم ہیں ذبح پر چوپایوں مواشی کے جو اللہ نے دیئے ہیں ان کو سو کھاؤ اس میں سے اور کھلاؤ برے حال کے محتاج کو۔ پھر چاہئے کہ ختم کر دیں اپنا میل کچیل اور پوری کریں اپنی منتیں اور طواف کریں۔ اس قدیم گھر کا۔ یہ سن چکے اور جو کوئی بڑائی رکھے اللہ کی حرمتوں کی سو وہ بہتر ہے اس کے لئے اپنے رب کے پاس۔

یہ اقامت حج عالمی اور انسانی تھی اور پوری روئے زمین میں باضابطہ اور کامل طور پر 'ملک اللہ' کی خالص بنیادوں پر قائم 'حکومت الہیہ' 'حکومۃ اللہ' 'مملکۃ اللہ' یا 'الحکم' کی حتمی صورت تھی۔ اور اس اقامت کے بعد 'الحکم' اور 'ملک اللہ' کے لئے تمام انسانوں سے کامل سپردگی کا مطالبہ ہوا۔ کامل سپردگی کیا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی جس کے چار اجزاء تھے:

(۱) اجعلنا مسلمین لک یعنی اللہ اور اس کے 'ملک' کے سامنے کامل قلبی سپردگی۔

(۲) ارنا مناسکنا یعنی اس کامل قلبی سپردگی کا کامل عملی اظہار۔

(۳) تب علینا اس کامل سپردگی میں قلبی، قولی اور عملی اظہار میں اگر کوتاہی ہو جائے تو اس سے مغفرت۔

(۴) ابعث فیہم رسولا صفات مذکورہ سے متصف 'اس' رسول کی اسی ملۃ میں بعثت۔

یہاں ہم سردست چوتھی دعا سے صرف نظر کرتے ہیں اور بالخصوص دوسری دعا کو زیر بحث لاتے ہیں:

'نسک' کیا ہے؟

علوم اسلامی اس مقام پر بھی اسی المناک حادثے سے دوچار ہے جس کا تذکرہ اس عاجز نے 'صلوٰۃ' کے تناظر میں کیا تھا۔

'نسک' کے معانی عربی مبین میں درج ذیل ہیں:

(۱) انڈیلنا، پیش کرنا، نذر کرنا، حوالے کرنا

(۲) خون انڈیلنا، خون پیش کرنا، خون نچھاور کرنا

(۳) قربانی،

چنانچہ نسک سے مراد بندے کی جانب سے اللہ تعالیٰ کو اپنی زندگی کی ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان اور اپنا خون انڈیل کر پیش کر دینا ہے۔ جب حج کے تناظر میں منسک کا ذکر ہو تو اس کا مفہوم اور بھی مخصوص اور وسیع ہو جاتا ہے۔ حج دراصل پوری روئے زمین پر 'ملک اللہ' کو تسلیم کرنے اور اس 'ملک اللہ' کے تئیں اپنی کامل سپردگی کا اظہار کرنے کا نام ہے۔ حج پوری روئے ارض میں ملک اللہ کا اعلان اور اس کے بالمقابل 'ملک' کے دعویدار یا دعویداروں کے خلاف اعلان براءت اور اعلان جنگ کا اظہار ہے۔ اور اس موقع پر 'منسک' گویا اس بات کا عملی اظہار ہے کہ اس 'ملک اللہ' کے لئے بندہ اور ملت ابراہیمی جو اس کی باضابطہ ذمہ دار ہے اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کو تیار ہے بلکہ اس کے سوا اس کا روئے ارض پر کوئی دوسرا فرض منصبی ہے ہی نہیں۔ سچ جانئے تو ایک مومن بلکہ پوری امت مسلمہ کو زیست کے لئے کمانے کی ضرورت ہے نہ دوڑ دھوپ کرنے کی بلکہ وہ اس فوجی اور فوج کی طرح کی ہے جو اپنے گھر سے دور فوجی کیمپ میں یا لڑائی کے میدان میں ہو جس کا کھانا پلانا حکومت کے ذمہ ہے۔ اور اس فوج کا کام تو صرف اس حکومت کے لئے جنگ کرنا ہے اور اس کے احکام بجالانا ہے اور اس حکومت کے 'ملک' (Authority) کو ہر طرح کے چیلنج سے محفوظ رکھنا ہے۔

بحیثیت فرد حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے لوگوں کے لئے نمونہ ہیں جو اپنے اوپر اس کا

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarafam.net

عملاً نفاذ کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین (الانعام ۱۶۲)

ترجمہ: کہہ دو بے شک میری صلاۃ اور میرا نسک اور میری زندگی اور میری موت اللہ رب العزت کے لئے ہے۔

یہ حضرت ابراہیم ہی تھے جنہوں نے اقامت ایمان سے اقامت مقام تک پھر اقامت مقام سے اقامت صلوٰۃ تک، پھر اقامت صلوٰۃ سے اقامت ذبح عظیم تک اور اقامت ذبح عظیم سے اقامت ملک اللہ تک اور پھر اقامت ملک اللہ سے اقامت حج تک اس کامل سپردگی کا نمونہ پیش کیا جو روئے ارض پر بندے کا معیار مطلوب ہے۔

یہاں واضح رہے کہ اقامت مقام کا اقامت صلوٰۃ تک اور وہاں سے اقامت حج تک پہنچنا اور دوسری طرف اقامت ذبح عظیم کا اقامت نسک تک اور وہاں سے اقامت حج تک پہنچنا غور طلب ہے۔ یہ وہ تسلسل ہے جو روئے ارض پر مومن کی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

صلاتی محیای

مومن للہ رب العالمین

نسکی مماتی

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ حضرت ابراہیم نے اپنی اس انفرادی حیثیت سے آگے جا کر اس درجے کا کارنامہ انجام دیا جو ایک فرد نہیں بلکہ ایک امت انجام دیتی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس مہم کو کتنی قومیں انجام دینے سے قاصر رہیں اسے حضرت ابراہیم نے تنہا انجام دے دیا۔ چنانچہ قرآن نے ارشاد فرمایا کہ ابراہیم اپنے آپ میں ایک امت ہیں۔

ان ابراھیم امتاً قانتا للہ

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اقامت حج کی اس عزیمت عظمیٰ پر حضرت ابراہیم پر انعامات کی بارش کر دی۔ اور انہیں سب سے بڑا انعام یہ عطا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے معرکۂ خیر و شر میں ابلیس کے بالمقابل حق کی علمبرداری اور قیادت کے لئے آپ اور آپ کی ذریت کو مجتبیٰ بنالیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کا عہد لیا:

وعھدنا الی ابراھیم واسمعیل ان طھرا بیتی للطائفین والعکفین

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarulaman.net

والرکع السجود (البقرہ ۱۲۵)

ترجمہ: اور حکم کیا ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو کہ پاک کر رکھو میرے گھر کو واسطے طواف کرنے والوں کے اور اعتکاف کرنے والوں کے اور رکوع اور سجود کرنے والوں کے۔

یہ وہی وعدہ ہے جس کی تفصیل سورۃ الانعام میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

قل اننی ھدانی ربی الی صراط مستقیم دینا قیما ملة ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین. قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للله رب العلمین لاشریک له وبذلک امرت وانا اول المسلمین. قل اغیر الله ابغی ربا وھورب کل شئ ولا تکسب کل نفس الاعلیھا ولا تزر وازرۃ وزراخریٰ ثم الی ربکم مرجعکم فینبئکم بما کنتم فیه تختلفون. وھو الذی جعلکم خلائف الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجت لیبلوکم فی ماآتکم ان ربک سریع العقاب وانه لغفور رحیم (الانعام ۵_۱۶۱)

ترجمہ: اے محمد، کہو میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے۔ بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں۔ ابراہیم کا طریقہ جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو میری 'صلاۃ' اور میرا 'نسک' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا۔ اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے۔ اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔

www.booksurdutube.net
prepared by M. Aamir Mehmood

ابلیسی جوابی حملہ

ابلیس کا جوابی حملہ اور تدابیر ابراہیم

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جب اللہ تعالیٰ نے اقامت ختنہ یا اقامت ازالۂ غرل کا فیضان فرمایا تو حضرت ابراہیم نے منشاء ربانی کو سمجھ لیا۔ اس وقت آپ کی عمر شریف ننانوے سال کی تھی۔ آپ نے سمجھ لیا کہ اللہ رب العزت روئے ارض پر اب جلد از جلد اقامت ملک اللہؑ دیکھنا پسند کرتا ہے۔ لہذا آپ نے کمال سرعت کے ساتھ سارے کام انجام دیئے۔ چنانچہ آپ نے طوفان کی سی تیزی کے ساتھ اقدامات کئے اور صرف ایک سال کی مدت میں درج ذیل امور کی اقامت فرمائی:

(۱) اقامت صلوٰۃ یا اقامت ملک اللہ

(۲) اقامت دین اللہ فی الارض یا اقامت ملت ابراہیمی

(۳) اقامت بیت اللہ علی الارض

(۴) اقامت حج، اقامت مناسک یا اقامت کمال صلوٰۃ

جس وقت آپ اقامت حج سے فارغ ہوئے اس وقت آپ کی عمر شریف کے سو سال ہونے میں کچھ مہینے باقی تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ حضرت ابراہیم کی تفویض الی اللہؑ کے عمل سے اور پھر اس کے بعد تعیین بیت، حضرت اسمٰعیل کے وہاں بسائے جانے اور اللہ تعالیٰ کے ملائکہ کے ذریعہ تلقین حراسے ابلیس نے اندازہ لگالیا کہ یا تو اللہ تعالیٰ کو اور اس کے ذریعہ حضرت ابراہیم کو اس تبدیلی منہج اور نئے منہج ابلیس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگیا ہے یا پھر اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ ابلیس کے خلاف کوئی بڑا اقدام کرنے کی تیاری کروا رہا ہے۔ بعد کے حالات میں جب اقامت ذبح عظیم کے بعد حالات نے سرعت کے ساتھ موڑ لینا شروع کردیا تو ابلیس کلیتاً حواس باختہ ہوگیا۔ اور اس نے بدحواسی میں مخالفانہ اور انہدامی اقدامات کا آغاز کردیا۔ اس نے اس بات کی کوشش کی کہ حضرت ابراہیم کی صفوں میں برہمی پیدا ہوجائے۔

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asarealam.net

فتنۂ ارتداد

ابلیس کا سب سے پہلا حملہ سدوم اور گمورہ میں فتنۂ ارتداد کے برپا کرنے کی صورت میں سامنے آیا ۱؎ ۔ یہ بات عرض کی جا چکی ہے سلطنت سدوم اور سلطنت گمورہ حضرت ابراہیم کی ملت میں یا انکے حلفاء میں سے تھیں۔ اور یہاں کے اعتقادی اور اخلاقی سربراہی اور رہنمائی کی لئے حضرت لوط علیہ السلام بھیجے گئے تھے جو رسالت کے اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہدی اور ان کی سنت کے پابند تھے۔ ابلیس نے اس خطے میں ارتداد کا آغاز کیا۔ وہ ارتداد اخلاقی خرابی کی صورت میں پیدا ہوا اور اس نے دیکھتے دیکھتے بھیانک روپ اختیار کرلیا۔ چنانچہ باوجود اس بات کے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط اس خرابی کے ازالے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے فاسقین نے سارے حدود پامال کردیئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے تباہ کردیئے کا فیصلہ کرلیا۔ اور اس کی اطلاع لیکر فرشتے حضرت ابراہیم کے پاس پہنچے۔ کسی رسول کے لئے اس کی امت یا امت دعوت کی تباہی کی خبر اور وہ بھی حضرت ابراہیم جیسے اولوالعزم رسول کی امت دعوت کی تباہی کی خبر کتنی گھبرادینے والی ہوسکتی ہے اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے اولوالعزم رسول نے ان ملائکہ سے اور پھر اللہ تعالیٰ سے طرح طرح سے درخواست کی تاکہ اس فیصلہ پر عمل درآمد نہ کیا جائے اور اسے موخر کردیا جائے۔ مگر ملائکہ نے صاف صاف بتادیا کہ قوم لوط کے تباہ کردیئے جانے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ اب اسے بدلنے والا نہیں۔ واقعات کی ترتیب (مثلاً سورۂ ہود آیات ۸۳۔۶۹ اور الحجر ۷۷۔۵۱) ایک حیرتناک بات کا انکشاف کرتی ہے:

(۱) ملائکہ نے پہلے حضرت اسحٰق کی پیدائش کی بشارت دی پھر قوم لوط کی تباہی کی خبر۔

آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس ترتیب میں کون سی مصلحت پوشیدہ ہے؟

(۲) ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ حضرت ابراہیم جیسے حلیم، اواہ اور منیب رسول کو جب یہ خبر پہنچے گی تو وہ بے حد بے قرار ہوجائیں گے چنانچہ اس خبر سے قبل انہیں تعجب، خوشی اور حیرت کی حالت میں لا دیا جائے۔ یا پھر اس کی غرض یہ ہوسکتی ہے کہ انہیں پچھلے کاموں کے تعلق سے ظاہری ناکامی کی طرف متوجہ رہنے کے بجائے اگلے میدان کار کی طرف متوجہ کردیا جائے۔

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

(۳) ممکن ہے اس بشارت میں ایک طرف تو ایک تسکین کا اظہار ہو کہ قوم لوط کی تباہی حضرت ابراہیم کی کوششوں کی ناکامی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ان سے بے حد خوش ہے یہ تو خود اہل سدوم وگمورہ کی بدبختی ہے جو انہیں اس انجام تک لے جارہی ہے۔ جہاں تک حضرت ابراہیم کی بات ہے تو اللہ ان سے خوش ہے اور اگر وہ ایسا سمجھتے ہیں کہ ان کی ملت کا ایک حصہ ضائع کیا جارہا ہے تو اللہ انہیں اس کے بدلے اپنے فضل خاص سے ایک اور امت دینے کا وعدہ کرتا ہے جو اسحاق سے آگے بڑھے گی۔

(۴) ممکن ہے اس بشارت میں حضرت ابراہیم کو اقامت ملک اللہ کی ایک اور راہ بتائی گئی ہو کہ اگر ابلیس نے حملہ کر کے ان کی ایک صف کو برہم کر دیا ہے تو اس کے خلاف اللہ ابراہیم کو ایک اور بازو عنایت کر رہا ہے۔

حالات تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ دوسرے ہی دن سدوم وگمورہ تل پٹ کر دیئے گئے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرتے تھے کہ حضرت اسحٰق کی ولادت ہوئی۔ اسوقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر شریف سو سال کے قریب تھی۔

جب حضرت سارہ کا انتقال ہوا تو حضرت ابراہیم کی عمر شریف ایک سو تیس (۱۳۰) سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ آپ نے حضرت اسحٰق کی شادی اپنے بھائی نخر کی دختر رفقہ سے کر دی۔ آخری عمر میں حضرت ابراہیم نے ایک اور خاتون حضرت قطورہ سے شادی کی۔ یہ امر نہایت غور طلب ہے کہ حضرت ابراہیم نے حضرت قطورا سے کیوں شادی کی؟۔ اللہ کے اس اولوالعزم رسول نے کوئی بھی کام عظیم مصلحت دینی کے بغیر نہیں کیا۔ لہذا یقیناً انہوں نے یہ امر بھی کسی عظیم دینی مصلحت کے بغیر نہیں کیا ہوگا۔

حضرت یعقوب و حضرت یوسف علیہما السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بے مثال عزیمتوں نے ابلیس کو بے حد پریشان کر دیا۔ اس کی اسی پریشانی کا دل برداشتہ ردِعمل تھا جو ارتداد قوم لوط کی شکل میں سامنے آیا لیکن ابلیس کی کوششوں کو اس وقت سخت ترین دھچکا لگا جب اس نے دیکھا کہ اس کی کوششیں اخلاقی فساد کی صورت میں ظاہر ہوئیں جو دراصل خلق اور فطرت کے خلاف عمل قرار دی گئیں اور اس طرح ان کو تباہ کر دینے کا حکم صادر ہو گیا اور دیکھتے دیکھتے قوم لوط صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئی۔

'منہج فساد ملک' کے اس مرحلے میں ابلیس کے لئے سب سے مشکل مرحلہ اس کی تعمیل کا تھا۔ چنانچہ اس نے اس کی منصوبہ بندی کی کہ اس مشن کو روبہ عمل لانے کے لئے اگر خارجی قوت کے بجائے داخلی قوت استعمال کی جائے تو یہ بات زیادہ آسان اور مفید مطلب ثابت ہوگی۔ یہ ابلیس کی مجبوری بھی تھی اور ایک اعتبار سے تدبیر کی خوبی بھی۔ خارج میں اب اس کے مددگار کم ہی بچ رہے تھے جو اس کی مدد کرتے۔ دوسری جانب اس صورت سے اسے دو فائدے ہوتے۔ اولاً یہ کہ اسے اپنے کام کے لئے آلۂ کار اندر سے ملتے۔ دوم یہ کہ اس میں اسے جتنی کامیابی ملتی حق کی قوت اتنی ہی کم ہوتی جاتی۔ یعنی یہ منصوبہ بندی کہ حق کے علمبرداروں کو ہی ابلیس کے کاموں کے کرنے کے لئے داخل دفتر کیا جائے۔ چنانچہ ابلیس نے اس کوشش کا آغاز کر دیا۔ اس کوشش اور ترکیب کا نام قرآن میں نزغ اور احادیث میں نزع [۲۲] ہے۔ جو عربیٔ مبین کے مطابق ایک ہی لفظ ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بعثت سے غالباً قبل یا بعثت کے وقت اللہ تعالیٰ نے رویاء کے ذریعے حضرت یعقوب علیہ السلام کو بشارت دی کہ حضرت ابراہیم نے جس 'ملک اللہ' کا قیام فرمایا تھا اور جس کے مطابق حضرت اسحٰق علیہ السلام نے کوششیں جاری رکھی تھیں تاکہ روئے ارض کے اس خطے میں جہاں وہ آباد ہیں۔ انہیں خطوط پر باضابطہ ایک ایسی مملکت قائم ہو جائے جو حکومت اللہ یا حکومت الٰہیہ ہو اس کی تکمیل اللہ تعالیٰ حضرت یعقوب کے ہاتھوں کروائے گا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے دیکھا کہ زمین اور آسمان کے مابین ایک زینہ لگایا گیا ہے اور اس

کے ذریعہ ملائکہ چڑھ اور اتر رہے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ ابلیس نے حضرت یعقوب کی کوششوں کے طریقۂ کار کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس نے اسی نئی ترکیب کا تجربہ کیا جس کا ذکر ابھی کیا گیا یعنی نزغ۔ اس عنوان سے اس کی کوشش یہ تھی کہ کیوں نہ حضرت یعقوب کے ان قریبی افراد کو جو اس کام میں ان کے شریک کار ہیں فتنہ میں ڈال دیا جائے۔ اور فتنہ یہ کہ ان کے دلوں کو متاثر کر کے انہیں آپس میں ہی دست و گریباں کر دیا جائے تا کہ ایک طرف تو وہ آپس ہی میں لڑنے لگیں اور حق کی طاقت جو اقامت ملک اللہ کے لئے استعمال ہوتی وہ آپس میں ہی ٹکرا کر ضائع ہو جائے اور دوسری یہ کہ خود حق کے علمبرداروں کو اپنے مقاصد یعنی ملک اللہ کو قائم ہونے سے روکنے کے لئے استعمال کر لیا جائے۔

ابلیس کی یہ ترکیب کامیاب رہی اور جب حضرت یعقوب علیہ السلام فیصلہ کن اقدامات کر رہے تھے انہیں اندازہ ہو گیا کہ ان کی بیویوں اور لونڈیوں یعنی حضرت لیہ (Leah)، حضرت راحیل (Raheel)، زلفہ (Zilphah) اور بلہہ (Bilhah) کی اولادیں حضرت راحیل کی اولادوں کو چھوڑ کر جو چھوٹی تھیں طرح طرح کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہو چکی ہیں اور وہ ان کا ساتھ دینا تو دور کی بات اقامت حکومت الہیہ کی ان کوششوں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے اثر و رسوخ اور مرتبے اور اس تحریک کے وقار کو اپنی اخلاقی برائیوں اور دنیاوی مفادات کی تکمیل میں استعمال کرنے لگی ہیں۔ عمر کے اس حصے میں انہیں محسوس ہوا کہ ان کی تحریک گھر ہی میں دم توڑنے لگی ہیں۔ انہیں اس پر بھی تشویش ہوئی کہ آخر اس خواب کا کیا مفہوم ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس تعلق سے دکھایا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و عنایات سے محروم ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے ان حالات میں ایک اولوالعزم نبی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہی حالات تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جو عمر میں چھوٹے اور حضرت راحیل کی اولاد تھے وہ رؤیا دکھایا جس کا ذکر سورہ یوسف میں آیا ہے۔ چنانچہ حضرت یعقوب نے سمجھ لیا کہ ان کے خواب کی تعبیر دراصل حضرت یوسف کے ہاتھوں پوری ہو گی۔ حضرت یعقوب اپنے اردگرد خود گھر کے ماحول میں ابلیس کی چلت پھرت سے واقف ہو چکے تھے چنانچہ آپ نے اس خواب کا ذکر کسی سے بھی کرنے سے حضرت یوسف کو منع فرما دیا۔ لیکن ایسا لگتا

ہے کہ جب حضرت یوسف یہ خواب حضرت یعقوب کو سنا رہے تھے ابلیس نے اسے Intercept کرلیا۔ چنانچہ اس نے اندازہ کرلیا کہ 'حکومت الہیہ' کے قیام کو روکنے کی واحد صورت یوسف کا خاتمہ ہے۔ اسی وقت سے اس عظیم نزغ کا آغاز ہوتا ہے جس پر پوری سورۃ یوسف گواہ ہے (آیت ۱۰۰)

حق کے قافلے کا کیسا المیہ تھا کہ آل ابراہیم میں یعقوب کا گھر جو روئے ارض پر علم اللہ کو تھامنے کا مجاز تھا آج خود اس علم کی اقامت کو سبوتاژ کرنے والا بن گیا۔ آل ابراہیم میں آل اسحٰق اور آل اسحٰق میں آل یعقوب اور آل یعقوب میں حضرت یوسف اور بن یمین کو چھوڑ کر سارے لوگ ابلیس کے نزغ میں گرفتار ہو کر اس میثاق کو پورا کرنے میں کوتاہ ثابت ہونے لگے جس کا ان سے عہد لیا گیا تھا۔

ادھر اللہ تعالیٰ نے مصر میں حضرت یوسف کے ذریعہ ایک طویل آزمائش کے بعد اس حکومت الہیہ کا قیام کروا دیا جس کی بشارت حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کو دی گئی تھی۔ ہر چند کہ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کی غیر معمولی عزیمتوں کے سبب روئے ارض کے ایک حصے میں 'حکومت الہیہ' کا قیام ہو گیا لیکن آل ابراہیم کی شاخ آل اسحاق کی میثاق کے تعلق سے یہ پہلی کوتاہی اور ناکامی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ جب حکومت الہیہ کا قیام ہو گیا تو یہ تمام لوگ تائب ہوئے اور انہیں معاف کر دیا گیا لیکن جہاں تک ایفاء عہد و میثاق کی بات ہے تو بحیثیت مجموعی آل یعقوب اس میں ناکام ہو گئے۔ یہ کوتاہی ناراضگی رب کا باعث ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے دو طرح سے اس پر اپنا تبصرہ فرمایا ہے:

(۱) پہلا تبصرہ اس عہد کی شکل میں ہے جو حضرت یعقوب نے بستر مرگ پر اپنی ان اولادوں سے لیا۔ یہ گویا اس بات کا اظہار تھا کہ وہ انکے طرز عمل سے خوش ہیں نہ ان کو مستقبل کے تعلق سے ان پر اعتماد ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

ام کنتم شهداء اذ حضر يعقوب الموت اذ قال لبنيه ما تعبدون من بعدی قالوا نعبد الهک واله آبائک ابراهيم واسمعيل واسحق الها واحدا ونحن له مسلمون (البقره ۱۳۲)

ترجمہ: کیا تم اس وقت موجود دیکھ رہے تھے جب یعقوب پر موت طاری ہو رہی تھی اور وہ اپنے

بیٹوں سے کہہ رہا تھا کہ تم میرے بعد کس کی بندگی کرو گے؟ بیٹوں نے کہا ہم لوگ بندگی کریں کے آپ کے اور آپ کے آبا ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق کے رب کی۔ اکیلا الہ اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔ مگر ہر چند کہ انہوں نے حضرت یعقوب سے تجدید وعدہ کرلیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ وہ اس کے پورا کرنے میں ناکام ہوئے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن کا ارشاد ہے:

تلک امة قد خلت لها ما کسبت (البقرہ ۱۳۴)

ترجمہ: وہ ایک امت تھی جو گزر چکی ان کے واسطے ہے جو انہوں نے کیا۔

(۲) دوسرا تبصرہ اس سخت طرز بیان کی صورت میں سامنے آیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد تسلسل میں فصل ڈال دیا۔ اور پھر اسباط کا ذکر کر کے پھر فصل ڈال دیا۔ قرآن کی گہرائیوں سے واقف حضرات خوب جانتے ہیں کہ قرآن کا ایسا اظہار کن نزاکتوں کو بتاتا ہے۔ قرآن یہ بات یہودیوں کے کرتوتوں کو بیان کرتے ہوئے ظاہر کر رہا ہے اور اہل ایمان سے کہا جا رہا ہے کہ آپ یہ بات کہدیں:

قولوا آمنا بالله وما انزل الینا وما انزل الی ابراهیم واسمعیل واسحق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسی وعیسی وما اوتی النبیون من ربهم لا نفرق بین احد منهم ونحن له مسلمون (البقرہ ۱۳۶)

ترجمہ: تم لوگ کہدو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ نازل ہوا ہماری طرف اور جو کچھ نازل ہوا ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کے اسباط کی طرف اور جو کچھ بھیجا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کی طرف اور جو کچھ بھیجا گیا نبیوں کی طرف ان کے رب کی جانب سے۔ ہم ان میں کسی کے مابین فرق نہیں کرتے اور ہم لوگ فرماں بردار ہیں اس کے۔

یہاں حضرت یعقوب و حضرت یوسف علیہما السلام کی 'اقامت حکومت الٰہیہ' کی کوشش، ابلیس کی ان کو روکنے کی کوشش اور بیشتر آل یعقوب کا اس تعلق سے عدم ایفاء عہد بلکہ ابلیس کے نزغ کے تحت اس کوشش کو سبوتاژ کرنے کی کارروائی کے تناظر میں چند باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ضرورت دراصل اس لئے پیش آئی ہے کہ دین اللہ اور معرکۂ خیر و شر اور تاریخ رسالت و نبوت سے لاعلمی نے ہمارے علماء کرام اور بالخصوص مفسرین کو کن کن صحراؤں میں بھٹکا دیا ہے کہ الامان والحفیظ۔ مثلاً مقصد و تعبیر خواب کی بحث، سجدۂ تعظیمی کی بحث، دین الملک کی

www.booktube.net
Prepared by M. Aamir Mehmood
www.urdunovels.net

بحث، حکومت الٰہیہ اور حکومت باطلہ کا کیا فرق ہے اور یہ کہ نظام باطل سے تعاون ہو سکتا ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ کی لایعنی بحثیں۔

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

(۱) قرآن کا ارشاد ہے :

اذ قال یوسف لابیہ انی رایت احد عشر کوکبا والشمس والقمر رایتھم لی سجدین (یوسف ۴)

ترجمہ: جب کہا یوسف نے اپنے باپ سے اے باپ! میں نے دیکھا خواب میں گیارہ ستاروں اور سورج کو اور چاند کو میں نے ان کو دیکھا اپنے واسطے سجدہ کرتے ہوئے۔

ہمارے مفسرین نے اس آیت کو پہلے آیت ۱۰۰ میں بیان کردہ 'ھذا تاویل رءیای من قبل (یہ بیان ہے میرے اس پہلے خواب کا) سے جوڑا اور پھر اس کا جوڑ لگا دیا اسی آیت میں بیان کردہ 'وخروا لہ سجدا' سے اور اس کے مفہوم کو اس طرح لیا:

(۱) (وخروا لہ) یعنی الاخوۃ الاحد عشر والابوین (سجدا) (الزمخشری: الکشاف)

ترجمہ: یعنی گیارہ بھائیوں اور والدین نے سجدہ کیا (یوسف کو)

(۱) 'یوسف نے اپنی طرف سے والدین کی تعظیم کی، تخت پر بٹھلایا لیکن خدا کو یوسف کی جو تعظیم کرانی تھی اسے یوسف کب روک سکتے تھے۔ اس وقت کے دستور کے موافق ماں باپ اور سب بھائی یوسف علیہ السلام کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔ یہ سجدۂ تعظیمی تھا جو بقول حافظ عمادالدین ابن کثیر آدم کے زمانے سے مسیح علیہ السلام کے عہد تک جائز رہا۔۔۔۔ بعض کہتے ہیں یہ سجدہ یوسف کو نہ تھا بلکہ یوسف کی عزت و عظمت دیکھ کر سب نے خدا کے سامنے سجدۂ شکر ادا کیا۔ اس تقدیر پر وخروا لہ میں لام سببیہ ہوگا یعنی یوسف کے عروج و اقتدار کے سبب سے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔۔۔۔'

(ترجمہ شیخ الہند و تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی)

اس کی اصل تاویل پوری تفصیل سے بیان کرنا یہاں مشکل ہے اس لئے مختصراً صرف یوں عرض کیا جا سکتا ہے کہ:

(۱) آیت ۴ کا کوئی تعلق ستاروں اور چاند اور سورج کے سجدہ کرنے سے نہیں بلکہ یہ بشارت ہے حضرت یوسف کے ذریعہ 'حکومت ملک اللہ' کے قائم ہونے کی۔

خواب میں ستاروں اور سورج اور چاند کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھنا حقیقت میں سجدہ کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی کوئی تعبیر ہوتی ہے جو حقیقت بن کر آتی ہے۔ مثلاً حدیث شریف میں آیا ہے:

عن ابی بکرہ ان رجلا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رایت کان میزا نانزل من السماء فوزنت انت و ابوبکر فرجحت انت ووزن ابوبکر وعمر فرجح ابوبکر ووزن عمر وعثمان فرجح عمر ثم رفع المیزان فاستاء لها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی فساء ہ ذلک فقال خلافة نبوة ثم یوتی اللہ الملک من یشاء (رواہ الترمذی وابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض گزار ہوا: میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا ایک میزان آسمان سے اتری۔ پس آپ اور حضرت ابوبکر کو تولا گیا تو آپ وزنی رہے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو تولا گیا تو حضرت ابوبکر وزنی رہے حضرت عمر اور حضرت عثمان کو تولا گیا تو حضرت عمر وزنی رہے پھر میزان اٹھالی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا صدمہ ہوا اور فرمایا کہ یہ خلافت نبوت ہے پھر اللہ تعالیٰ اپنا 'ملک' جس کو چاہے دے۔

ظاہر ہے اس میں میزان کا اترنا اور تولا جانا فی الواقع میزان کا اترنا اور تولا جانا نہیں تھا۔ بلکہ خود آنحضور ﷺ کی تشریح کے مطابق خلافت نبوت کا دیا جانا اور اٹھالیا جانا تھا۔

(۲) وخروا لہ سجدا کا مطلب حقیقی طور پر سجدہ کرنا نہیں اور اگر ہے تو بھائیوں اور والدین کا حضرت یوسف کو قطعاً نہیں بلکہ تمام لوگوں بشمول عمائد مصر و کنعان کا اللہ کے حضور سجدہ مراد ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بادشاہ اور عمائد مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بات مان لی اور ان کی سربراہی میں حکومت الہیہ قائم کرنے کو راضی ہو گئے چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی موجودگی میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت تابع نبی کی تھی لہٰذا یہ اقامت دراصل حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھوں حضرت یعقوب علیہ السلام کی

کوششوں کی اقامت تھی۔ چنانچہ جب حضرت یعقوب وہاں پہنچے تو انہیں باضابطہ سربراہ مملکت اور اس مملکت کے روحانی قائد اور موجہ کی طرح تخت مصر پیش کیا گیا۔ یہی مفہوم ہے 'ورفع ابویہ علی العرش' کا اور اس بات پر انقیاد واتباع کے اعتبار سے سبھوں نے سجدہ کیا۔ اور اللہ کے اس 'ملک' کی اقامت پر اطمینان کا اظہار کیا۔ سجدہ نہیں بلکہ 'اقامت ملک اللہ' دراصل وہ بات ہے جس کی طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اشارہ کیا ہے کہ اے والد محترم یہی اقامت حکومت تھی جس کی بشارت اس خواب میں دی گئی تھی اور آج وہ حکومت بفضلہٖ تعالیٰ قائم ہوگئی ہے۔ جسے آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ لہذا انہوں نے 'اقامت ملک اللہ' کی طرف حضرت یعقوب کی کوششوں، ابلیس کی جانب سے ایسا ہونے سے روکنے کی چالوں، حضرت یوسف علیہ السلام کے کنویں میں ڈالے جانے، مصر میں بیچ دیئے جانے، جیل کی مصیبتوں سے گزرنے یہاں تک کہ اپنے ملک سے دور مصر میں حکومت الہیہ کے قائم ہونے کے پورے واقعات کو تفصص (Trace back) کیا کہ کس طرح یہ سب کچھ ہوا۔ لہذا قرآن کا ارشاد ہے:

قد جعلها ربی حقا، وقد احسن بی اذا خرجنی من السجن وجاء بکم من البدو من بعد ان نزغ الشیطن بینی وبین اخوتی، ان ربی لطیف لما یشاء انه هو العلیم الحکیم (یوسف ۱۰۰)

ترجمہ: اس کو میرے رب نے سچا کر دیا۔ اور اس نے انعام کیا مجھ پر جب مجھ کو نکالا قید خانہ سے اور تم کو لے آیا دور سے بعد اس کے نزغ ڈال چکا تھا شیطان مجھ میں اور میرے بھائیوں میں میرا رب تدبیر سے کرتا ہے جو چاہتا ہے بے شک وہی ہے خبردار حکمت والا

اور پھر صاف اظہار کیا:

'رب قد آتیتنی من الملک (یوسف ۱۰۱)

ترجمہ: اے پروردگار! تو نے مجھے ملک دیا۔

(۲) ہمارے اکثر مفسرین نے اور ان کی تفسیروں کی بنیاد پر اکثر علماء کرام نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام یا تو سلطنت مصر میں کسی اونچے عہدے پر ہی سہی نوکر بحال ہوگئے یا شریک سلطنت بن گئے تھے۔ قرآن کے الفاظ وطرز بیان کو اور دین اللہ اور ہدیٰ کے مقصد وجود کو مسخ کرنے اور منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین کی ذات اقدس کی تحقیر

کرنے کی اس سے بڑی مثال شاید ہی مل سکتی ہے۔ یہاں چند سوال قائم ہوتے ہیں:

(۱) قرآن میں غور و فکر کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن کے اظہار بیان کی ایک ترکیب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آفاق و انفس میں کسی ایسی بڑی تبدیلی یا واقعہ یا فیصلہ کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور اس کی نسبت اپنی طرف کرنا چاہے تو وہ 'کذلک' کا استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ آیت ۵۶ میں 'کذلک مکنا' سے کیا مراد ہے؟ نوکر بحال ہو جانا یا شریک سلطنت ہو جانا۔ کیا یہی آفاق و انفس کی وہ محیر العقول تبدیلی یا واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی نسبت اپنی طرف کر رہا ہے؟

(۲) جب ملک نے 'استخلصه لنفسي' (میں خالص کر رکھوں اس کو اپنے کام میں) کہہ کر مقام و منصب خاص الخاص کی پیش کش کر ہی دی تھی مثلاً یہ کہ یوسف کو لے آؤ میں اسے اپنا پرائیوٹ سکریٹری، مشیر خاص، چیف ایڈوائزر، چیف ایگزیکیوٹیو Chief Executive یا وزیر اعظم بنالوں گا تو پھر فلما کلمہ (پھر جب بات چیت کی) سے کیا مراد ہے؟

(۳) فلما کلمہ (پھر جب بات چیت کی) کے جواب میں ملک نے پھر کہا: انک الیوم لدینا مکین امین (چلئے آپ کی ہی بات رہی لیجئے میرے نزدیک آج سے آپ ہی سب چیزوں کے امانت دار ہیں)۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد جیسا کہ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ نوکری پکی ہونے کی تصدیق یعنی استخصله لنفسي کی توثیق ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد حضرت یوسف کے قول اجعلني 'علی خزائن الارض کا کیا مفہوم ہوگا؟ اور اگر یہ استخلصه لنفسي کی توثیق نہیں تو پھر:

(۴) قال اجعلني علی خزائن الارض (زمین اور اس کے سارے خزانے یعنی ملک اور اس کی تمام دولت اور اس کے سارے وسائل میرے حوالے کر دیں) کا کیا مفہوم ہے؟

بہت واضح ہے کہ ملک ایک بحرانی صورتحال سے گزر رہا تھا۔ بادشاہ کے خواب نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ جب حضرت یوسف نے جن کی دعوت ملک کے طول و عرض میں برسوں پہلے پہنچ چکی تھی اور جو ملاء کی سازش کے سبب جیل میں بند تھے بادشاہ سے ملاقات کی تو اس نے ملتے ہی اعلیٰ منصب کی پیش کش کر دی۔ جسے فی الفور آپ نے ٹھکرا دیا اور اپنا مقصد حیات بتایا اور یہ بات باور کرائی کہ خود بادشاہ اور پورے ملک کی خیر اسی میں ہے کہ وہ خدا بیزاری کی روش چھوڑ کر اللہ کی بندگی میں آجائے تا کہ اس خطۂ ارض پر 'ملک اللہ' کی اقامت ہو۔ ساری صورتحال

www.bookstube.net www.urdutube.net prepared by M. Aamir Mehmood www.urdumovies.net www.asraralam.net

سمجھنے کے باوجود بادشاہ اور عمایدِ ملک نے کچھ اور آگے بڑھ کر پیش کش کی تاکہ حضرت یوسف ان کی شرائط پر کوئی منصب قبول کر لیں۔ انہوں نے کہا چلئے سب کچھ آپ کے اختیار میں ہے آپ جو چاہیں کریں۔ لیکن سلطنت ہماری رہے گی۔ آپ نے صاف طور پر ایسی تمام پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ حکومت کے خزانے کی کنجیاں میرے حوالے کر دو۔ قرآن کی بلاغت پر غور کیا جائے۔ آپ نے فرمایا: 'خزائن الارض'. 'خزائن الارض' میں تمام منقولی و غیر منقولی دولت و وسائل ہی نہیں انسانی وسائل (Human Resources) حتیٰ کہ عمایدِ ملک اور بادشاہ سب آ جاتے ہیں۔ اجعلني علی خزائن الارض کا مفہوم بہت واضح ہے یعنی:

''غیر مشروط طور پر پوری سلطنت حتیٰ کہ بادشاہ اپنی ذات بھی اللہ کے خلیفہ حضرت یوسف کے حوالے کرے تاکہ اس خطۂ ارض میں 'حکومت اللہ' قائم ہو۔''

چنانچہ یہ ہے وہ 'یوم اللہ' جس کا ذکر اللہ تعالیٰ 'کذلک مکنا' سے کرتا ہے۔

اب ذرا اس تشریح و تفسیر اور اس بحث کی حقیقت پر غور کریں جو 'دین الملک' کے تعلق سے کی جاتی ہے کہ وہ نظام باطل تھا یا حق؟ نظام باطل سے تعاون جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ بھلا حضرت یوسف ملک کے باطلانہ قانون کے تحت کیسے اپنے بھائی بن یمین کو روک سکتے تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس ذیل کی آخری وضاحت کہ 'ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک الا ان یشاء اللہ: نرفع درجات من نشاء وفوق کل ذی علم علیم (یوسف ۷۶) کا کیا مفہوم ہے؟

ہمارے مفسرین کرام نے اس تعلق سے کیا کیا گل افشانیاں کی ہیں جن کا ذکر لا حاصل اور بدحظ کرنے والا ہوگا۔ جتنی تفسیریں ہیں ان میں متعدد اختلافات و تضادات کے باوجود دو باتیں مشترک ہیں:

(۱) بن یمین کو حضرت یوسف نے ملکی قانون کے تحت نہ سہی دین ابراہیمی کے تحت چوری کے 'الزام' میں گرفتار کر لیا۔ یعنی بہت احتیاط کو ملاحظہ رکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیمانہ کے ان پاس پائے جانے کے سبب ان کو گرفتار کر لیا۔

(۲) بن یمین کی گرفتاری میں ان دس بھائیوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarahmed.net

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب پہلی بار حضرت یوسف گم ہو گئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان دس بھائیوں کی اس بات کا اعتبار نہیں کیا کہ انہیں بھیڑیا کھا گیا ہے بلکہ آپ نے ان بھائیوں کی نیت پر شک اور ان کی سازش کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

وجاء و علی قمیصہ بدم کذب قال بل سولت لکم انفسکم امرا فصبر جمیل واللہ المستعان علی ماتصفون (یوسف ۱۸)

ترجمہ: اور لائے اس کے کرتے پر لہو لگا کر جھوٹ بولا یہ ہرگز نہیں بلکہ بنادی ہے تم کو تمہارے جیوں نے ایک بات اب صبر ہی بہتر ہے اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں اس بات پر جو تم ظاہر کرتے ہو۔

جہاں تک اس بار کا معاملہ ہے تو مفسرین کے نزدیک ان دس بھائیوں کا کوئی قصور بن یمین کی گرفتاری میں نہیں تھا۔ اگر اس رو کے جانے میں کسی کو دخل تھا تو یا تو وہ حضرت یوسف یا خود اللہ کی تدبیر کو تھا کہ حضرت یوسف کے بھائیوں نے ایسی چوری کی سزا بتادی جو ان کے بقول ان کے یہاں دی جاتی تھی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبی کے لئے اپنے ان دس بیٹوں پر بدگمانی کرنا جائز تھا؟ چنانچہ آپ نے فرمایا:

قال بل سولت لکم انفسکم امر افصبر جمیل (یوسف ۸۳)

ترجمہ: بولا کوئی نہیں! بنالی ہے تمہارے جی نے ایک بات اب صبر ہی بہتر ہے۔

ستم بالائے ستم یہ کہ پہلی بار تو وہ دس بھائی حضرت یوسف کی قمیص پر خون کے جھوٹے داغ لگا کر ہی سہی بھیڑیئے کے کھا لینے کا ثبوت دے رہے تھے۔ اس بار تو وہ ایسی کسی غلط بیانی میں مبتلا بھی نہ تھے اور جو کچھ کہہ رہے تھے صاف صاف کہہ رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

وسئل القریۃ التی کنا فیھا والعیر التی اقبلنا فیھا وانا لصادقون (یوسف ۸۲)

ترجمہ: اور پوچھ لے اس بستی سے جس پر ہم تھے اور اس قافلے سے جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بے شک سچ کہتے ہیں۔

کیا حضرت یعقوب علیہ السلام جیسے نبی کو اس واقعے پر اپنے ان دس بیٹوں پر بدگمانی کرنا درست تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب مشکلات خود ہمارے مفسرین کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں۔

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asgharalam.net

قرآن بہت صاف صاف اور حقیقت بیان کر رہا ہے۔

بات یہ تھی کہ:

(۱) بن یمین کو حضرت یوسف نے گرفتار کرنا چاہا تھا نہ ان کی کوششوں اور تدبیروں سے وہ گرفتار ہوئے یا روکے گئے۔

اور دوسری بات یہ:

(۲) بن یمین کی گرفتاری اور روکے جانے میں کسی کا نہیں بلکہ سرتاسر ان دس بھائیوں کا ہاتھ تھا اس لئے کہ انہوں نے ایک گہری سازش کر کے بن یمین کو حضرت یوسف کی طرح ٹھکانے لگانے کا نظم کیا تھا۔

اس کی مختصر وضاحت اس طرح ہوسکتی ہے کہ:

(۱) جب وہ کنعان میں قحط سالی اور مصر میں ('ملک اللہ' قائم ہونے کے سبب جس کے کنہہ کا انہیں علم نہ تھا) آئی خوشحالی کے سبب بڑی مقدار میں اناج خریدنے یا درآمد (Import) کرنے (واضح ہو کہ یہ لوگ کنعان میں صاحب قوت و اقتدار یا کم از کم صاحب حیثیت تھے) کے لئے مصر آئے تو حضرت یوسف نے ان کو پہچان لیا لیکن وہ بھائی انہیں پہچان نہیں سکے۔ اسی حالت میں جب ان سے حضرت یوسف نے پوچھ تاچھ کی اور جب انہوں نے بتایا کہ ہاں گھر پر ہمارے بوڑھے والد اور ایک چھوٹا بھائی بھی موجود ہیں۔ تب حضرت یوسف نے ان سے کہا کہ اگلی بار جب وہ آئیں تو اپنے اس بھائی کو بھی ساتھ لائیں۔ بس اسی بات نے ان بھائیوں کو موقع دے دیا کہ وہ بن یمین کو بھی ٹھکانے لگانے کی سازش کریں چنانچہ انہوں نے باہم پوری سازش تیار کرلی اور حضرت یوسف کی بات کو اپنی سازش کے لئے بہانے کے بطور استعمال کیا۔ ادھر سامان میں قیمت بھی واپس مل جانا مزید سبب ہوا سازش کو کامیاب کرنے کا۔ ہرچند کہ حضرت یعقوب بالکل ابتداء سے اسے سازش سمجھ رہے تھے لیکن ان کے عہد کرنے کے بعد انہوں نے بن یمین کو مصر لیجانے کی اجازت دے دی۔ اب یہاں سے سازش کا پہلا مرحلہ ختم اور دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

ان بھائیوں نے ایسی تدبیر کی کہ بن یمین گرفتار کر لئے جائیں اور اس گرفتاری کا کوئی الزام ان پر نہ آئے۔ ادھر جب بن یمین آئے تو حضرت یوسف نے ان سے الگ ملاقات کی اور

کہا کہ میں تمہارا بھائی یوسف ہوں اور تحقیق احوال کی اور جب معلوم ہوا کہ ان بھائیوں کا حضرت یعقوب اور بن یمین کے ساتھ کیا سلوک ہے اور یہ کہ حضرت یوسف کی گمشدگی کے بعد وہ لوگ ان کے بارے میں کیا کیا کہتے رہے تھے تو انہوں نے کہا کہ وہ پریشان نہ ہوں ان باتوں پر جو وہ لوگ کرر ہے ہیں۔ واقعہ یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت یوسف بن یمین کے لئے خیر خواہی کا جو جذبہ رکھتے تھے اور اس کے تحت ممکن ہے انہیں بلانے یا ان کے لئے بہتری کی کوششیں کرنے کو سوچ رہے ہوں لیکن انہوں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی کہ بن یمین کو روک لیں۔ بن یمین کے تھیلے میں شاہی پیمانہ چرا کر رکھنے کی سازش ان بھائیوں نے کی تھی۔ چنانچہ ادھر قافلہ روانہ ہوا ادھر پیمانہ کے گم ہونے کا علم ہوا۔ ٹھیک توقع کے مطابق قافلے کو آواز دی گئی اور ان بھائیوں پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے شاہی پیمانہ چرایا ہے۔ انہوں نے بڑی معصومیت سے جواب دیا کہ وہ اس ملک میں فساد کی نیت سے نہیں آئے اور یہ کہ انہوں نے ایسا کوئی پیمانہ نہیں چرایا ہے۔ تفتیش کرنے والوں نے پوچھا کہ اگر تم لوگ جھوٹے نکلے تو پھر کیا سزا ہے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں سازش کی بنیادی کڑی پوشیدہ ہے۔ وہ جانتے تھے کہ پیمانہ کہاں رکھا ہوا ہے۔ اس لئے کہ خود انہوں نے ہی اسے بن یمین کے تھیلے میں رکھا یا رکھوایا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جب تلاشی لی جائے گی تو پیمانہ بن یمین کے تھیلے سے برآمد ہوگا۔ اور یہی وہ چاہتے تھے لہذا انہوں نے بڑی صفائی سے اصل سوال کو گم کر دیا اور کہا:

جزاؤہ من وجد فی رحلہ فھو جزاؤہ کذلک نجزی الظلمین (یوسف ۷۵)

ترجمہ: اس کی سزا یہ کہ جس کے اسباب میں سے ہاتھ آئے وہی اس کے بدلے میں جائے ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو۔

اگر انہیں معلوم نہ ہوتا کہ فی الواقع پیمانہ کہاں ہے تو ممکن ہے وہ اس بات کا بھی اندیشہ کرتے کہ کہیں کسی کی غلطی سے پیمانہ ہمارے ہی کسی سامان میں نہ بندھ گیا ہو چنانچہ ایسی صورت میں وہ ازالۂ اندیشہ کے لئے مثلاً یہ کہتے: دیکھئے ہم لوگوں نے تو چوری نہیں کی ہے۔ پھر بھی دیکھتا ہوں کہ غلطی سے پیمانہ کہیں انہیں تھیلوں میں تو نہیں رہ گیا۔ دیکھئے ہم لوگ چوری کی جسارت کیسے کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ کم از کم ازالہ اندیشہ کرتے۔ لیکن چونکہ سازش یہی تھی کہ شاہی پیمانہ

بن یمین کے تھیلے سے نکلے تا کہ وہ پکڑا جائے اور ایسا گرفتار ہو کہ کبھی چھوٹ نہ پائے اس لئے انہوں نے آگے بڑھ کر اور پورے جزم کے ساتھ کہا کہ جس کے اسباب میں وہ نکلے وہی اس کے بدلے رکھ لیا جائے۔ چنانچہ ٹھیک ان کے اندازے بلکہ تدبیر کے عین مطابق تلاشی لی گئی۔ اس سے بحث نہیں کہ تلاشی کس نے لی اور کس ترتیب سے ہوئی۔ تلاشی ہوئی اور شاہی پیمانہ ٹھیک بن یمین کے تھیلے سے برآمد ہوا۔ اور وہ گرفتار کر لیئے گئے۔ جب ان بھائیوں کو پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ بن یمین کو بھی ٹھکانے لگانے کی سازش پوری طرح کامیاب ہو گئی ہے اور اب بن یمین اس چنگل سے کبھی نہیں چھوٹ سکتا تب بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ یعنی ان کے دل میں کیا تھا ظاہر ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

قالوا ان یسرق فقد سرق اخ لہ من قبل (یوسف ۷۷)

ترجمہ: کہنے لگے اگر اس نے چرایا تو چوری کی تھی اس کے بھائی نے بھی پہلے۔

ایسا کہتے وقت اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ وہ یہ سب کچھ کسی اور کے روبرو نہیں بلکہ یوسف کے سامنے کہہ رہے ہیں جو خوب جانتا ہے کہ کیا یوسف نے چوری کی تھی۔ اسی طرح انہوں نے دین ابراہیمی کی سزا جو بیان کی اس تعلق سے وہ اس سے مطلقاً بے خبر تھے کہ یوسف کو خوب معلوم ہے کہ دین ابراہیمی میں چوری کرنے والے کی یہ سزا ہے یا نہیں؟ چوری کرنے والے کی یہ سزا کسی دین میں نہیں؟ یہ تو دراصل ان کی سازش تھی ان کا مقصد تھا کہ بن یمین ہمیشہ کے لئے غلام بنا لئے جائیں۔

اللہ کی سنت ہے کہ اللہ باطل کی چالوں کو اسی پر پلٹ دیتا ہے:

ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔ باطل سمجھتا ہے کہ وہ اپنی بھلائی اور کامیابی کی تدبیر کر رہا ہے جب کہ وہی تدبیر اس کی تباہی اور شکست کا سبب بنا دی جاتی ہے۔ دراصل اسی بات کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتے ہیں:

کذلک کدنا لیوسف (یوسف ۷۶)

ترجمہ: اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر کی

حضرت یوسف چاہتے تھے کہ حضرت بن یمین ان کے پاس رک جائیں اور حضرت یعقوب اب مصر چلے آئیں لیکن اس خواہش کے باوجود ان کے پاس بظاہر کوئی حتمی صورت نہیں

تھی کہ اپنی شناخت (Identity) ظاہر کئے بغیر ایسا کر سکیں۔ اور قانونی راستہ سے وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے یہ تدبیر کی۔ تدبیر تو حضرت یوسف اور بن یمین کے دشمن بھائیوں نے اپنے مفاد کے لئے کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس تدبیر کو حضرت یوسف کے لئے مطلب برآری کا ذریعہ بنا دیا۔ ظاہر ہے حضرت یعقوب بدگمانی نہیں کر رہے تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے باخبر کر دیا تھا کہ ان کے دوسرے بیٹے کے تعلق سے بھی سازش کی جا رہی ہے۔ اسی بات کی طرف قرآن اس طرح اشارہ کرتا ہے:

ولما دخلوا من حيث امرهم ابوهم ما كان يغني عنهم من الله من شئ الا حاجة في نفس يعقوب قضها وانه لذو علم لما علمنه ولكن اكثر الناس لايعلمون (یوسف ۶۸)

ترجمہ: اور جب داخل ہوئے جہاں سے کہا تھا ان کے باپ نے۔ کچھ نہ بچا سکتا تھا ان کو اللہ کی کسی بات سے مگر ایک خواہش تھی یعقوب کے جی میں سو پوری کر چکا اور وہ تو خبردار تھا جو کچھ ہم نے اس کو سکھایا۔ لیکن بہت لوگوں کو خبر نہیں۔

اس طرح آیت 'ما کان لیاخذ' کا مفہوم ہے:

'سرکاری فیصلے یا حکم کے ذریعہ وہ اپنے بھائی کو نہیں لینے والا تھا الا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے جو ہر صاحب علم سے بالاتر ہے۔'

دراصل قرآن کا فقرہ: **وفوق کل ذی علم علیم**' ایک خاص تناظر میں ہے۔ اس کا سمجھنا ضروری ہے، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب کو پہلا رؤیا دکھایا تو ابلیس کی بے چینی بڑھ گئی اور اس نے حضرت یعقوب کی کوششوں کو ناکام کرنے کے لئے ان کی بیشتر اولادوں کو مبتلاء معاصی کر دیا۔ جب دوسرا رؤیا حضرت یوسف نے دیکھا تو انہیں بھائیوں کے ذریعہ ان کا خاتمہ کرنے کی تدبیر کی گئی۔ بن یمین کو بھی ٹھکانے لگانے کی تدبیر اسی کی ایک کڑی تھی۔ اصلی چالیں تو ابلیس چل رہا تھا۔ افسوسناک بات یہ تھی کہ حق کے خلاف اور روئے ارض پر 'ملک اللہ' کی اقامت کی کوشش کو ناکام کرنے کی چالوں میں خود آل یعقوب کی بڑی تعداد ملوث تھی۔

ابلیس گویا ہر اعتبار سے خوش تھا کہ اس کی ساری تدبیریں بارآور ہوتی جا رہی ہیں۔

ایسی صورت میں مصر کے مقتدر اعلیٰ کی جانب سے بن یمین کی طلب گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنا کے مصداق ہوئی۔ اور انہوں نے ایک گہری سازش تیار کی۔ ان کی سازش اتنی فطری اور معقول تھی کہ کسی کو بھی اس پر شک نہیں ہوسکتا تھا۔ اصل تدبیروں کے ساتھ ساتھ ان بھائیوں نے رابطۂ عامہ (Public Relations) کے سارے تقاضے پورے کیے تاکہ کسی مرحلے میں کسی کو شک نہ ہو کہ یہ کوئی سوچی سمجھی چال ہے۔ ہر مرحلے کی خبر اردگرد والوں کو دینا، ایسی معقول تدبیریں کرنا جس سے معلوم ہو کہ یہ لوگ اس بھائی کے تعلق سے کس قدر مخلص اور پریشان ہیں اور یہ کہ اس کی گرفتاری میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں۔ لیکن قرآن کی بلاغت ان تمام گہرے امور پر حاوی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

فلما استینسوا منه خلصوا نجیا (یوسف ۸۰)

'فلما استینسوا منه' سے مراد یہ نہیں کہ جب وہ ناامید ہوئے اس سے یعنی بن یمین کی رہائی سے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے بظاہر اس کی کوشش کی کہ بن یمین رہا ہو جائیں (حالانکہ درپردہ وہ ایسا نہیں چاہتے تھے) اور جب انہیں اپنی ان نام نہاد کوششوں میں کامیابی نہیں ملی تو انہوں نے ایسا ظاہر کیا یعنی بہ تکلف ظاہر کیا کہ گویا ساری کوششوں کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ رہائی نہیں ہو پائے گی۔

خلصوا نجیا سے مراد دو اہم باتیں ہیں:

(۱) جب وہ بھائی آپس میں مشورہ کرنے کے لئے بیٹھے تو وہ کن لوگوں سے جدا ہو کر بیٹھے۔ ظاہر ہے کہ ان قافلہ والوں سے جن کے وہ ساتھ تھے اور جو ان کے ساتھ کنعان واپس جاتے اور جن کے مابین اس دوراں وہ رابطۂ عامہ کے تقاضے خوب خوب پورا کر رہے تھے تاکہ وہ وہی گواہی دیں جو انہیں نظر آ رہا ہے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ وہ دیگر لوگوں سے جدا ہو کر کیوں بیٹھے؟ تو قرآن نے واضح کیا ہے کہ جب انہیں پوری طرح یقین ہو گیا کہ اب بن یمین ان کی سازش کے عین مطابق روک لئے گئے ہیں اور اب ان کے چھوڑے جانے کا کوئی امکان نہیں تو گویا ان کی زندگی کی ساری منصوبہ بندی پوری ہو گئی تھی۔ سالوں قبل وہ یوسف کو ٹھکانا لگا چکے تھے اور اب بحسن وخوبی بن یمین کو بھی ٹھکانا لگانے میں کامیاب ہو چکے تھے اور اب اس تعلق سے صرف ایک ہی کام باقی رہ گیا تھا یعنی حضرت

یعقوب کو باور کرانا کہ بن یمین کیونکر گرفتار ہوئے۔ لہذا اس مشورت میں انہوں نے پوری منصوبہ بندی کی کہ کس طرح پورے معاملے کو حضرت یعقوب کے سامنے رکھا جائے اور آگے اب کیا کیا جائے۔ ادھر وہ یہ چالیں چل رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنی ہر چال میں کامیاب ہیں اور کوئی ان کی چال کو سمجھ تک نہیں سکتا، جب کہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یہ ان کی بھول تھی۔ ان کی چالوں سے گہری اللہ کی تدبیریں ہیں۔ اور وہ خواہ کتنے ہی خفیہ طریقے سے چالیں چلیں اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہونے دیں لیکن اللہ سب چیزوں سے باخبر ہے۔

اس طرح ابلیس کی لامتناہی کوششوں اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھر میں نزغ ڈالنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھوں حضرت یعقوب علیہ السلام کی کوششوں کو بارآور فرمادیا۔ لیکن یہ کامیابی ابراہیمی میثاق کے عین مطابق پوری کامیابی نہیں تھی۔ اس میں چند خامیاں تھیں:

(۱) بحیثیت مجموعی آل یعقوب کی اکثریت اس میثاق کے پورا کرنے سے دست کش ہی نہیں بلکہ مانع رہی جو عہد کی کھلم کھلا خلاف ورزی تھی۔

(۲) حضرت یعقوب علیہ السلام کی ارض بعثت میں اقامت ملک اللہ نہیں ہوسکی اور ابلیس کے نزغ کے سبب حضرت یعقوب کنعان میں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم نہیں کرسکے۔ اور ایسا بنیادی طور پر وہ اپنی بڑی اولادوں کے سبب نہیں کرسکے۔ یہ اقامت ہوئی بھی تو دور مصر میں جو، گویا حضرت یوسف کا یا تو قید خانہ تھا جہاں انہوں نے غلامی کے دن گزارے تھے یا پناہ گاہ تھی جہاں وہ بے گھر ہونے کے بعد پناہ گزیں ہوئے تھے یا پھر دار الہجرت تھی جہاں وہ مہاجر کی طرح تھے۔

(۳) ہر چند کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو معاف کردیا اور بعد میں ان میں سے بیشتر طلقاء ہونے کے بعد تائب بھی ہوئے اور مصر میں سکونت پذیر ہوگئے اس لئے کہ اللہ کا ملک کنعان میں نہیں بلکہ مصر میں قائم ہوچکا تھا اور اب ان کے لئے جائز نہیں تھا کہ ایک ایسا ملک قائم ہونے کے بعد بھی وہ کنعان میں رہیں۔ لیکن اس تعلق سے بھی تمام آل اسحٰق وہاں منتقل نہیں ہوئے اور ایک بڑی تعداد کنعان اور اس کے اطراف میں علی حالہ باقی رہی۔ اس اعتبار سے میثاق کے پورا کرنے میں ان سے سخت کوتاہیاں ہوئیں۔

prepared by M. Aamir Mehmood
www.astaralam.net

حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کی کامیابی نے آل اسحاق کو بالعموم اور آل یعقوب کو بالخصوص عذاب سے تو بچا لیا لیکن ان کی روش نے اس بات کا پتہ دے دیا کہ وہ بہت دیر تک اس میثاق سے بندھے رہنے والے نہیں۔

کنعان و مصر

اپنے بڑے بیٹوں کے مابین رہتے ہوئے حضرت یعقوب علیہ السلام کا ایک جانب 'ارض موعود' کنعان میں 'اقامت ملک اللہ' کی ان تھک کوششوں کو جاری رکھنا تا کہ حضرت اسحاق اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے توسط سے کیے گئے میثاق کی تکمیل ہو اور دوسری جانب اپنی ان اولادوں کے عدم تعاون اور خلل اندازی کرنے اور اس کوشش کی راہ کھوٹی کرنے کے سبب اس سعی میں ناکام ہو جانا اور اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کا مصر چلا آنا دراصل ہجرت کے مثل تھا۔

جیسا کہ اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ دین اللہ میں 'ہجرت' محض 'ترک مقام' کو نہیں کہتے۔ ہجرت ایک ایسا مشروط عمل ہے جس کی بنیادی شرط مہجور مقام میں 'اقامت ملک اللہ' کرنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب کنعان کے بجائے مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کو وہ صورت حال نصیب ہوئی یعنی وہاں تمکن ملا اور اس ملک میں ان کے ہاتھوں 'حکومت الہیہ' کا قیام ہوا تو انہوں نے یہ کبھی نہیں سمجھا کہ یہ وہی 'اقامت ملک اللہ' ہے جس کا ان کے آبا کو حکم دیا گیا تھا اور جس کا میثاق میں ذکر ہے۔ یہاں روئے ارض پر معرکہ خیر و شر کے دقیق نکات نہایت کھل کر سامنے آجاتے ہیں جن کا ذکر دین اللہ کے تعلق سے بہت سی غلط فہمیاں دور کر سکتا ہے۔

ان امور کی وضاحت سے قبل ضروری ہے کہ بعض مخصوص امور پیش نظر رکھ لئے جائیں:

(۱) 'اقامت ملک اللہ' کا جو کچھ ذکر کیا جا رہا ہے وہ اس معرکہ خیر و شر سے متعلق ہے جو کائناتی منصوبہ ربانی کا حصہ ہے اور اس سے بنی نوع انسان کا براہ راست تعلق ہے۔

(۲) دجال جلد اول (صفحہ ۱۱۷) میں اس عاجز نے لکھا تھا:

''ظاہر ہے یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی جو نہیں جانتا کہ قرآن نے ارض کا کیا مفہوم لیا ہے۔ اور یہ کہ دین اللہ اور اسکی حکمت عملی کو ارض سے کیا نسبت ہے اور ارض کیا ہے؟ اور اسکے حدود اور مراتب کیا ہیں اور اس کی تر کیز اور توسیع کسے کہتے ہیں۔''

چنانچہ اس تعلق سے چند امور کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے:

(الف) معرکہ خیر و شر: روئے ارض پر معرکہ خیر و شر کا صرف ایک ہی سلسلہ ہے جس کی

قیادت حضرات انبیاء کرام کرتے رہے ہیں اور وہ سب ایک ہی مقصد اور ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ رسالت، انبیاء کے سنن اور ہدیٰ سب اسی ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان میں کہیں تضاد ہے اور نہ باہم محاذی یا متوازی صورتحال۔ اور یہی مفہوم ہے درج ذیل آیات کا:

(ا) ان هذه امتكم امة واحده (الانبیاء ۹۲)

ترجمہ: یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر۔

(۲) وان هذه امتكم امة واحده (المومنون ۵۲)

ترجمہ: اور یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر۔

چنانچہ روئے ارض پر پوری انسانی تاریخ دراصل معرکۂ خیر وشر کے صرف ایک سلسلے کا نام ہے جس کی قیادت انبیاء اور مرسلین کرتے رہے ہیں اور دین اللہ معرکۂ خیر وشر میں فریق خیر کی شناخت اور اس کا وظیفہ ہے۔

(ب) ارض (اصلی): یہ روئے ارض جو مہبط آدم وحوا ہے یہی ارض (اصلی) ہے۔ اسی ارض پر بنی نوع آدم کے لئے 'مستقر' اور 'متاع' کا ربانی نظم کیا گیا ہے۔ اسی ارض پر بنی آدم کو ایک مدت معین یعنی 'الی حین' تک رہنا ہے۔ بنی آدم کی زندگی یہاں ابتلاء و آزمائش سے بھری ہے اس دوران اس کے ساتھ ابلیس کے ذریعہ برپا معرکۂ خیر وشر کا معاملہ جاری رہے گا۔ یہ پوری زمین دراصل وہ جگہ ہے جس پر اسے 'اقامت ملک اللہ' کرنا ہے اور یہ وہ کام ہے جو معرکۂ خیر وشر کے اس مرحلے میں پورے بنی آدم پر فرض منصبی ہے۔ بنی آدم کی فی زمانہ صحیح اور واقعی وارث کے بطور 'امت مسلمہ' اس کی ذمہ دار ہے۔ اس لئے یہ اس کی واحد ذمہ داری ہے کہ مقصد وجود (raison d'etre) ہے کہ وہ پوری روئے ارض پر 'اقامت ملک اللہ' کرے۔ یہی وہ ارض ہے جس کا بتمام وکمال ذکر سورۂ توبہ آیت ۲ میں کیا گیا ہے:

واعلموا انكم غير معجزی الله وان الله مخزی الكفرين (التوبہ ۳)

ترجمہ: براءت ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی مشرکوں سے متعلق جن سے ہمارا عہد ہوا تھا۔ سو پھر لو اس 'ارض' میں چار مہینے اور جان لو کہ تم نہ تھکا سکو گے اللہ کو اور یہ کہ اللہ رسوا کرنے والا ہے کافروں کو۔

(ج) مرکز ارض: یہ ارض جس پر 'اقامت ملک اللہ' کرنے کی ذمہ داری امت مسلمہ کا

www.booksubee.net
prepared by M. Aamir Mehmood

مقصد وجود (raison d'etre) ہے اس کا مرکز اور پایۂ تخت 'بیت اللہ' ہے جو روئے ارض پر حضرت آدم کے بسائے جانے کے وقت سے ہی پایۂ تخت اور روئے ارض پر 'ملک اللہ' کی نشانی اور علامت رہا ہے۔ مکۃ المکرمہ میں واقع بیت اللہ یعنی کعبۃ اللہ ہی دراصل وہ جگہ ہے جو 'ملک اللہ' کی علامت اور مرکز ارض ہے۔

(د) ارض (حکمی): ارض (حکمی) دراصل ارض (اصلی) کی وہ کم سے کم حد یا اس کا علاقہ ہے جس پر کسی رسول کیلئے اقامت 'ملک اللہ' کرنا لازمی اور ضروری ہے۔ چنانچہ کنعان بنی اسحٰق اور بنی اسرائیل کے لئے اور جزیرۃ العرب آنحضور ﷺ کے لئے 'ارض (حکمی)' کے حکم میں ہیں۔ یہی وہ بات ہے جس کا ذکر متعدد مقامات پر قرآن نے کیا ہے۔

اسی مقام پر یہ بات واضح ہو جانی چاہئے کہ ارض (حکمی) پر اقامت کے تناظر میں 'امت محمدیہ' اپنے اپنے زمانے کی تمام 'امت مسلمہ' کی طرح یکساں طور پر ذمہ دار ہے۔ لیکن 'امت محمدیہ' 'امت خاتم النبیین' ہونے کی وجہ سے اور اپنی کارکردگی کے اعتبار سے آنحضور ﷺ کی قیادت اور ان کی حیات طیبہ میں ہی اعلیٰ ترین مقام یعنی 'امت وسط' کے مقام پر فائز کر دی گئی ہے اس لئے اب اس اعزاز کے بعد اس کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئی ہیں۔ چنانچہ امت محمدیہ اب چونکہ 'امت مسلمہ' کے ساتھ ساتھ 'امت وسط' کے منصب پر بھی فائز ہے اس لئے اس کے لئے 'ارض (حکمی)' پر اقامت 'ملک اللہ' کرنا یا اسے قائم رکھنا کافی نہیں اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے لئے ارض (اصلی) ہی ارض (حکمی) کے درجے میں ہے۔

(ہ) ارض (حکمی قائم مقامی): ابھی ابھی جس ارض (حکمی) کا ذکر کیا گیا وہ دراصل دو طرح کی ارض (حکمی) پر مشتمل ہے جس کا جان لینا ضروری ہے۔ لیکن اس امر کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاملے میں ایک خصوصی فضل کے تناظر میں ہے۔ جسے دراصل اللہ تعالیٰ کی 'مصلحت خاصہ' کا نام دیا جا سکتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے میثاق کا تعلق تو فی الواقع ارض (اصلی) اور اس کے ذیل میں ارض (حکمی) ہی سے تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی ذریت اولیٰ یعنی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے علاوہ ذریات کے لئے بھی ایک خاص فضل فرمایا۔ یہ ایک حقیقی اور تفصیل طلب نکتہ ہے لیکن ان مباحث سے صرف نظر کرتے ہوئے اتنا ذکر کر دینا کفایت کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کی 'مصلحت خاصہ'

prepared by Mr. Aamir Mehmood

کا یہ ایک باب ہے جسے اس نے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولادوں کے لئے وا فرما دیا تھا۔ چنانچہ وہ ارض جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے لئے 'دارالہجرت' قرار دیا تھا اسے اللہ تعالیٰ نے بنی اسحٰق کے لئے ارض (حکمی) قرار دے دیا۔ اور اس ارض پر واقع 'مقامات ابراہیم' میں سے ایک مقام کو مرکز۔

(و) **ترکیز ارض:** معرکۂ خیر و شر میں 'اقامت ملک اللہ' کا آغاز جس مقام سے ہوتا ہے وہ دراصل 'مرکز ارض' ہے۔ آنحضور ﷺ کے باب میں مکۃ المکرمہ یعنی وہ آبادی جس میں 'بیت اللہ' واقع ہے 'اقامت ملک اللہ' کے لئے پہلا مقام قرار دیا گیا۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلے اس آبادی پر 'اقامت ملک اللہ' کا آغاز فرمایا۔ اگر اہل مکہ آنحضور ﷺ کے ساتھ وہ سلوک نہ کرتے جو انہوں نے کیا اور ان کا ساتھ دیتے تو اس صورت میں ہجرت واقع نہ ہوتی اور سب سے پہلے مکۃ المکرمہ ہی میں 'اقامت ملک اللہ' ہوتی۔ چنانچہ پوری روئے ارض میں جب کسی مخصوص مقام کو ـــــ اور پورے روئے ارض کے تناظر میں ایسا مقام بیت اللہ ہی ہے ـــــ اقامت ملک اللہ کے لئے منتخب کیا جائے اور وہاں اقامت کی جائے تو اسے 'ترکیز ارض' کہا جاتا ہے۔ چونکہ اہل مکہ نے عداوت کا معاملہ کیا اور آنحضور ﷺ کو مجبوراً ہجرت کر کے یثرب جانا پڑا اور اہل یثرب نے 'ترکیز ارض' کے لوازم اور تقاضے پورے فرمائے لہذا 'ترکیز ارض' کا عمل مکۃ المکرمہ کے بجائے یثرب میں واقع ہوا۔ جسے 'میثاق مدینہ' کہا جاتا ہے۔ وہ 'میثاق مدینہ' کوئی تحالفی معاہدہ نہیں تھا بلکہ 'ترکیز ارض' تھا اور یہ وہی ترکیز ارض ہے جسے دراصل مکۃ المکرمہ میں ہونا تھا۔ نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کے باب میں اہل مکہ کی بالعموم اور سرداران مکہ کی بالخصوص بدبختی تھی کہ انہوں نے آپ ﷺ کی مخالفت کی اور آپ کو ہجرت پر مجبور کیا اور خود انصار نہ بن سکے۔ ان کی یہ بدبختی ان کے سامنے بالآخر آن موجود ہوئی اور وہ 'طلقاء' قرار پائے اور اہل یثرب انصار۔ مکۃ المکرمہ کے تعلق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضور ﷺ کے اصلی مشن کے تحت مکۃ المکرمہ میں ترکیز کا عمل پورے جزیرۃ العرب یعنی ارض (حکمی) میں 'اقامت ملک اللہ' کے ساتھ ساتھ ہوا۔ 'اقامت ملک اللہ' اور 'ترکیز ارض' کے تعلق سے اہل مکہ کی کوتاہی، ہٹ دھرمی اور عناد کا ہی نتیجہ تھا جو ان کی کم نصیبی پر منتج ہوا اور وہ 'انصار' نہیں بلکہ 'طلقاء' قرار دیئے گئے جب کہ سب سے پہلے 'نصرت' ان پر پیش کی گئی تھی۔

(ز) **توسیع ارض:** چونکہ ہر امت مجتبیٰ اپنے عہد میں اپنے رسول کی قیادت میں ارض (حکمی) پر 'اقامت ملک اللہ' کرنے کی پابند ہوتی ہے اس لئے وہ 'ترکیز ارض' پر بس نہیں کر سکتی اور توسیع ارض یعنی اس 'اقامت ملک اللہ' کے حدود کو روئے ارض پر وسیع تر کرتی ہے۔ آنحضور ﷺ سے قبل سارے انبیاء اور ان کی امتیں اقامت ملک اللہ کو فی الواقع ارض (حکمی) تک توسیع دینے کی پابند رہی ہیں۔ یہ جداگانہ بات ہے کہ اس وقت پائی جانے والی انسانی آبادی اور ارض (حکمی) اپنے علاقے اور وسعت کے اعتبار سے اتفاقاً برابر ہوں۔ لیکن جہاں تک امت مسلمہ محمدیہ کا معاملہ ہے تو یہ امت دراصل جس توسیع ارض کی پابند اور مکلف ہے وہ روئے ارض کی کامل ترین توسیع ارض ہے یعنی پوری روئے ارض۔ آنحضور ﷺ کی بعثت میں یہ کامل ترین توسیع ارض داخل تھی۔ جس کی آپ نے اقامت فرمائی اور اس طرح 'الحکم' قائم فرمایا جس کے دو شعبے تھے:

(۱) **باب الحکومۃ:** باب الحکومۃ وہ صیغہ ہے جس کے تحت اقامت صلوٰۃ، اقامت زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظم کیا گیا اور جس کے لئے باب المظالم، باب الحدود اور باب القضاء قائم کئے گئے۔

(۲) **باب الجھاد:** باب الجہاد وہ صیغہ جس کے تحت توسیع ارض کا عمل جاری رہا۔

چونکہ آنحضور ﷺ نے خود اپنی حیات طیبہ میں اپنے ہاتھوں ترکیز ارض (اصلی) اور ارض (حکمی اصلی) میں 'اقامت ملک اللہ' کا فریضہ ادا کر دیا تھا اور اب صرف اس کی توسیع کا عمل ہونا تھا اس لئے آپ نے فرمایا کہ 'اب ہجرت کے بعد کوئی ہجرت نہیں'۔

(ان شاء اللہ ان تمام امور کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی)

چنانچہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں 'اقامت ملک اللہ' فرما دی تو اس اقامت کی حیثیت 'دار الہجرت' میں 'ترکیز ارض' کے مصداق تھی۔ یہی سبب ہے کہ اب روئے ارض کے مومنین اور بالخصوص حضرت یعقوب علیہ السلام پر 'ہجرت' لازم ہو گئی۔ اور اس طرح آپ اپنے تمام خاندان کے ساتھ کنعان سے مصر ہجرت کر گئے۔

لیکن اس مقام پر یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ 'ہجرت' اس بات سے مشروط ہے کہ مجبور

مقام یعنی اصلی مقام ترکیز ارض اور ارض (حکمی) کی طرف ضروری تیاری کے بعد واپس لوٹا جائے اور وہاں اقامت کی جائے یعنی 'اقامت ملک اللہ' کی جائے۔

یہی وہ بات ہے جو حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کے ذہن وفکر میں راسخ تھی جسے توراۃ میں مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں وہ صورتحال بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اگر چہ حضرت یعقوب، حضرت یوسف اور حضرت بن یمین اس حالت میں مصر میں یکجا ہوئے تھے کہ وہاں 'حکومت الٰہیہ' قائم ہو چکی تھی لیکن ان سب کے باوجود دیگر بھائیوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اگر چہ حضرت یوسف کی رحمدلی نے انہیں معاف کر دیا اور 'طلقا' قرار پائے تھے لیکن ان کی روش ان تینوں حضرات کو بار بار یاد دلاتی تھی کہ ان سے کسی خیر کی توقع نہیں۔ ہر چند کہ وہ سب مومن ہیں لیکن ان پر شیطان کا غلبہ ہے اور اس کا زیادہ اندیشہ ہے کہ وہ 'اقامت ملک اللہ' کے مشن کو پورا کرنے کے بجائے ابلیس کے آلۂ کار بن جائیں۔ یہی وہ بات ہے جس کا ذکر براشیت باب ۴۹ میں حضرت یعقوب کے نصائح کے ذیل میں کیا گیا ہے۔

اس پوری مدت میں حضرت یعقوب علیہ السلام تمام لوگوں کو با [illegible] تے ہے اور باور کراتے رہے کہ 'مصر' محض 'دار الہجرت' ہے اور 'دار الہجرت' رہنے کی جگہ نہیں بلکہ ارض حکمی میں اقامت ملک اللہ کرنے کی ضروری تیاری کرنے کی جگہ ہے۔ لہذا جب اسی دوران انہیں محسوس ہوا کہ ان کی موت کا وقت قریب آرہا ہے تو آپ نے وصیت کی اور انہیں یاد دلایا کہ وہ مصر میں صرف اس لئے رہ رہے ہیں کہ کنعان میں جو ارض (حکمی) ہے 'اقامت ملک اللہ' کی ضروری تیاری کریں۔ یہی وہ بات ہے جسکا ذکر قرآن نے البقرہ ۱۳۳ میں کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آپ نے یہ بات بھی کہی کہ اگر اس دوران ان کی موت ہو جائے تو انہیں مصر کے بجائے کنعان میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ براشیت ۴۹ سطر میں ۲۹ ہے:

''مجھے میرے لوگوں کے ساتھ جمع کر دیا جائے۔ میری تدفین میرے آبا کے ساتھ حتیوں کے میدان عفرون کے غار میں ہو۔ اس غار میں جو مخفلح میں ہے ممراء کے محاذی، کنعان میں۔''

اور پھر یہی نصیحت حضرت یوسف علیہ السلام نے کی۔ آپ نے فرمایا:

''اور یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا: میں مر رہا ہوں۔ لیکن خدا ضرور تمہاری طرف

www.bookstube.net www.urdutube.net prepared by M. Aamir Mehmood www.urdumovies.net www.asrarealam.net

متوجہ ہوگا۔ اور تم لوگوں کو اس ملک سے نکال کر اس سرزمین پر آباد کرے گا جس کا اس نے ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب سے وعدہ کیا ہے:

اس کے بعد یوسف نے تمام آل اسرائیل سے میثاق لیا اور کہا: خدا ضرور تمہاری طرف متوجہ ہوگا اور (تب) تم میری ہڈیاں یہاں سے لے جانا۔''

(براشیت ۵۰ سطر ۲۶،۲۵)

بنی اسرائیل حسب اندیشہ سب کچھ بھلا بیٹھے۔ وہ ’دارالہجرت‘ میں رہ کر ارض (حکمی) میں ’اقامت ملک للہ‘ کی ضروری تیاری کرنے کے بجائے متوطن ہو کر وہاں کی آسائشوں سے لطف اندوز ہونے لگے اور اپنے اصلی مقصد حیات کو بھلا بیٹھے۔ انہوں نے بھلا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کیوں منتخب کیا ہے؟ وہ کیوں مصر میں صاحب تمکن بنائے گئے ہیں؟ دنیا کے دیگر لوگوں کی طرح انہوں نے بھی زندگی کی آسائشوں سے لطف اندوز ہونے کو وظیفۂ حیات بنا لیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور مصر کی سرزمین جو کل تک ان کے لئے ’دارالہجرت‘ اور پناہ گاہ تھی ان پر تنگ ہوگئی۔ اور اس طرح ’اقامت ملک اللہ‘ کے میثاق سے پھر جانے اور بدعہدی کے صلے میں مصر کی سرزمین ان کے لئے اذیت گاہ بنا دی گئی۔

www.booktube.net
prepared by M. Aamir Mehmood

حواشی دجال جلد دوم

۱۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرارِ عالم: دجال جلد اول: حقیقت سوم: معرکۂ خیر وشر: صفحات ۳۹۔۲۳۳

۲۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرارِ عالم: دجال جلد اول: مرحلۂ اول: آدم قدیم: صفحہ: ۲۶۱

۳۔ ملاحظہ فرمائیں: (الف) سورۂ کہف آیات ۷، ۴۷، ۴۶ (ب) سورۂ صافات آیت ۶ اور (ج) سورۂ حدید آیات ۲۰

۴۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرارِ عالم: دجال جلد اول: مرحلۂ دوم: آدم وحوا صفحات ۷۹۔۲۶۲

۵۔ ملاحظہ فرمائیں: سورۂ یونس آیت ۱۰

۶۔ ملاحظہ فرمائیں: سورۂ البقرہ آیات ''اسکن انت وزوجک الجنة وکلا منها رغداً حیث شئتما (آیت ۳۵)

۷۔ ملاحظہ فرمائیں: سورۂ البقرہ آیت ' ولا تقربا هذه الشجرة ' (آیت ۳۵)

۸۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرارِ عالم: ماکان وما یکون: (الف) کامیابیٔ ابلیس صفحات ۲۰۔۲۱ اور (ب) مرحلۂ الجنہ صفحات ۹۔۱۰۸

۹۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرارِ عالم: ماکان وما یکون: مرحلۂ الارض صفحات ۱۰۔۱۰۹

۱۰۔ ملاحظہ فرمائیں: حدیث کے الفاظ ہیں: 'ولا یزال فی الجنة فضل حتی ینشئ الله لها خلقاً فیسکنهم فضل الجنة (متفق علیہ) ترجمہ: جنت میں ہمیشہ وسعت رہے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک مخلوق پیدا کر کے اسے جنت کے زائد حصے میں ٹھہرائے گا۔ (بحوالہ مشکوۃ

Prepared by M. Aamir Mehmood
www.asrarealam.net

باب خلق الجنة والنار)

۱۱۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۹۔۲۷۸

۱۲۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۸۷۔۲۸۱

۱۳۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۳۲۵۔۲۹۳ اور ۳۴۰۔۳۲۶

۱۴۔ ملاحظہ فرمائیں: القرآن: سورۂ مریم آیت ۵۶

۱۵۔ ملاحظہ فرمائیں: (الف) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی: تفسیر عزیزی
(ب) الزمخشری: تفسیر کشاف

۱۶۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۸۹۔۳۴۵

۱۷۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۱۶۔۳۰۸

۱۸۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۸۹۔۱۸۳

۱۹۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۸۹۔۱۸۳

۲۰۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۷۹۔۲۶۳

۲۱۔ ملاحظہ فرمائیں: اسرار عالم: دجال جلد اول: صفحات ۷۳۔۲۶۴

۲۲۔ ملاحظہ فرمائیں: (الف) ۱۔ سورۃ الاعراف آیت ۲۰۰ ۲۔ یوسف ۱۰۰
۳۔ الاسراء ۵۳ (ب) حدیث: فان جاء آخر ينازعه فاضربوا رقبه الأخر (رواہ ابوداؤد کتاب الفتن)

www.bookstube.net www.urdutube.net prepared by M. Aamir Mehmood www.urdumovies.net www.asraralam.net